اہم علوم قرآن
ترجمہ
زبدۃ الاتقان فی علوم القرآن
از
مولانا محمد عارف اللہ مصباحی
باہتمام
مجلس برکات
الجامعۃ الاشرفیۃ مبارک پور
ضلع اعظم گڑھ، یو،پی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



# اہم علومِ قرآن

﴿ از ﴾

مولانا محمد عارف اللہ مصباحی
استاذ مدرسہ فیض العلوم محمد آباد گوہنہ، ضلع مئو، یوپی

ترجمہ

## زُبْدَةُ الْإِتْقَانِ فِيْ عُلُوْمِ الْقُرْاٰنِ

از : علامہ سید محمد بن علوی مالکی (م ۱۴۲۵ھ/ ۲۰۰۴ء)

اخذ و تلخیص از:

## الْإِتْقَانِ فِيْ عُلُوْمِ الْقُرْاٰنِ

تصنیف: علامہ جلال الدین عبد الرحمٰن بن ابی بکر سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ

۸۴۹ ھ ——— ۹۱۱ ھ
۱۴۴۵ء ——— ۱۵۰۵ء

باہتمام

مجلس برکات، الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور
ضلع اعظم گڑھ، یوپی

## سلسلۂ اشاعت نمبر ۷۵


کتاب : **اہم علوم قرآن**

ترجمہ زبدۃ الاتقان فی علوم القرآن

مترجم : مولانا محمد عارف اللہ مصباحی

استاذ مدرسہ فیض العلوم ، محمد آباد گوہنہ ، ضلع مئو

کمپوزنگ : مولانا محمد عارف اللہ مصباحی و مولانا ناصر حسین مصباحی

پروف ریڈنگ : مترجم

اشاعت اول : صفر ۱۴۳۳ھ/ جنوری ۲۰۱۲ء

صفحات : ۲۴۰

تعداد : ایک ہزار قیمت :

مطبع :

ناشر : مجلس برکات، الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور


### ملنے کے پتے:


۱- مجلس برکات، الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ- یوپی- پن کوڈ: 276404

۲- مجلس برکات، ۱۴۹ گراؤنڈ فلور، کٹرا گوکل شاہ بازار، مٹیا محل، جامع مسجد دہلی 110006

*1- MAJLIS-E-BARAKAAT, AL-JAMIATULASHRAFIA, MUBARAKPUR, AZAMGAR, U.P. PIN: 276404*

*2- MAJLIS-E-BARAKAAT, 149,GROUND FLOOR, KATRA GOKULSHAH MARKET, MATIYA MAHAL JAMA MASJID DELHI PIN 110006*

# فہرست مضامین کتاب



## فہرست ترجمہ زبدۃ الاتقان

✡ ✡ ✡

# تعارف

**الاتقان فی علوم القرآن** : علوم قرآن سے متعلق علامہ سیوطی کی شہرہ آفاق تصنیف ہے اس میں انھوں نے قرآن کریم کے ان تمام علوم کو بڑی تفصیل اور جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا ہے جن تک ان کے زمانے میں ذہن انسانی کی رسائی ہوسکی تھی چناں چہ انھوں نے اس میں قرآن کی تفسیر، قراءات، نواسخ، لغت، احکام، امثال، حکم، اصول وقواعد اور دوسرے بہت سے فوائد کا ذکر بڑی شرح وبسط سے کیا ہے۔

**زبدۃ الاتقان**: مفصل اور دقیق علمی مباحث پر مشتمل ہونے کے سبب چوں کہ اتقان صرف حلقہ علما و محققین تک ہی محدود تھی اس لیے عام طالبان علوم قرآن کو بھی قرآن کے سرچشمہ صافی سے سیراب کرنے کے لیے حضرت علامہ علوی مالکی رحمہ اللہ تعالی نے کچھ ضروری تحقیقات کے اضافے کے ساتھ اس کا ایک جامع خلاصہ تیار کیا جس کا نام انھوں نے زبدۃ الاتقان رکھا۔ اس میں انھوں نے اتقان کے تمام اہم مباحث کو بڑے اختصار اور جامعیت کے ساتھ سہل اور آسان اسلوب میں بیان کردیا ہے۔

**ترجمۂ زبدۃ الاتقان**: زبدۃ الاتقان کی افادیت اور علمی قدر و قیمت کو دیکھتے ہوئے استاذ مکرم حضرت علامہ محمد احمد مصباحی شیخ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور نے ناچیز (مترجم) کو اس کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ حضرت کے حکم پر ترجمہ کا آغاز تو کردیا مگر کافی تاخیر کے بعد اسے خدمت گرامی میں پیش کرسکا۔ حضرت نے خردہ نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے ہجوم کار کے باوجود اسے دیکھا اور جابجا اصلاحات فرمائیں جس سے ترجمہ کی قدر و قیمت میں زبردست اضافہ ہوا۔ فجزاہ اللہ تعالی خیر الجزاء

<u>کچھ خاص باتیں جن سے ترجمہ میں اعتنا کیا گیا</u>

[۱] پوری کوشش کی گئی ہے کہ ترجمہ اردو کے عصری اسلوب سے ہم آہنگ اور آسان ہو۔

[۲]: آیات کا اعراب، ان کا ترجمہ اور ان کا نمبر لکھ دیا گیا ہے۔

[۳] پوری آیت مذکور نہ ہونے کی صورت میں زیادہ تر اسے مکمل لکھ دیا گیا ہے۔

[۴] ایسی آیات بھی لکھ دی گئی ہیں جن کی طرف کتاب میں صرف اشارہ کیا گیا تھا۔

[۵] اگر کسی مسئلے میں احناف کے مذہب کا ذکر مناسب تھا تو اسے بھی ذکر کردیا گیا ہے۔

[۶] ایسے عربی الفاظ کے معانی بھی لکھ دیے گئے ہیں جن کا ذکر کرنا ضروری تھا۔

۞ ۞ ۞ ۞

## جلال الدین سیوطی مصنف ''الاتقان فی علوم القرآن''

**نام ونسب** : عبد الرحمٰن بن کمال ابی بکر بن محمد بن سابق الدین بن الفخر عثمان بن ناظر الدین محمد بن سیف الدین خضر بن نجم الدین ابی الصلاح ایوب بن ناصر الدین محمد بن شیخ ہمام الدین خضیری سیوطی۔

**لقب**: جلال الدین **کنیت**: ابوالفضل

**ولادت**: امام سیوطی محلّہ اسیوط میں بعد مغرب، شب یک شنبہ، ابتداے ماہ رجب ۸۴۹ھ میں پیدا ہوئے اور یتیمی کی حالت میں نشو ونما پائی کیوں کہ چھ سال کی عمر میں ہی ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔

**تحصیل علم اور اس کے لیے اسفار**: آپ ایسے دیندار متواضع گھرانے میں پلے بڑھے جس نے آپ کے دل میں علم اور علما کی محبت جاگزیں کر دی تھی اِسی لیے آپ نے آٹھ سال سے کم عمر میں قرآن کریم حفظ کر لیا، پھر عمدہ، منہاج الفقہ والاصول اور الفیہ ابن مالک یاد کر لی۔

آغازِ ۸۶۴ھ سے علم میں انہماک کی ابتدا ہوئی تو بلند پایہ علما کی ایک جماعت سے فقہ اور نحو اخذ کیا۔ اپنے دور کے ماہرِ علم فرائض شیخ شہاب الدین شار مساحی سے فرائض کی تحصیل کی۔ ابتداے ۸۶۶ھ میں عربی زبان اور اس کے علوم کی تدریس کی اجازت ملی۔ اسی سال اپنی پہلی تصنیف شرح الاستعاذۃ والبسملۃ لکھی اور اسے اپنے استاذ شیخ الاسلام سراج الدین بلقینی کی خدمت میں پیش کیا جسے انھوں نے اپنی تقریظ سے مزین فرمایا، ان کی حیات تک ان سے تحصیلِ فقہ کرتے رہے، ان کی وفات کے بعد ان کے نامور فرزند شیخ علَم الدین بلقینی کی شاگردی اختیار کی۔ ۸۷۶ھ میں انھوں نے بھی آپ کو تدریس وافتا کی اجازت دی۔ ان کی وفات کے بعد شیخ الاسلام شرف الدین مناوی کی صحبت میں آ گئے۔

حدیث اور عربی زبان اور اس کے علوم کی تحصیل کے لیے شیخ امام علاّمہ تقی الدین شبلی حنفی کے دامنِ علم وفضل سے وابستہ ہو کر پورے انہماک کے ساتھ چار سال تک ان سے اکتسابِ فیض کرتے رہے۔ شیخ نے آپ کی تالیف شرح الفیہ ابن مالک اور جمع الجوامع پر تقریظ بھی تحریر فرمائی۔

چودہ سال تک شیخ علاّمہ استاذ الوجود محیؔ الدین کافیجی کی صحبت میں رہ کر زیورِ علم سے آراستہ و پیراستہ ہوتے رہے۔ ان سے تفسیر، اصول، عربی زبان اور اس کے علوم اور معانی وغیرہ فنون کی تحصیل کی۔ علاّمہ کافیجی نے بھی آپ کو تدریس کی عظیم تحریری اجازت مرحمت فرمائی۔

شیخ سیف الدین حنفی، حافظ ابن حجر عسقلانی، شیخ صیرافی اور شمس مرزبانی کے اَسباق میں بھی حاضر ہوئے۔

طلبِ علم کے لیے سفر کی صعوبتوں اور سختیوں کی پروا کیے بغیر آپ نے بکثرت اَسفار کیے اور باکمال علما کی خدمات میں پہنچ کر ان سے اکتسابِ علم و فضل کیا چناں چہ اس مقصد کے لیے آپ نے صیوم، محلّہ، دمیاط، شام، حجاز، یمن، ہندستان اور مغرب کا سفر کیا۔

**تعداد اساتذہ:** آپ کے اساتذہ کی تعداد تقریباً ایک سو پچاس ہے۔

**تلامذہ:** بے شمار تشنگانِ علم و معرفت نے آپ کے بحرِ علم و حکمت سے اپنی علمی و فکری تشنگی بجھائی جن میں علاّمہ، محدّث، حافظ شمس الدین محمد بن علی بن احمد داوٗدی مصری شافعی آپ کے مشہور ترین تلامذہ میں سے ہیں۔

**تبحر علمی:** اپنی خود نوشت سوانح میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"رُزِقْتُ التَّبَحُّرَ فِيْ سَبْعَةِ عُلُوْمٍ: التَّفْسِيْرِ وَ الْحَدِيْثِ، و الفِقْهِ، و النَّحْوِ، و المَعَانِيْ وَ الْبَيَانِ، وَ البَدِيْعِ ، على طَرِيْقَةِ الْعَرَبِ وَ البُلَغَآءِ، لَا عَلى طَرِيْقَةِ الْعَجَمِ، وَ أَهْلِ الْفَلْسَفَةِ".

مجھے سات علوم: تفسیر، حدیث، فقہ، نحو ــــــ اور عجم اور فلاسِفَہ کے طرز سے جُدا، عرب اور بلغا کے طریقے پر معانی، بیان اور بدیع میں تبحّر نصیب ہوا۔"

**سیرت:** جب آپ کی عمر چالیس سال کی ہوگئی تو آپ نے عام لوگوں سے ترکِ تعلّق کر لیا اور دریائے نیل کے پاس واقع روضۃ المقیاس میں اپنے تمام اَصحاب سے یوں الگ تھلگ ہو کر گوشہ نشین ہو گئے جیسے ان سے آپ کی کوئی شناسائی ہی نہ ہو ــــ یہیں آپ کی اکثر تصنیفات معرضِ وجود میں آئیں۔

اَصحابِ دولت و ثروت اور صاحبانِ امارت و ریاست آپ سے ملاقات حاصل کرنے آتے اور آپ کی خدمت میں اَموال اور تحائف پیش کرتے لیکن آپ قبول نہ فرماتے اور واپس کر دیتے۔

بادشاہِ وقت نے آپ کو دربار شاہی میں باریابی کی دعوت دی مگر آپ نے اس کی یہ دعوت مسترد فرمادی، اِس نے آپ کی خدمت میں تحائف ارسال کیے مگر انھیں بھی قبول نہ فرمایا اور اپنی وفات تک اسی طریقے پر ثابت قدم رہے۔ (الاعلام لخیر الدین الزرکلی ۴/۷۱)

محمد ابوالفضل، امام سیوطی کی کتاب ''بغیۃ الوعاۃ'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''امام سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی نجی زندگی میں علما اور اَصحاب فضل و دین کی بہتر روش پر قائم تھے۔ وہ پاکباز، نیک دل اور آسودہ خاطر تھے، صاحبانِ جاہ واقتدار سے دور رہتے، کسی امیر یا وزیر کے دروازے پر نہ جاتے، اپنے شیخ کی خانقاہ سے جو خورش مل جاتی اسی پر قناعت کرتے اور کسی دوسری چیز کی طمع نہ رکھتے، اُمرا اور وُزرا آپ سے ملنے آتے اور آپ کو اپنی بخششیں اور عَطیّات پیش کرتے مگر آپ لینے سے انکار کر دیتے۔

روایت ہے کہ سلطان شہاب الدین غوری نے ایک بار ایک آختہ غلام اور ایک ہزار اشرفیاں آپ کی خدمت میں پیش کیں تو آپ نے اشرفیاں واپس کر دیں اور آختہ غلام کو قبول فرمالیا پھر آزاد کر کے اسے حجرۂ نبوی کا خادم مقرر کر دیا اور سلطان کے قاصد سے کہہ دیا ''اَب دوبارہ ہمارے پاس کبھی کوئی ہدیہ لے کر نہ آنا، اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سے بے نیاز کر دیا ہے''۔ (مقدمۂ بغیۃ الوعاۃ للسیوطی ۱/۱۳)

**تصنیفات**: عمر کی چالیسویں منزل پر پہنچنے کے بعد آپ نے بائیس سالوں تک تصنیف و تالیف کا ایسا سلسلہ جاری رکھا کہ اس کے نتیجے میں اسلامی مکتبۂ علم وفکر کو آپ نے تفسیر، علومِ تفسیر، حدیث، علوم حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، عربی زبان اور اس کی تمام فروع اور سیرت و تاریخ کے موضوعات پر تقریباً چھ سو گراں بہا مصنفات سے مالا مال فرمایا۔

دین اسلام اور مذہب اہلِ سنت کی ترویج و اشاعت اور مخالفین کے رد میں آپ نے بیش بہا خدمات انجام دیں اسی طرح علوم دین کے احیا اور تنقیح و توضیح میں بھی آپ کے کارنامے لازوال ہیں۔ اسی لیے آپ کو نویں صدی ہجری کا مجدّد تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کی تصانیف کا آج بھی وہ اعتبار و مقام ہے کہ علوم عربیہ وعلوم دینیہ سے شغف رکھنے والا کوئی بھی شخص ان سے بے نیاز نہیں۔

آپ کی چند مشہور تصنیفات فن وَار درج ذیل ہیں:

● **فنِ تفسیر اور اس کے متعلقات**: ① الاتقان فی علوم القرآن ② الدرالمنثور فی

التفسیر الماثور ③ تکملۃ تفسیر الشیخ جلال الدین المحلّی معروف بہ جَلالین ④ المھذّب فیما وقع فی القرآن من المعرب۔

● **حدیث اور اس کے متعلقات میں:** ① کشف المغطّا فی شرح الموطا ② التوشیح علی الجامع الصحیح ③ الدیباج علی صحیح مسلم بن الحجاج ④ اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعہ۔

● **فقہ اور اس کے متعلقات میں:** ① الازہار الفضۃ فی حواشی الروضۃ ② الاشباہ والنظائر ③ جمع الجوامع۔

● **زبان عربی اور اس کے متعلقات میں:** ① شرح الفیہ ابن مالک ② ہمع الھوامع ③ الفریدۃ فی النحو والتصریف والخط۔

● **فنِ اصول و بیان وتصوف میں:** ① شرح لمعۃ الاشراق فی الاشتقاق ② شرح الکوکب الوقاد فی الاعتقاد ③ عقود الجمان فی المعانی والبیان ④ الخیر الدال علی وجود القطب والاوتاد والنجباء والابدال۔

● **فنِ تاریخ وادب میں:** ① طبقات الحفّاظ ② تاریخ الخلفاء ③ المقامات ④ الرحلۃ المکیّۃ۔

آپ کی تمام تصانیف آپ کے وفورِ علم، رِفعتِ شان، تعمُّقِ فکر، وسعتِ اطّلاع اور علوم و فنون میں آپ کی براعت ومہارت پر شاہد عدل ہیں۔

**وفات:** پنج شنبہ ۱۹ر جمادی الاولیٰ ۹۱۱ھ کوافقِ علم ومعرفت کا یہ نیر تاباں ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا اور باب قرافہ کے باہر خانقاہ قوصون کے جوار میں تدفین عمل میں آئی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(علامہ سیوطی علیہ الرحمہ کی کتاب حسن المحاضرہ میں ان کی خودنوشت سوانح عمری اور حضرت مولانا ناظم علی استاذ الجامعۃ الاشرفیہ کے جلالین پر لکھے گئے مقدمہ سے ماخوذ)

✿ ✿ ✿ ✿

# حضرت علامہ سید محمد بن عباس علوی مالکی صاحب زبدۃ الاتقان

**نسب**: آپ کا نسب ستائیس واسطوں سے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے جا ملتا ہے، تفصیل یہ ہے:

"محمد الحسن بن علوی بن عباس بن عبد العزیز بن عباس بن عبد العزیز بن محمد بن قاسم بن علی بن عربی بن ابراہیم بن عمر بن عبد الرحیم بن عبد العزیز بن ہارون بن علوش بن مندیل بن علی بن عبد الرحمٰن بن عیسیٰ بن احمد بن محمد بن عیسیٰ بن ادریس بن عبد اللہ الکامل بن الحسن المثنیٰ بن الحسن السبط بن علی زوج السیدۃ فاطمۃ الزہراء بنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ (جشن میلاد النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ــــ بحوالہ: الطالع السعید المنتخب من المسلسلات والاسانید- مطبع سحر، جدہ)

**ولادت**: آپ کی ولادت مکہ مکرمہ میں ہوئی، اسی مقدس زمین پر نشو ونما پائی اور یہیں تعلیم و تربیت ہوئی۔ مسجدِ حرام کے تعلیمی حلقوں سے استفادہ کیا، مدرسۃ الفلاح، مدرسہ تحفیظ القرآن الکریم، اور کلیۃ الشریعہ کے باقاعدہ استاذ مقرر کیے گئے ــــ اور والد گرامی کی وفات کے تین دن بعد علماے مکہ مکرمہ آپ کے کاشانۂ اقدس پر جمع ہوئے اور مسجدِ حرام میں والد بزرگ وار کی جگہ تدریسی فرائض انجام دینے کی ذمہ داری آپ کو سپرد کی جسے آپ نے بحسن وخوبی پوری مستعدی کے ساتھ نبھایا۔

خود لکھتے ہیں:

"وَ قَدْ تَعَيَّنْتُ مُدَرِّسًا رَسْمِيًّا فِيْ كُلِّيَّةِ الشَّرِيْعَةِ سَنَة ١٣٩٠ھ. وَ بَعْدَ وَفَاةِ الْوَالِدِ بِثَلٰثَةِ أَيَّامٍ اجْتَمَعَ عُلَمَاءُ مَكَّةَ فِيْ دَارِنَا وَ كَلَّفُوْنِيْ بِالتَّدْرِيْسِ فِيْ مَقَامِ الْوَالِدِ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَلَا زِلْتُ مُسْتَعِدًّا لَهُ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ عَوْنِهٖ."

**تصانیف**: گونا گوں مصروفیات کے باوجود تصنیف وتالیف کے کام سے آپ کو بے حد دلچسپی تھی اسی لیے مختلف موضوعات پر پچیسوں کتابیں آپ کے قلم سے نکل کر منظرِ عام پر آئیں جنھیں دانش وراور تعلیم یافتہ طبقوں میں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی اور اپنے اپنے موضوع پر انھیں بیش قیمت اضافہ تصور کیا گیا۔

چند اہم کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

① زبدۃ الاتقان فی علوم القرآن- مطبوعہ دار الاحسان، قاہرہ ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء۔

② القواعد الاساسیۃ فی علم مصطلح الحدیث - جدہ ۱۴۰۲ھ

③ الانسان الکامل

④ فضل الموَطَّأ وعنایۃ الامۃ الاسلامیۃ بہ، مکہ مکرمہ ۱۳۹۸ھ۔

⑤ حولَ الاحتفال بالمولد النبوی الشریف - ۱۴۰۲ھ۔ (جشن میلاد النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نام سے اس کا اردو ترجمہ لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے)

⑥ المستشر قون بین الانصاف والعصبیۃ (''مستشرقین کا انصاف وتعصب'' کے نام سے اس کا اردو ترجمہ بھی چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ مترجم: مولانا افتخار احمد قادری - ناشر: المجمع الاسلامی مبارک پور)

⑦ الذخائر المحمدیہ

⑧ مفاہیم یجب اَن تُصحّح - (اس کا اردو ترجمہ بقلم مولانا یٰسین اختر مصباحی ''اصلاحِ فکر و اعتقاد'' کے نام سے بڑی تعداد میں چھپ کر مقبولِ خاص وعام ہو چکا ہے۔)

**عالمی اَسفار**: آپ بین الاقوامی سطح کے اسلامی مفکر و دانش ور تھے، اسی لیے دنیا کے مختلف ممالک شام، جزائر، تیونس، مصر، مراکش، انڈونیشیا، ہندوستان، برطانیہ اور کناڈا وغیرہ میں منعقد ہونے والے جلسوں اور کانفرنسوں میں آپ کو مدعو کیا جاتا تھا اور آپ اپنے گراں قدر آرا و مقالات اہلِ علم کے سامنے پیش کر کے انھیں مستفید فرماتے تھے۔

حَرمین طیبین اور عالم اسلام میں آپ کو بے پناہ قدر و منزلت حاصل تھی، علما و مشائخ آپ کی مؤثر مذہبی حیثیت اور جلالتِ شان کے قائل و معترف تھے۔

جامعہ از ہر مصر کے ایک مشہور استاذِ حدیث شیخ محمد محمد ابو زہو آپ کی دینی و علمی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

فَإِنَّ مُؤَلِّفَ هٰذَا السِّفرِ الْجَلِيلِ هُوَ الْعَلَّامَةُ الْفَاضِلُ الشَّيْخُ مُحَمَّد عَلوِيّ الْمَالِكِيّ، أَحَدُ الْعُلَمَاءِ النَّابِهِينَ وَ الشُّيُوخِ الْاَجِلَّةِ الَّذِينَ لَهُمْ شَغَفٌ بِخِدْمَةِ السُّنَّةِ النَّبَوِيَّةِ ، وَ عِنَايَةٌ كَبِيرَةٌ بِأَحَادِيثِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَ سَلَّم. (جشنِ میلاد النبی بحوالہ: فضل الموطا)۔

''اس عظیم کتاب کے مؤلّف فضیلت مآب علامہ شیخ محمد علوی مالکی ہیں جو ان گرامی منزلت علما

اور جلیل القدر شیوخ میں سے ہیں جنھیں سنت نبوی کی خدمت سے والہانہ لگاؤ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی احادیث سے زبردست اعتنا ہے۔''

آپ سلَفِ صالحین کے عقائد ومعمولات پر کاربند اور ان کے دفاع وتحفظ کے لیے ہمہ وقت کمربستہ رہتے۔ نجدیوں کی آمرانہ حکومت میں رہتے ہوئے بھی آپ نے ان کے فاسِد عقائد اور باطل اَفکار وخیالات کا پوری جرأتِ ایمانی کے ساتھ بھرپور رد فرمایا جس پر نشۂ اقتدار سے سرمست نجدی علما نے سعودی حکومت سے آپ کو تختۂ دار پر لٹکا دینے یا ملک بدر کر دینے کا پرزور مطالبہ کیا مگر حکومت آپ کے خلاف ایسا اِقدام کرنے کی ہمت نہ کر سکی ہاں یہ ضرور ہوا کہ مسجدِ حرام میں آپ کے حلقۂ درس پر پابندی عائد کر دی گئی۔

آپ کے درِ دولت پر محافِل میلاد النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا انتہائی عقیدت ومحبت اور غایت درجہ اَدب واحترام کے ساتھ انعقاد ہوتا رہتا تھا جن میں اکابر علما شرکت فرماتے۔

آپ کے دل میں مشاہیر اسلام اور اَسلافِ کرام کا بے حد احترام تھا اِسی لیے اپنے درس سے وابستہ ہونے والوں کو ان حضرات کے خلاف انگشت نمائی اور زبان درازی سے باز رہنے کی تلقین یوں فرماتے:

''وَ إِيَّاكَ ثُمَّ إِيَّاكَ أَنْ تُطْلِقَ لِسَانَكَ فِيْ اَعْرَاضِهِمْ فَإِنَّكَ إِنْ فَعَلْتَ ذٰلِكَ فَقَدْ تَظَاهَرْتَ بِالْعَدَاوَةِ وَ قَدْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالىٰ فِي الْحَدِيْثِ الصَّحِيْحِ الْقُدْسِيْ "مَنْ عَادىٰ لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ" وَ قَدْ قَالَ بَعْضُ الْعَارِفِيْنَ "إِذَا ابْتُلِيَ الْعَبْدُ بِمَعَاصِي اللّٰهِ ابْتُلِيَ بِالْوَقِيْعَةِ فِيْ اَوْلِيَاءِ اللّٰهِ " وَ مِنْ هُنَا قَالَ بَعْضُهُمْ "لُحُوْمُ الْعُلَمَاءِ مَسْمُوْمَةٌ وَ عَادَةُ اللّٰهِ فِيْ مُنْتَقِصِيْهِمْ مَعْلُوْمَةٌ"۔

''ان کی عزت وآبرو کے بارے میں زبان درازی کرنے سے باز رہو کیوں کہ تم ایسا کرو گے تو ان سے کھلم کھلا دشمنی کرو گے اور اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص کے متعلق صحیح حدیثِ قدسی میں فرما دیا ہے: ''جو میرے کسی ولی سے دشمنی کرے اس سے میرا اعلانِ جنگ ہے''۔ ایک عارف نے فرمایا: ''جب بندہ اللہ کی نافرمانیوں میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ اللہ کے ولیوں کی شان میں عیب جوئی اور سبّ وشتم میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے بعض عارفوں نے فرمایا: علما کے گوشت مسموم اور زہر آلود ہیں اور ان کی تنقیص و توہین کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی عادت معلوم ہے''۔

**وفات:** رمضان ۱۴۲۵ھ/ اکتوبر ۲۰۰۴ء میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ رب تعالیٰ انھیں رحمت وغفران سے نوازے۔

(''جشن میلاد النبی'' اور ''اصلاح فکر واعتقاد'' پر علامہ یٰسن اختر مصباحی کے مضامین سے ماخوذ)

# تعارف مترجم

**نام**: محمد عارف اللہ فیضی مصباحی (مترجم زبدۃ الاتقان)

**والد کا نام**: محمد رفعت اللہ بن محمد عبد القدیر **ولادت** : ۱۹/اپریل ۱۹۵۹ء

**مقام ولادت** : موضع ہرپور، پوسٹ متھرا بازار، ضلع گونڈہ (بعد میں) ضلع بلرام پور

**تعلیم** : مدرسہ ریاض العلوم، ہرپور میں ناظرہ قرآن کریم، خوش نویسی کی مشق اور ابتدائی درجات کی اردو کتابوں کی تعلیم ہوئی۔

فارسی وعربی کی تعلیم دار العلوم منظر حق ٹانڈہ۔ مدرسہ اشرفیہ مسعود العلوم بہرائچ شریف، دار العلوم ندائے حق جلال پور، مدرسہ عربیہ فیض العلوم محمد آباد گوہنہ اور الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں ہوئی اور یہیں سے تکمیل درس نظامی کے بعد ۱۹۸۰ء میں دستار فضیلت سے سرفرازی ہوئی۔

**تدریس** : ستمبر ۱۹۸۰ء سے تا حال مدرسہ عربیہ فیض العلوم محمد آباد گوہنہ میں کار تدریس میں مشغولیت ہے۔

**تعلیمی اسناد**: ابتدائی ادیب، ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل (جامعہ اردو علی گڑھ) منشی، کامل، مولوی، عالم، فاضل دینیات، فاضل ادب (عربی فارسی بورڈ الہ آباد) فاضل درس نظامی

**تحریری کام** : ❶ شیخ محقق عبد الحق محدث دہلوی ❷ الشیخ احمد رضا خان وشی ءمن حیاتہ وافکارہ (پروفیسر محمد مسعود احمد مرحوم کی اردو میں لکھی ہوئی کتاب کا عربی ترجمہ، جو پاکستان سے شائع ہوا۔) ❸ حضرت علوی مالکی علیہ الرحمہ کی کتاب زبدۃ الاتقان کا اردو ترجمہ جو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ❹ ۲۰۰۵ء سے مجلس شرعی مبارک پور ضلع اعظم گڑھ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے سالانہ فقہی سیمناروں کے لیے مقالات نویسی۔ ❺ استقامت ڈائجسٹ کانپور میں شیعوں کے اہم فرقوں کے نام، ان کے بانیوں اور ان کے عقائد ونظریات کے بیان پر مشتمل ایک تحقیقی عربی مضمون کا اردو ترجمہ جو کئی قسطوں میں شائع ہوا۔ ❻ استقامت کے محمد عربی نمبر میں صحابہ کرام کی عظمت وفضیلت پر ایک مضمون ❼ رضا اکیڈمی ممبئی کی جانب سے شائع ہونے والے ضخیم اور وقیع نمبر جہان مفتی اعظم میں حضور مفتی اعظم ہند رحمہ اللہ تعالیٰ کی جرأت وحق گوئی پر ایک مضمون۔ ❽ شارح بخاری حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی رحمہ اللہ تعالیٰ کی حیات وخدمات پر ماہنامہ کنز الایمان دہلی کے شارح بخاری نمبر میں "شارح بخاری - جہان علم وفضل" کے عنوان سے ایک مضمون۔ ❾ امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب شرح معانی الآثار پر صدر الشریعہ حضرت علامہ امجد علی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حاشیہ کشف الاستار کی خصوصیات پر ایک تفصیلی مضمون جو دیگر اہل علم کے مقالات کے ساتھ ایک خصوصی نمبر میں شائع ہوا۔ ۞ ۞ ۞ کتبہ محمد عارف اللہ - ۲۸ محرم الحرام ۱۴۳۳ھ/۲۴ دسمبر ۲۰۱۱ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ o اَلۡحَمۡدُ لِوَلِیِّہٖ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی نَبِیِّہٖ وَ جُنُوۡدِہٖ

# مقدمہ

## علوم قرآن یعنی علم تفسیر کی اصطلاحات کے بیان میں

تفسیر کے مطالعہ سے پہلے اصطلاح تفسیر کا جاننا ضروری ہے تا کہ انسان کو اس کی پوری بصیرت حاصل ہو جائے اور وہ مکی، مدنی، ناسخ، منسوخ اور اسباب نزول سے آگاہ ہو جائے اور آیات کے معانی و مطالب کو سمجھ سکے۔ جو شخص تفسیر کی اصطلاح سے واقف ہونے سے پہلے ہی علم تفسیر میں غور وخوض کرے گا وہ حیران و سرگرداں ہوگا، اس کی تفسیری سرگرمی اور نشاط میں کمی واقع ہوگی اور اس کے سامنے مقاصد مبہم اور غیر واضح ہوں گے۔

علم تفسیر عربوں کے قول "فَسَّرْتُ الشَّیْءَ" سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں "میں نے بیان کیا"، علم مذکور کو تفسیر کا نام اس لیے دیا گیا کہ یہ قرآن کا بیان اور اس کی وضاحت کرتا ہے۔

**تفسیر کی تعریف**: تفسیر ایسا علم ہے جس میں قرآن کریم کے احوال سے بحث کی جائے اس لحاظ سے کہ نزول میں وہ مکی ہے یا مدنی، حضری ہے یا سفری، اس کی سند کیا ہے، طرز ادا کیا ہے، الفاظ کیا ہیں، احکام سے متعلق معانی کیا ہیں اور اس طرح کی دوسری چیزیں۔

**موضوع**: مذکورہ حیثیت سے کلام الٰہی۔

**فائدہ**: معانی قرآن کے فہم تک رسائی اور فہم حاصل کرنے کے بعد اس کے مضامین پر عمل۔

**ثمرہ**: سب سے محکم اور مضبوط گرہ (قرآن کریم) سے پختہ تعلق اور دنیا و آخرت کی سعادت سے بہرہ وری۔

**واضع**: اس علم کے واضع اللہ اور اس کے رسول ہیں۔ یوں علم تفسیر، علم الٰہی بھی ہے اور علم نبوی بھی۔

**استمداد**: یہ علم خود قرآن کریم سے اور سنت نبوی و اسالیب عرب سے مدد لیتا ہے۔

**مسائل**: وہ احکام وعقائد اور امثال و مواعظ جو قرآن سے مستفاد ہیں۔

**نسبت**: یہ علم دینی علوم کے زمرے میں آتا ہے بلکہ یہ ان کے مرجع و پیشوا کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ دیگر علوم دینیہ کتاب الٰہی سے ماخوذ اور ثبوت کے بعد اعتبار و اعتماد میں اس پر موقوف ہیں۔

**فضیلت**: یہ تمام علوم میں سب سے والا مرتبت اور بزرگ تر ہے کیوں کہ علوم اپنے موضوعات کے شرف و بلندی مرتبہ کی وجہ سے ہی مقام بلند پاتے ہیں اور علم تفسیر کا موضوع تمام موضوعات سے عظیم تر اور بلند تر ہے۔

**ضرورت**: قرآن کریم ان احکام شرعیہ پر مشتمل ہے جن پر ابدی سعادت کا مدار ہے۔ ان احکام کی معرفت فہم قرآن کے بغیر ممکن نہیں۔ اور فہم قرآن ـــــ توفیق الٰہی کی یاوری کے ساتھ ـــــ علم تفسیر کے بغیر ممکن نہیں۔ یہاں تک کہ صحابۂ کرام اس کے باوجود کہ فصاحت میں ان کا پایہ بلند تھا، اور ان کا باطن مشکات نبوت کے انوار سے روشن تھا، فہم قرآن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تفسیر و بیان کے محتاج تھے۔ ایسا بہت ہوتا کہ جن باتوں سے انھیں آگاہی نہ ہوتی، یا جن تک ان کی فہم کی رسائی نہ ہوتی ان سے متعلق وہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دریافت کرتے۔ جیسے: ﴿حَتّٰی يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الخَيْطُ الاَبْيَضُ مِنَ الخَيْطِ الاَسْوَدِ﴾ سے متعلق حضرت عدی بن حاتم کا واقعہ ہے۔ اور جب صحابہ کرام محتاج تفسیر تھے تو بلا شبہہ ہمیں تفسیر کی حاجت ان سے زیادہ ہے۔

**قرآن کی تعریف**: القُرْاٰن لغةً مأخوذٌ مِنَ القَرءِ وهو الجَمْعُ، وعُرْفًا هو الكلامُ المُنَزَّلُ عَلَىٰ سَيِّدِ نَا مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، المُعْجِزُ بِسُوْرَةٍ مِّنْهُ۔

''قرآن'' لغت کے اعتبار سے ''قَرْء'' بمعنی جمع کرنا سے لیا گیا ہے۔ اور باعتبار عرف قرآن وہ کلام ہے جو ہمارے آقا محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا اور جو اپنی ایک سورہ سے بڑے بڑے اہل زبان کو عاجز و بے بس کر دینے والا ہے۔

اس تعریف میں ہمارا قول: ''الکلام'' جنس ہے جو تمام کلاموں کو شامل ہے اور ہمارا قول: ''المنزل على سيدنا محمد صلى الله عليه وسلم'' فصل ہے جس سے دوسرے انبیاے کرام پر نازل ہونے والے کلام جیسے: توریت، انجیل اور باقی آسمانی کتابیں اور صحیفے خارج ہو گئے۔ اور ہمارا قول: '' المعجز '' دوسری فصل ہے جو احادیث قدسیہ جیسے: حدیث صحیحین ﴿اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ﴾ کو خارج کر دیتی ہے۔

پھر تعریف میں صرف اعجاز کے ذکر پر اکتفا اس لیے ہے کہ قرآن کو غیر قرآن سے ممتاز کرنے کے لیے اسی کی حاجت ہے اس لیے یہ زیادہ اہم ہے ورنہ نزول قرآن کے مقاصد اعجاز کے علاوہ اور بھی ہیں۔

اور ہمارا قول '' بِسُوْرَةٍ مِّنْهُ '' اس کم تر مقدار کا بیان ہے جس سے قرآن کا معجز ہونا ظاہر ہوتا ہے اور یہ سب سے مختصر سورہ مثلاً سورہ کوثر کی مقدار ہے۔ اور قلیل ترین اعجاز کا حصول مختصر ترین سورہ سے ہی اس لیے ہوا کہ قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں جو اپنے ماسوا سے بالکل الگ تھلگ ہو بلکہ آیت کے لیے ماقبل اور مابعد سے مناسبت ضروری ہے۔ اور یہ بات کم سے کم تین آیتوں میں حاصل ہوگی۔

بعض مفسرین نے تعریف میں ﴿المُتَعَبَّدُ بِتِلَاوَتِه﴾ ''جس کی تلاوت کا حکم ہو'' کا اضافہ کیا ہے تا کہ وہ جز قرآن سے خارج ہو جائے جس کی تلاوت منسوخ ہو چکی۔

**سورہ**: قرآن کا وہ مجموعہ جو کم از کم تین آیتوں پر مشتمل ہو جو تعلیم نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک خاص نام سے موسوم ہو اور اسی خاص نام سے وہ مجموعہ مذکور و مشہور ہو۔

**آیت**: سورہ کا وہ جز جو فاصلہ کے ذریعہ ممتاز ہو۔

**فاصلہ**: آیت کا آخری کلمہ۔

## مکی اور مدنی

مکی اور مدنی سورتوں کے بارے میں اہل علم کی تین اصطلاحات ہیں۔

مشہور ترین اور صحیح ترین اصطلاح یہ ہے کہ:

**مکی**: وہ ہے جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئی۔ اور

**مدنی**: وہ ہے جو ہجرت کے بعد اتری خواہ مکہ میں اتری ہو یا مدینہ میں، فتح مکہ کے سال اتری ہو یا حجۃ الوداع کے سال، حضر میں اتری ہو یا سفر میں۔

دوسری اصطلاح یہ ہے کہ:

**مکی**: وہ ہے جو مکہ میں اتری ہو اگر چہ ہجرت کے بعد اتری ہو۔ اور

**مدنی**: وہ ہے جو مدینہ میں اتری ہو۔

اس تعریف پر واسطہ ثابت ہوتا ہے لہٰذا جن کا نزول دوران سفر ہوا ان پر مکی اور مدنی کا اطلاق نہیں ہوگا۔

تیسری اصطلاح یہ ہے کہ:

**مکی**: وہ ہے جس میں اہل مکہ سے خطاب ہو۔

**مدنی**: وہ ہے جس میں اہل مدینہ کو مخاطب کیا گیا ہو۔

قاضی ابوبکر نے اپنی کتاب "الا نتصار" میں فرمایا: مکی اور مدنی کی معرفت کے لیے صحابہ اور تابعین کی یادداشت پر اعتماد کیا جائے گا کیوں کہ اس کی بابت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کوئی قول وارد نہیں اس لیے کہ نہ تو حضور کو اس کا حکم دیا گیا اور نہ اللہ تعالیٰ نے اس کے علم کو فرائض امت سے قرار دیا۔

رہی یہ بات کہ اہل علم پر بعض قرآن میں ناسخ و منسوخ کی معرفت ضروری ہے تو یہ معرفت صریح فرمان رسول کے علاوہ دوسرے ذرائع سے حاصل ہو جاتی ہے۔

مکی و مدنی سے آگاہی کے چند فوائد ہیں۔ (۱) ناسخ و منسوخ کی معرفت (۲) ترتیب نزول قرآن کی معرفت۔

بعض صحابہ کرام جیسے حضرت سیدنا علی، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم ترتیب نزول کے علم کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔

علما نے مکی اور مدنی کی کچھ علامتیں ذکر فرمائی ہیں۔

[۱] جس سورہ میں ﴿یٰۤاَ یُّھَاالناسُ﴾ ہو اور ﴿یٰۤاَیُّھَاالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ نہ ہو وہ مکی ہے۔ مگر سورۂ حج کے بارے میں اختلاف ہے۔

[۲] جس سورہ میں لفظ ﴿کَلَّا﴾ ہو وہ مکی ہے۔

[۳] جس سورہ میں قصۂ آدم وابلیس مذکور ہو وہ مکی ہے بجز سورۂ بقرہ کے۔

[۴] جس سورہ میں منافقوں کا ذکر ہو وہ مدنی ہے۔ مگر سورۂ عنکبوت اس سے مستثنیٰ ہے۔

ہشام بن عروہ اپنے والد عروہ سے راوی ہیں کہ جن سورتوں میں حدود اور فرائض کا ذکر ہو وہ مدنی ہیں اور جن میں گذشتہ زمانوں کے لوگوں کا ذکر ہو وہ مکی ہیں۔

## فائدہ

قرآن میں کل ایک سو چودہ (۱۱۴) سورتیں ہیں۔ پچاسی (۸۵) سورتیں مکی ہیں۔ انتیس (۲۹) سورتیں مدنی۔ یہاں صرف مدنی سورتوں کے نام درج کیے جاتے ہیں۔

[۱] بقرہ [۲] آل عمران [۳] نساء [۴] مائدہ [۵] انفال [۶] توبہ [۷] رعد [۸] حج [۹] نور [۱۰] احزاب [۱۱] محمد [۱۲] فتح [۱۳] حجرات [۱۴] حدید [۱۵] مجادلہ [۱۶] حشر [۱۷] ممتحنہ [۱۸] صف [۱۹] جمعہ [۲۰] منافقون [۲۱] تغابن [۲۲] طلاق [۲۳] تحریم [۲۴] قیامہ [۲۵] زلزلہ [۲۶] قدر [۲۷] نصر [۲۸] قل اعوذ برب الفلق [۲۹] قل اعوذ برب الناس۔

## حضری اور سفری

**حضری:** جو حضر (حالت اقامت) میں نازل ہوئی۔

**سفری:** جو سفر میں نازل ہوئی۔

سفری کی چند مثالیں:

[۱] سورۂ مائدہ کی آیت تیمم جس کی ابتدا ﴿یٰۤاَیُّھَاالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا قُمۡتُمۡ اِلَی الصَّلٰوۃِ﴾ [المائدہ: ۶] سے ہوئی ہے۔ کیوں کہ اس کا نزول مقام ذات الجیش میں ہوا جو ذوالحلیفہ کے آگے ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ مقام بَیۡدَا یعنی ذوالحلیفہ میں نازل ہوئی جو مکہ کے راستے پر مدینہ سے قریب واقع ہے۔ بہر دو قول یہ آیت غزوۂ مریسیع سے واپسی میں اس وقت نازل ہوئی جب اہل اسلام

مدینہ میں داخل ہونے ہی والے تھے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کی روایت کردہ حدیث صحیح سے ثابت ہے۔

[۲] سورۂ فتح، یہ صلح حدیبیہ کے بارے میں کراع غُمیم نامی وادی میں نازل ہوئی جیسا کہ مستدرک میں حاکم نے روایت کیا۔ کُراع غُمیم سے مدینہ کی دوری تقریباً ایک سوستر میل اور مکہ کی دوری تقریباً تیس میل ہے اور عُسفان سے یہاں تک کا فاصلہ تین میل ہے۔

حضری کی مثالیں بہت ہیں اس لیے کہ یہی اصل ہے لہٰذا اس کے واضح ہونے کی وجہ سے اس کی مثالیں ذکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

## تنبیہ

نزول قرآن کی مکی، مدنی اور سفری وحضری میں تقسیم جگہ کے اعتبار سے ہے۔ زمانہ کے اعتبار سے اس کی قسمیں لیلی ونہاری اور صیفی وشتائی ہیں۔

**نہاری** کی مثالیں بہت ہیں۔ اس لیے کہ نہاری اصل ہے۔ **لیلی** (رات میں نازل ہونے والا حصۂ قرآن) کی مثالیں کم ہیں انہی میں سے ایک آیت تحویلِ قبلہ بھی ہے۔[۱]

**صیفی** (موسم گرما میں نازل شدہ) کی ایک مثال آیت کلا لہ یعنی اللہ تعالیٰ کا قول ﴿وَيَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ﴾ آخر سورہ نساء تک ہے۔ ''لوگ تم سے ایسے مورِث کے بارے میں پوچھتے ہیں جس کے ماں باپ اولاد کچھ نہ ہوں، کہہ دو اللہ تمھیں اس کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔''

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کا نام آیت صیف رکھا جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ثابت ہے۔

**شتائی** (موسم سرما میں نازل شدہ) کی ایک مثال سورۂ نور میں ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ جَاءُوْا بِالْإِفْكِ﴾ سے ﴿وَرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾ تک ہے۔ اس لیے کہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ یہ حصہ ایک دن موسم سرما میں نازل ہوا۔

## سب سے پہلے کون سی وحی نازل ہوئی

سب سے پہلے نازل ہونے والی وحی قرآنی کے متعلق علما کے چند اقوال ہیں:

---

[۱] بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تحویل قبلہ کی آیت (قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ...البقرۃ/۱۴۴) رات میں نازل ہوئی اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ دن میں۔ اتقان میں امام سیوطی نے دونوں قسم کی روایتیں ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ قاضی جلال الدین نے اس آیت کے لیلی ہونے کو ترجیح دی ہے اور علامہ ابن حجر نے نہاری ہونے کو ترجیح دی ہے۔ پھر قول دوم (نہاری) کی تائید میں امام سیوطی نے نسائی کی ایک حدیث بھی پیش کی ہے۔ ۱۲۔ مترجم۔

[۱] پہلا اور صحیح قول یہ ہے کہ ﴿ اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ ﴾ کا نزول سب سے پہلے ہوا۔ یہ صحیحین اور دوسری کتب احادیث سے ثابت ہے۔ چناں چہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر سب سے پہلے جس وحی کی آمد کا آغاز ہوا وہ نیند کی حالت میں نظر آنے والے نیک خواب کی صورت میں تھی اسی لیے حضور جو بھی خواب دیکھتے وہ ظہور صبح کے مانند سچ ثابت ہوتا پھر آپ کے دل میں خلوت وتنہائی کی طرف میلان پیدا ہوا اس لیے غار حرا میں خلوت گزیں ہو کر کئی کئی راتوں تک مصروف عبادت رہتے۔ پھر حضرت خدیجہ کے پاس آکر اتنی ہی راتوں کے لیے مزید اشیاے خورد ونوش لے جاتے یہاں تک کہ غار حرا میں آپ کے پاس وحی آئی چناں چہ فرشتۂ الٰہی آکر عرض گزار ہوا: اِقۡرَاۡ (پڑھیے) فرماتے ہیں: میں نے کہا: میں نہیں پڑھوں گا۔ کہتے ہیں: اس پر اس نے مجھے پکڑ کر طاقت بھر دبوچا اور چھوڑ کر کہا: اِقۡرَاۡ (پڑھیے) میں نے اس بار بھی یہی کہا: میں نہیں پڑھوں گا۔ اس نے دوبارہ مجھے پکڑ کر طاقت بھر دبوچا پھر چھوڑ کر کہا: اِقۡرَاۡ (پڑھیے) میں نے کہا: میں نہیں پڑھوں گا۔ فرماتے ہیں: اس نے مجھے تیسری بار پکڑ کر طاقت بھر دبوچا۔ پھر چھوڑ کر کہا

﴿اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ، خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ﴾ [علق:۲] [۱]

بعض روایتوں میں ہے فرشتے نے "مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ" تک قراءت کی۔ (یہ حدیث طویل ہے یہاں مختصراً ذکر کی گئی ہے۔)

[۲] دوسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے "یٰۤاَیُّهَا الۡمُدَّثِّرُ" کا نزول ہوا اس لیے کہ شیخین نے ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن سے روایت کی۔ انھوں نے فرمایا: میں نے حضرت جابر بن عبد اللہ سے پوچھا کہ سب سے پہلے قرآن کی کون سی وحی اتری؟ انھوں نے جواب دیا: " یٰۤاَیُّهَا الۡمُدَّثِّرُ"۔ میں نے کہا: سب سے پہلے یہ نازل ہوئی یا "اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ"؟ اس پر انھوں نے کہا: میں تمھیں وہ بات بتا رہا ہوں جو اللہ کے رسول نے ہمیں بتائی تھی۔ حضور نے فرمایا: میں غارِ حرا میں عبادت کے لیے قیام پذیر تھا پھر جب میں نے اپنا یہ قیام مکمل کر لیا تو حرا سے اتر کر وادی میں داخل ہوا اور اپنے آگے پیچھے اور دائیں بائیں دیکھا پھر آسمان کی طرف نظر اٹھائی تو دیکھا کہ وہی (جبریل) ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی میرے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اس لیے میں نے خدیجہ کے پاس آکر اہل خانہ کو چادر اڑھانے کا حکم دیا اس نے مجھے چادر اڑھادی پھر اللہ تعالیٰ نے "یٰۤاَیها المدثر" نازل فرمائی۔

علماے دین نے اس تعارض کے چند جواب دیے ہیں جن میں مشہور تر جواب یہ ہے کہ حدیثِ جابر میں اولیت سے مراد "مخصوص اولیت" ہے یعنی آتشِ دوزخ سے لوگوں کو ڈرانے کا حکم

(۱) اپنے اس رب کے نام سے پڑھو جس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ انسان کو بستہ خون سے پیدا کیا۔

حضور کو سب سے پہلے اس وحی کے ذریعہ دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسالت کے لیے سب سے پہلے "یاَیھا المدثر" نازل ہوئی اور نبوت کے لیے سب سے پہلے "اقرأ باسم ربك" نازل ہوئی۔

بعض علما نے یہ جواب دیا کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مراد یہ ہے کہ سورۂ مدثر سب سے پہلی وہ سورہ ہے جو مکمل طور پر نازل ہوئی۔ یوں یہ بات اس قول کے معارض نہ ہوگی کہ "اقرأ" مطلقاً سب سے پہلے نازل ہوئی کیوں کہ "اقرأ" یکبارگی پوری کی پوری نازل نہیں ہوئی بلکہ اولاً اس کا صرف ابتدائی حصہ نازل ہوا تھا۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ صحیحین میں خود انھیں حضرت جابر سے ایک روایت یہ آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ابھی چل ہی رہا تھا کہ میں نے آسمان سے ایک آواز سنی، آواز سنتے ہی جب میں نے اپنا سر اٹھایا تو دیکھا کہ آسمان و زمین کے درمیان آویزاں ایک کرسی پر وہی فرشتہ بیٹھا ہے جو حرا میں میرے پاس آیا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میں گھر لوٹ آیا اور خدیجہ سے کہا: مجھے چادر اڑھاؤ، مجھے چادر اڑھاؤ، اس نے مجھے چادر اڑھادی۔ پھر اللہ نے "یاَیُّھا المدثر" نازل فرمائی۔

اس حدیثِ پاک میں حضور کا ارشاد "اَلْمَلَكُ الَّذِیْ جَاءَ نِیْ بِحِرَاءَ" اس بات پر دلیل ہے کہ یہ واقعہ، اس واقعۂ حرا کے بعد پیش آیا جس میں "اقرأ باسم ربك" کا نزول ہوا۔

میں کہتا ہوں دلیل کے اعتبار سے اس باب میں یہ سب سے صحیح جواب ہے۔

بعض علما نے یہ جواب دیا کہ یہ رائے حضرت جابر کا اپنا استخراج ہے۔ یہ ان کی روایت میں داخل نہیں۔ لہٰذا حضرت عائشہ کی روایت اس پر مقدم ہوگی۔ یہ سب سے عمدہ جواب ہے۔

[۳] تیسرا قول یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ سب سے پہلے نازل ہوئی۔ اس کا ثبوت اُس حدیث سے فراہم ہوتا ہے جسے امام بیہقی نے روایت کیا۔ مگر علما نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ حدیثِ مذکور، حدیثِ مرسل ہے۔ یا اس میں یہ احتمال ہے کہ حضور نے اقرأ نازل ہونے کے بعد سب سے پہلے سورۂ فاتحہ کے نزول کی خبر دی ہو۔

[۴] چوتھا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" نازل ہوئی۔

علامہ سیوطی نے اس کا یہ جواب دیا کہ یہ خود کوئی مستقل قول نہیں کیوں کہ کسی بھی سورہ کے نزول کے ساتھ بسم اللہ کا نزول ضروری و لابدی تھا۔

اس سلسلہ میں مذکورہ اقوال کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں مگر وہ سند کے اعتبار سے ثابت نہیں اور اگر صحیح بھی ہوں تو ان کی تاویل یہ ہے کہ "اَوَّلُ مَا نَزَلَ" حرفِ مِنْ کے محذوف ہونے کی تقدیر پر "مِنْ اَوَّلِ مَا نَزَلَ" ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ فلاں سورہ نسبتاً سب سے پہلے نازل ہونے والی سورتوں

میں سے ایک ہے۔ جیسے سورۂ مدثر جو فترت وحی کے بعد سب سے پہلے نازل ہوئی۔ اور شاید اس کا آخری حصہ سورۂ اقرأ کے باقی ماندہ حصے کے نزول سے پہلے نازل ہوا۔

## اوائل مخصوصہ

[۱] مکہ میں سب سے پہلے "اقرأ باسم ربك" اور مدینہ میں سب سے پہلے سورۂ بقرہ اور ایک قول کے مطابق "ویل للمطففین" نازل ہوئی۔

[۲] مکہ میں سب سے آخر میں سورۂ مومنون اور مدینہ میں سب سے آخر میں سورۂ براءت نازل ہوئی۔

[۳] جہاد کے بارے میں سب سے پہلے آیت "اُذِنَ لِلَّذِ یْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَ نَّھُمْ ظُلِمُوا" [الحج/۳۹] نازل ہوئی۔ "جن سے کافر لڑتے ہیں انھیں جہاد کی پروانگی اس بناپر عطا ہوئی کہ ان پر ظلم ہوا"

[۴] شراب کے بارے میں سب سے پہلے "یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ" [البقرہ/۲۱۹)] نازل ہوئی۔ "لوگ تم سے شراب اور جوے کا حکم پوچھتے ہیں۔"

[۵] امام بخاری کی روایت ہے کہ سورۂ والنجم سب سے پہلی سورہ ہے جس میں سجدہ کا نزول ہوا۔

[٦] کھانے کی چیزوں کے بارے میں سب سے پہلے مکہ میں " قُلْ لَا اَجِدُ فِیْمَا اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا" [الانعام/١٤٥] اور مدینہ میں "اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃَ" [البقرۃ/ ۱۷۳] نازل ہوئیں۔

## کس وحی کا نزول سب سے آخر میں ہوا

اس سلسلہ میں علما کے چند اقوال ہیں جن میں مشہورتر یہ ہے کہ:

[۱] سب سے آخر میں اللہ تعالیٰ کا قول "یَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰہُ یُفْتِیْکُمْ" (النساء /١٧٦) نازل ہوا۔ (بخاری و مسلم)

[۲] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ سب سے آخر میں آیت ربا "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوااتَّقُوااللّٰہَ وَذَرُوامَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا (البقرۃ / ۲۷۸) نازل ہوئی۔ (بخاری) "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور باقی ماندہ سود چھوڑ دو۔"

[۳] انھیں کا ایک قول یہ بھی ہے کہ سب سے آخر میں آیت " وَاتَّقُوا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَی اللّٰہِ (البقرۃ/۲۸۱) نازل ہوئی۔ "اور اس دن سے ڈرو جس میں اللہ کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔"

[۴] حضرت سعید بن مسیّب نے کہا: سب سے آخر میں آیتِ دَین نازل ہوئی۔ امام سیوطی

نے فرمایا: یہ حدیث مرسل اور سند صحیح کے ساتھ مروی ہے۔

قول دوم اور اس کے بعد مذکور دونوں قولوں میں تطبیق اس طرح دی جاسکتی ہے کہ یہ تمام آیتیں مصحف شریف میں اپنی موجودہ ترتیب کے مطابق یکبارگی نازل ہوئیں۔ یوں ان میں سے ہر ایک آیت پر سب سے آخر میں نازل ہونے کی بات صادق آجائے گی۔ اب قول اول کی تاویل یہ ہوگی کہ فرائض ومیراث سے متعلق وہ آیت سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ لیکن اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ قول باری تعالیٰ "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ"(۱) (المائدہ/۳) جو حجۃ الوداع کے سال مقام عرفات میں نازل ہوا اس کا کھلا مفہوم یہ ہے کہ اس آیت کے نزول سے پہلے ہی تمام فرائض واحکام کی تکمیل ہوچکی تھی جب کہ آیات ربا ودَین وکلالہ کے بارے میں وارد ہے کہ یہ سب "الیوم اکملت لکم الخ" کے بعد نازل ہوئیں۔

علما نے اس اشکال کے پیش نظر اس آیت کریمہ کی یہ تاویل فرمائی کہ تکمیل دین سے "اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں کو بلد حرام (مکۂ معظّمہ) میں اقامت گزیں کرنا اور مشرکوں کو وہاں سے جلاوطن کرنا" مراد ہے۔ یہاں تک کہ جب اہل اسلام نے فریضۂ حج ادا کیا تو حالت یہ تھی کہ کوئی بھی مشرک ان میں شامل نہیں تھا۔ اس کی تائید حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ پہلے مسلمان اور مشرکین ایک ساتھ حج کیا کرتے تھے لیکن جب سورۂ براءت نازل ہوئی تو مشرکوں کو خانۂ خدا سے بے دخل کردیا گیا اور بیت الحرام میں کسی بھی مشرک کی شرکت کے بغیر صرف مسلمانوں نے حج کیا۔ اس طرح یہ کمال نعمت کے ذیل میں آتا ہے اور اسی لیے ارشاد ہوا "وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ" (المائدہ/۳) "اور تم پر اپنی نعمت تمام کردی۔"

## سب سے آخر میں نازل ہونے والی وحی کے متعلق دوسرے اقوال اور ان کے جوابات

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے سب سے آخر میں نازل ہونے والی وحی کے بارے میں بہت سے علما کے دوسرے اقوال بھی ذکر کیے ہیں جن میں سے چند ذیل میں ذکر کیے جارہے ہیں:

### آخری وحی

[۱] سورۂ "اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ" (النصر/۱)(۲) ہے۔

[۲] سورۂ مائدہ ہے۔

---

(۱) آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کردیا۔　(۲) جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے۔

[۳] آیت کریمہ "لَقَدْ جَاءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ" (التوبہ/۱۲۸)[1] ہے۔

[۴] سورۂ فتح ہے۔

[۵] سورۂ براءت ہے۔

امام بیہقی نے کہا: ان مختلف اقوال کے درمیان ان کے صحیح ہونے کی شرط پر تطبیق یوں دی جائے گی کہ ہر ایک اہل علم نے وہی جواب دیا جو اس کے نزدیک ثابت و معلوم تھا۔

قاضی ابوبکر نے ''انتصار'' میں فرمایا: ان اقوال میں سے کسی قول کی بھی سند رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک نہیں پہنچتی۔ اس لیے ان علما نے جو بھی کہا ایک طرح سے اپنے اجتہاد اور غلبۂ ظن کی بنیاد پر کہا۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ ہر ایک نے اس سب سے آخری وحی کے بارے میں خبر دی ہو جو اس نے بذات خود نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اس دن سنی جس دن آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے یا اس راوی نے وہ وحی مرض وفات سے ذرا پہلے سنی اور دوسروں نے اس کے بعد حضور سے دوسری وحی سنی۔

## سبب نزول کی معرفت

قرآن کا نزول دو طرح ہوتا۔ ایک یہ کہ ابتداءً نزول ہو۔ یعنی کوئی واقعہ یا سوال پیش آئے بغیر کوئی وحی نازل ہو۔ دوم: یہ کہ کسی واقعہ یا سوال کے بعد وحی کا نزول ہو۔

علما نے قسم ثانی کی تلاش وجستجو کے بعد اس میں مخصوص کتابیں تصنیف فرمائیں جن میں انھوں نے ان آیات کا بیان فرمایا جو کسی سبب کی بنیاد پر نازل ہوئیں پھر اس سبب کا بیان فرمایا اور اس سلسلہ میں انھوں نے اپنی جد و جہد اور کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

اس موضوع پر سب سے مشہور کتاب امام سیوطی کی "لُبَابُ النُّقُول فِی اَسْبَا بِ النُّزُول ہے۔

اس کام کے کئی زبردست فائدے ہیں جن میں سے بعض فوائد یہاں ذکر کیے جاتے ہیں۔

[۱] سبب نزول کے بیان سے وہ حکمت معلوم ہو جاتی ہے جو کسی حکم کی تشریع کا سبب ہوئی۔

[۲] سبب نزول کی معرفت معانی قرآن کو سمجھنے کا ایک مضبوط ذریعہ ہے۔ اس لیے کہ سبب جان لینے سے مسبَّب بھی معلوم ہو جاتا ہے۔

اس کی تائید میں ہم یہاں صرف دو واقعات ذکر کرتے ہیں جن سے واضح ہوگا کہ اگر سبب نزول معلوم نہ ہوتا تو فہم معنی اور ادراک مقصود میں بہتوں کے قدم پھسل جاتے۔

مروان بن حکم نے ارشاد خداوندی "لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَا اَتَوْا الخ" (آل عمران/۱۸۸)

(۱) بے شک تمھارے پاس تمھیں میں سے ایک رسول تشریف لائے۔

پڑھنے کے بعد کہا: خدا کی قسم اگر ہر ایسا شخص سزاوارِ عذاب ہے جو خدا کی عطا کردہ کسی نعمت پر اتراتا ہو اور نا کردہ کام پر تعریف و ستائش کیے جانے کو پسند کرتا ہو تو ہم سب ضرور عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے۔

مروان نے ظاہر آیت کے اعتبار سے تو صحیح سمجھا مگر اس کی حقیقت کیا ہے۔اس سے نقاب کشائی کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیت اہلِ کتاب کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان سے ایک چیز کے متعلق دریافت فرمایا تو انھوں نے اسے مخفی رکھتے ہوئے آپ کو ایک دوسری بات بتائی اور ظاہر یہ کیا کہ انھوں نے آپ کو اسی بات سے باخبر کیا ہے جس کے متعلق آپ نے دریافت کیا تھا اور اس پر انھوں نے حضور سے درخواست کی کہ وہ اپنی زبان سے ان کی تعریف و ستائش کریں۔(بخاری و مسلم)

حضرت عثمان بن مظعون اور حضرت عمرو بن معدی کرب سے منقول ہے کہ یہ دونوں حضرات کہتے کہ شراب مباح ہے۔ اور دلیل میں فرمان خداوندی "لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْا" (المائدہ /۹۳)[۱] کو پیش فرماتے۔حالانکہ انھیں اگر اس کا سببِ نزول معلوم ہوتا تو ایسی بات نہ کہتے۔

اس آیت کا سبب نزول یہ ہے کہ جب شراب حرام قرار دی گئی تو کچھ لوگوں نے کہا: ان مسلمانوں کا کیا حال ہوگا جنھوں نے دین کی سر بلندی کے لیے جام شہادت نوش کیا یا جن کی وفات ہوگئی مگر (شراب کی حرمت نازل نہ ہونے کے سبب) وہ شراب جیسی ناپاک چیز پیتے رہے؟ تو اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔اسے امام احمد اور نسائی وغیرہما نے باسانید صحیحہ روایت کیا۔اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کے فرمان "فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ"(البقرۃ/۱۱۵)[۲] کا سبب نزول معلوم نہ ہوتا تو کوئی کہنے والا کہہ سکتا تھا کہ ظاہر آیت اس بات کا افادہ کررہا ہے کہ نماز پڑھنے والے پر حالت نماز میں قبلہ کی طرف رخ کرنا نہ سفر میں واجب ہے نہ حضر میں۔ حالانکہ یہ خلاف اجماع ہے۔لیکن اس کا سببِ نزول معلوم ہونے کے باعث ہمیں یہ معلوم ہے کہ یہ سفر کی نماز نفل کے بارے میں نازل ہوئی یا اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی جس نے اجتہاد و تحری سے کسی ایک سمت کو سمت قبلہ مان کر نماز پڑھ لی پھر اسے اپنی خطا کا علم ہوا۔آیت مذکورہ کے سبب نزول میں دونوں طرح کی روایتیں آئی ہیں۔

---

[۱] جو ایمان لائے اور نیک کام کیے ان پر کچھ گناہ نہیں ہے اس شراب میں جو انھوں نے چکھا۔

[۲] تو جس طرف بھی منہ پھیرو ادھر ہی اللہ کا قبلہ ہے۔

## کیا سبب نزول خاص ہونے کی وجہ سے حکم بھی خاص رہے گا

اس مبحث سے متعلق ایک اہم اور قابل توجہ مسئلہ ہے جس میں علمائے اصول کے درمیان اختلاف ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ جب ہمیں کسی حکم شرعی پر مشتمل آیت کا سبب نزول معلوم ہو گیا تو آیا وہ حکم اسی سبب کے ساتھ خاص ہوگا جس میں آیت کا نزول ہوا یا لفظ عام ہونے کے باعث دوسری اشیا کو بھی شامل ہوگا؟ اسی کو علمائے اصول یوں کہتے ہیں ''کیا اعتبار عموم لفظ کا ہوگا یا خصوص سبب کا''؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مشہور اور صحیح ترین قول یہ ہے کہ اعتبار لفظ کے عموم کا ہوگا اس لیے حکم سبب نزول کے علاوہ اور اشیا کو بھی شامل ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کی متعدد آیات کچھ مخصوص اسباب میں نازل ہوئیں مگر علما اس پر متفق ہیں کہ ان سے ثابت شدہ احکام ان اسباب کے علاوہ دوسرے افراد میں بھی جاری و ثابت ہوں گے۔ جیسے آیت ظہار، سلمہ بن صخر کے بارے میں، آیت لعان، ہلال بن امیہ کے بارے میں، اور آیت حد قذف حضرت عائشہ صدیقہ پر تہمت لگانے والوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ پھر ان آیات کا حکم دوسرے افراد میں بھی جاری و ثابت ہوا۔ لیکن جو علما عموم لفظ کا اعتبار نہیں کرتے وہ کہتے ہیں کہ یہ اور اس جیسی دوسری آیات کا حکم جو دوسرے افراد تک متعدی ہوا تو ایک دوسری دلیل کی وجہ سے متعدی ہوا۔

حافظ سیوطی کہتے ہیں کہ عموم لفظ کے معتبر ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ صحابۂ کرام کے درمیان یہ بات عام تھی کہ وہ پیش آمدہ مسائل میں ان آیات کے عموم سے استدلال کرتے تھے جو خاص اسباب میں نازل ہوئی تھیں۔

یہ نقطۂ نظر صرف اس آیت کے تعلق سے ہے جس کا لفظ عموم کا افادہ کرتا ہو۔ لیکن وہ آیت جس کا نزول کسی معین و مخصوص سبب سے متعلق ہو اور اس کے لفظ میں عموم نہ ہو تو پھر وہ آیت قطعی طور پر اسی حد تک محدود رہے گی۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ " وَ سَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى" (اللیل / ۱۷)[۱] بالاجماع ایک معین شخصیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور جن لوگوں نے اس قاعدے پر عمل کرتے ہوئے یہ گمان کیا کہ یہ آیت کریمہ ہر اس شخص کو عام ہے جو حضرت ابوبکر جیسا عمل کرے تو یہ محض ان کا وہم ہے۔ اس لیے کہ اس آیت میں کوئی صیغۂ عموم موجود نہیں ہے کیوں کہ الف لام اسی وقت عموم کا افادہ کرتا ہے جب وہ ایسا اسم موصول ہو جس کا صلہ جمع ہو یا حرف تعریف ہو اور جمع پر داخل ہو۔ اور بعض علما نے یہ اضافہ کیا کہ یہی الف لام مفرد میں بھی عموم کے لیے آجاتا ہے بشرطے کہ وہاں کوئی معہود نہ ہو۔ اور " الاتقیٰ" میں الف لام موصولہ نہیں۔

---

[۱] اور بہت جلد وہ سب سے بڑا پرہیزگار اس جہنم سے دور رکھا جائے گا جو اپنا مال اس لیے دیتا ہے کہ ستھرا ہو۔

اس لیے کہ "اَلْ" موصولہ باجماع نحاۃ افعل تفضیل (اسم تفضیل) کے ساتھ نہیں لگایا جاتا اور الاتقیٰ جمع نہیں بلکہ مفرد ہے۔ اور معہود بھی موجود ہے۔ ساتھ ہی اسم تفضیل کا صیغہ بھی سب سے امتیاز اور قطع شرکت کا افادہ کررہا ہے۔ اس لیے عموم کا قول باطل ہے اور قطعی طور پر یہ متعین ہے کہ اس کا حکم صرف اسی شخصیت تک مخصوص ومحدود ہے جس کے بارے میں آیت کا نزول ہوا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

## بحث اسباب نزول سے متعلق چند فوائد

اسباب نزول کے مآخذ: کسی شخص کے لیے اپنے قیاس واجتہاد سے کسی آیت کا سبب نزول متعین کرنا روا نہیں بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے ان لوگوں سے روایت وسماع حاصل ہو جنھوں نے تنزیل قرآن کا مشاہدہ کیا، اسباب سے آگہی حاصل کی اور علم اسباب کی تحقیق اور تلاش وجستجو میں سرگرم رہے۔

حضرت امام محمد بن سیرین نے فرمایا: میں نے عَبیدہ سلمانی سے قرآن کی ایک آیت کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا: اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو۔ اب وہ لوگ نہ رہے جو ان اسباب سے آگاہ تھے جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نازل فرمایا۔ یاد رکھو صحابۂ کرام ہی اس نقل کے اول وآخر مرجع تھے اور وہ اس سے ان قرائن کی مدد سے واقف تھے جو پیش آنے والے مسائل کو محیط ہوتے۔

میں کہتا ہوں: وہ اس سے اس طرح بھی واقف ہو جاتے کہ وہ ہمیشہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحبت میں رہتے، آپ کے حالات سے واقف رہتے، آپ پر نازل ہونے والی آیات کریمہ کے تتبع وتلاش میں رہتے اور بنفس نفیس اسباب کو ملاحظہ فرماتے۔

### قول صحابہ: هٰذِهِ الْاٰيَةُ نَزَلَتْ فِي كَذَا "یہ آیت فلاں امر کے بارے میں نازل ہوئی" کا مطلب

صحابۂ کرام کے قول "یہ آیت فلاں امر کے بارے میں نازل ہوئی" سے کیا مراد ہے؟ آیا یہ قول حدیث مرفوع کے قائم مقام اور سبب نزول کا بیان ہے یا نہیں؟

واضح رہے کہ صحابی جب یہ صاف صاف بتائیں کہ فلاں آیت کے نزول کا سبب فلاں معاملہ ہے تو ان کا یہ بیان حدیث مرفوع کا درجہ رکھتا ہے۔

لیکن جب وہ کہیں کہ "نَزَلَتْ فِيْ كَذَا" یعنی اس طرح کے معاملے میں فلاں آیت اتری تو یہ قول بھی حدیث مسند ومرفوع کے قائم مقام ہے یا اس تفسیر صحابی کے قائم مقام ہے جو غیر مرفوع ہے؟

اس بارے میں علما کا اختلاف ہے۔ امام بخاری اسے مسند مانتے ہیں اور دیگر حضرات اسے مسند کا درجہ نہیں دیتے۔ اکثر مسانید جیسے مسند امام احمد وغیرہ میں یہی دوسری اصطلاح اختیار کی گئی ہے۔ اس کے برخلاف جب صحابی صاف صاف بتائیں کہ فلاں سبب اور معاملہ پیش آیا تو فلاں آیت

اتری اس صورت میں تمام علما قول صحابی کو حدیث مسند کا درجہ دیتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ صحابی کا قول مذکور "نزلت فی کذا" اس آیت کے سبب نزول کا بیان ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں علامہ زرکشی نے برہان میں فرمایا: صحابہ وتابعین کی یہ عادت معلوم ومشہور ہے کہ جب ان میں کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ آیت فلاں معاملے میں اتری تو اس سے اس کی مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ یہ آیت اس معاملے کے حکم پر مشتمل ہے نہ یہ کہ وہ معاملہ اس کے نزول کا سبب ہے۔ لہٰذا یہ قول آیت سے حکم پر استدلال کی قبیل سے ہوگا واقعۂ نزول کے بیان کی قبیل سے نہ ہوگا۔

## ایک آیت اور اس کے متعدد اسباب

مفسرین کبھی نزول آیت کے متعدد اسباب بیان کرتے ہیں۔ اگر اس کی صورت یہ ہو کہ ایک ہی آیت کے بارے میں ایک مفسر اجمالاً یہ بتائے کہ "فلاں امر میں نازل ہوئی" اور دوسرا بھی اجمالاً کسی دوسرے معاملے میں اس کا نزول بتائے۔ کوئی یہ صراحت نہ کرے کہ اس آیت کا "سبب نزول" فلاں معاملہ ہے۔ تو اس طرح کے بیان سے زیادہ تر تفسیر مقصود ہوتی ہے۔ سبب نزول کا بیان مقصود نہیں ہوتا۔ اور اگر لفظ میں اتنی گنجائش ہو کہ دونوں مفسروں کا بیان اس کے تحت آسکتا ہو تو دونوں کے قول میں کوئی منافات بھی نہیں۔

اور اگر ایک مفسر اجمالاً بتائے کہ "نَزَلَتْ فِيْ كَذَا" یہ آیت فلاں امر میں نازل ہوئی۔ اور دوسرا مفسر اس کے برخلاف صراحۃً یہ بتائے کہ اس آیت کا سبب نزول فلاں امر ہے تو یہی معتمد ہے اور پہلے مفسر کا قول ایک استخراج واستنباط ہے۔

اس کی مثال وہ حدیث ہے جو امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عمر سے بسند صحیح روایت کی۔ آپ نے فرمایا: "نِسَاءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ" (البقرۃ/ ۲۲۳) بیویوں کے ساتھ ان کے پیچھے کے مقام میں بدفعلی کرنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب کہ امام مسلم کی حضرت جابر سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا: یہود کہتے تھے کہ جو شخص اپنی بیویوں کے آگے کی شرم گاہ میں سرین کی طرف سے جماع کرے گا اس کا بچہ بھینگا پیدا ہوگا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے "نِسَاءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ[۱]" نازل فرمائی۔ تو یہاں معتمد حدیث جابر ہے اس لیے کہ یہ نقل ہے۔ اور ابن عمر کا قول ان کا اپنا استنباط ہے۔

اگر کوئی مفسر ایک سبب ذکر کرے اور دوسرا کوئی اور سبب ذکر کرے تو اگر ان میں سے ایک قول کی اسناد صحیح ہو اور دوسرے کی صحیح نہ ہو تو معتمد وہی ہوگا جس کی سند صحیح ہو۔

[۱] تمھاری عورتیں تمھارے لیے کھیتیاں ہیں، اس لیے اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ۔

اس کی مثال یہ ہے کہ صحیحین میں ثابت ہے کہ جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بیماری کی وجہ سے ایک یا دو راتوں کو نہ کھڑے ہو سکے تو ایک عورت نے آپ کے پاس آ کر کہا: میرے خیال میں آپ کے شیطان نے آپ کو چھوڑ دیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے "وَالضُّحٰى وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ، مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى" (الضحیٰ/۱)[۱] نازل فرمائی۔ اور طبرانی نے روایت کی کہ ایک پلا، نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کاشانۂ اقدس میں داخل ہونے کے بعد تخت کے نیچے جا کر مر گیا اور پھر چار دن مسلسل گذر گئے مگر آپ پر کوئی وحی نازل نہ ہوئی یہاں تک کہ جب لوگوں کو اس پلے کا پتہ چلا اور اسے انھوں نے نکال دیا تو جبریل امین علیہ السلام فرمانِ الٰہی "والضحیٰ الخ" لے کر نازل ہوئے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں فرمایا: پلے کے سبب جبریل کے وحی میں تاخیر کرنے کا واقعہ مشہور تو ہے مگر اس کا نزولِ آیت کا سبب ہونا غریب ہے۔ اور اس کی سند میں ایک ایسا راوی بھی ہے جو معروف نہیں اس لیے قابل اعتماد وہی ہے جو صحیح میں مذکور ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ کسی آیت کا نزول دو یا اس سے زیادہ اسباب کے بعد ہو۔ ایسی صورت میں اس آیت کو انھیں دو یا دو سے زائد اسباب پر محمول کیا جائے گا۔ کیوں کہ کسی آیت کے نزول کے متعدد اسباب ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آیت کا نزول متعدد بار اور تکرار کے ساتھ ہو اور ہر بار کے نزول کا سبب جداگانہ ہو۔

اس کی مثال یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب حضرت حمزہ کے شہید کر دیے جانے اور ان کا مثلہ کر دیے جانے کے بعد ان کی لاش کے پاس کھڑے ہوئے تو فرمایا: "میں لازمی طور پر آپ کے بدلے ستر کافروں کا مثلہ کروں گا" لیکن ابھی آپ اس مقام پر کھڑے ہی تھے کہ حضرت جبریل، سورۂ نحل کی آخری آیات لے کر نازل ہو گئے جس میں یہ آیت بھی تھی "وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ" (النحل/۱۲۶)[۲] اس حدیث کو بیہقی و بزار نے بسند صحیح روایت کیا۔

یہ بھی وارد ہے کہ یہ آیت فتح مکہ کے دن نازل ہوئی چوں کہ احد کے دن انصار نے (جب یہ دیکھا کہ ستر شہیدوں کا مثلہ کر دیا گیا ہے جن میں چونسٹھ انصاری اور چھ مہاجر تھے تو) کہا تھا: خدا کی قسم اگر ہمیں ایسا کوئی دن ملے گا تو ضرور ہم اس تعداد پر اضافہ کریں گے یعنی ستر سے زیادہ کا مثلہ کر ڈالیں گے۔ (ترمذی وحاکم)

ان دونوں روایتوں کے درمیان تطبیق کی صورت یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ سب سے پہلے مکہ

---

[۱] "چاشت کی قسم اور رات کی جب پردہ ڈالے کہ تمھیں تمھارے رب نے نہ چھوڑا اور نہ مکروہ جانا"۔

[۲] "اور اگر تم سزا دو تو ویسی ہی سزا دو جو تمھیں دی گئی"۔

میں ہجرت سے قبل سورۂ نحل کے ساتھ نازل ہوئی کیوں کہ یہ سورہ مکی ہے۔ پھر دوبارہ احد میں اور اس کے بعد تیسری بار فتح مکہ کے دن نازل ہوئی۔

## مختلف آیات اور ان کا ایک سبب

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم میں ایک ہی واقعہ کے بارے میں مختلف سورتوں میں متعدد آیات نازل ہوتی ہیں۔ اس کی مثال وہ حدیث ہے جسے ترمذی وحاکم نے حضرت ام سلمہ سے روایت کیا۔ انھوں نے کہا: یارسول اللہ! میں نہیں سنتی کہ اللہ نے ہجرت کی بابت عورتوں کا کوئی ذکر کیا ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں "فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَا اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى " [۱](آل عمران/۱۹۵) آخر آیات تک نازل فرمائی۔

حاکم نے حضرت ام سلمہ سے یہ حدیث بھی روایت کی کہ وہ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ مردوں کا تو ذکر کرتے ہیں مگر عورتوں کا ذکر نہیں فرماتے؟ اس پر "اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ" (الاحزاب/۳۵) اور "اَنِّیْ لَا اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى" (ال عمران/ ۱۹۵) نازل ہوئیں۔

## وہ آیاتِ قرآنی جو بعض صحابہ کی زبان کے موافق نازل ہوئیں

اس باب میں اصل حضرت عمر کی موافقت میں اترنے والی آیات ہیں۔ چنانچہ آپ کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ کبھی کبھار آپ کسی معاملے میں کوئی گفتگو کرتے اور قرآن آپ کے قول کے موافق نازل ہوجاتا۔ اسی لیے حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عمر کی زبان اور دل پر حق کو جاری فرمادیا ہے۔ (رواہ الترمذی)

امام بخاری وغیرہ نے حضرت انس سے روایت کی۔ انھوں نے کہا: حضرت عمر نے فرمایا: میں نے اپنے رب سے تین باتوں میں موافقت کی۔ پہلی یہ کہ میں نے کہا یارسول اللہ! کیا اچھا ہو اگر ہم لوگ مقام ابراہیم کو مصلّیٰ (نماز گاہ) بنالیں تو "وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى" (البقرۃ/۱۲۵)[۲] نازل ہوگئی۔ دوسری یہ کہ میں نے کہا یارسول اللہ! آپ کی بیویوں کے پاس نیک و بد دونوں آتے ہیں۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ آپ انھیں پردہ کرنے کا حکم صادر فرمائیں تو آیت حجاب نازل ہوگئی۔ تیسری یہ کہ جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بیویاں غیرت برتنے میں آپ کے خلاف متفق ہوگئیں تو میں نے ان سے کہا اگر حضور تم کو طلاق دے دیں تو وہ دن دور نہیں کہ ان کا رب انھیں تمھاری

[۱] تو ان کی دعا سن لی ان کے رب نے کہ میں تم میں کام والے کی محنت اکارت نہیں کرتا، مرد ہو یا عورت۔
[۲] اور ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کا مقام باؤ۔

جگہ تم سے بہتر بیویاں عطا فرما دے تو اسی طرح آیت کریمہ بھی نازل ہوگئی۔

امام سیوطی نے حضرت عمر کے موافقات میں ایک خاص رسالہ بھی تصنیف فرمایا ہے جس کا نام ہے: "قَطفُ الثَّمَرُ فِیْ مُوافقَا تِ عُمَرُ"

## جن کا نزول متعدد بار ہوا

علماے متقدمین و متاخرین کی ایک جماعت نے ذکر کیا کہ قرآن میں کچھ آیتیں اور سورتیں ایسی بھی ہیں جن کا نزول ایک سے زیادہ مرتبہ ہوا۔ اس میں کچھ حکمتیں ہیں۔ مثلاً:

(۱) وعظ و نصیحت (۲) مکرر نزول کے مقتضی کا موجود ہونا (۳) نازل ہونے والی آیت یا سورہ کی زیادتی فضیلت کا اظہار۔

بعض علما کے بیان کے مطابق آیت روح، سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص اسی قبیل سے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تکرار نزول کا سبب یہ ہو کہ اس سے قراءت کے لفظ کے مختلف ہونے کا فائدہ حاصل ہو جائے تو کوئی آیت ایک بار ایک لفظ کے ساتھ نازل ہو اور دوسری بار کسی اور لفظ کے ساتھ نازل ہو۔ بعید نہیں کہ سورۂ فاتحہ ایک بار مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ" کے ساتھ اتری ہو اور دوسری بار لفظِ "مَلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ" کے ساتھ نازل ہوئی۔

## قرآن کے حفاظ اور راویوں کی معرفت

امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے روایت کی انھوں نے کہا: میں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا "قرآن چار لوگوں عبداللہ بن مسعود، سالم، معاذ اور ابی بن کعب سے سیکھو" ان چار حضرات میں جن دو کا نام حضور نے پہلے ذکر فرمایا ان کا تعلق مہاجرین سے ہے جب کہ بعد والے دو کا تعلق انصار سے ہے۔ سالم سے ابو حذیفہ کے غلام سالم بن معقل اور معاذ سے معاذ بن جبل مراد ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ صرف یہی حفاظ قرآن ہوئے بلکہ ان کے علاوہ دوسرے صحابۂ کرام بھی ان کی طرح حفاظ قرآن ہوئے ہیں۔ صحیح حدیث میں غزوۂ بیر معونہ کے متعلق مذکور ہے کہ اس میں جام شہادت نوش کرنے والے قرا یعنی حفاظ کی تعداد ستر (۷۰) تھی۔

امام بخاری ہی نے حضرت قتادہ سے روایت کی، انھوں نے کہا: میں نے حضرت انس بن مالک سے پوچھا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں کون کون لوگ پورے قرآن کے حافظ و جامع تھے؟ انھوں نے جواب دیا: یہ چار حضرات: ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابو زید جن میں سے ہر ایک کا تعلق قبیلۂ انصار سے تھا۔ میں نے پوچھا یہ ابو زید کون ہیں؟ انھوں نے

جواب دیا میرے چچا ہیں۔

بسند ثابت حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ بھی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: حضور کی وفات کے وقت پورے قرآن کے جامع (حافظ) صرف ابودرداء، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابو زید تھے۔

اس حدیث میں حدیث قتادہ کی دو طرح مخالفت ہے۔ ایک تو چار میں حصر کی تصریح۔ دوسرے ابی بن کعب کی جگہ ابو درداء کا ذکر۔ اسی لیے ائمہ کی جماعت نے چار میں حصر کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔

مازری نے کہا: حضرت انس کے قول "لَمْ يَجْمَعْهُ غَيْرُهُمْ" سے یہ لازم نہیں آتا کہ حقیقت میں بھی ایسا ہو۔ کیوں کہ اس عبارت کی تقدیر یہ ہے کہ "انھیں اس کا علم نہیں کہ ان چار کے علاوہ کوئی اور بھی جامع قرآن تھا" ورنہ صحابۂ کرام کی کثرت تعداد اور مختلف شہروں اور ملکوں میں ان کے پھیل جانے کی صورت میں یہ معلوم کر لینا حضرت انس کے لیے کیسے ممکن ہوا کہ جامعین قرآن صرف یہی چار ہیں اور کوئی بھی نہیں۔ کیوں کہ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ انھوں نے سب سے الگ الگ ملاقاتیں کی ہوں اور ہر ایک نے انھیں بتایا بھی ہو کہ عہد نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں اس کا جمع قرآن مکمل نہ ہوسکا تھا۔ اور یہ عادۃً انتہائی بعید بات ہے۔ اور جب ان کی عبارت کا مطلب یہ ہوا کہ ان کا قول ان کی اپنی معلومات پر مبنی تھا تو یہ لازم نہیں آیا کہ حقیقت میں بھی یہی صورت حال رہی ہو۔

ملحدین کی ایک جماعت نے حضرت انس کے اسی قول کو اپنے موقف کی دلیل ٹھہرایا حالاں کہ ان کا اسے اپنی دلیل قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں۔ کیوں کہ ہمیں اس قول کا اپنے ظاہر مفہوم پر محمول ہونا تسلیم ہی نہیں اور اگر ہم تسلیم بھی کر لیں تو صحابۂ کرام کے جم غفیر میں سے ہر ایک کے پورے قرآن کا حافظ نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایک جم غفیر نے پورے قرآن کا حفظ نہ کیا ہو۔ اور تواتر کے لیے یہ شرط نہیں کہ ہر فرد جمیع قرآن کا حافظ ہو بلکہ اگر سب نے پورے قرآن کا حفظ کر لیا اگرچہ متفرق طور پر ہی سہی تو یہ بھی کافی ہوگا۔

قرطبی نے کہا: جنگ یمامہ کے دن ستر قراء یعنی حفاظ شہید ہوئے۔ جب کہ حفاظ صحابہ کی اتنی ہی تعداد عہد رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں بیر معونہ کے مقام پر شہادت سے ہم کنار ہوئی۔ مزید فرمایا کہ حضرت انس نے خاص طور پر صرف چار کا ذکر اس لیے فرمایا کہ ان کا ان حضرات سے جو شدید اور گہرا تعلق تھا وہ دوسروں سے نہیں تھا یا انھوں نے یہ اس لیے کہا کہ صرف یہی لوگ اس وقت ان کے ذہن میں تھے۔

قاضی ابوبکر باقلانی نے کہا: حدیث انس کا جواب چند وجوہ سے ہے۔

(۱) پہلی وجہ یہ ہے کہ قول انس کا کوئی مفہوم مخالف نہیں۔ لہٰذا یہ لازم نہ آئے گا کہ صحابۂ کرام میں ان چار کے علاوہ کوئی اور حافظ نہ ہو۔

(۲) دوسری یہ کہ اس سے مراد یہ ہے کہ صرف ان چار حضرات نے ان تمام وجوہ قراءات کے ساتھ جمع قرآن کیا جن کے مطابق نزول قرآن ہوا۔

(۳) تیسری یہ کہ یہ چار حضرات اس قرآن کے بھی حافظ تھے جو غیر منسوخ ہے اور اس کے بھی جو ایک زمانے تک تلاوت جاری رہنے کے بعد منسوخ ہوگیا۔ دیگر حضرات میں یہ جامعیت نہ تھی۔

(۴) چوتھی یہ کہ جمع قرآن سے، ان چاروں کا براہ راست زبان رسالت سے پورے قرآن کا حاصل کرنا مراد ہو۔ برخلاف بعض دوسرے حضرات کے کہ ممکن ہے انھوں نے کچھ قرآن بالواسطہ اخذ کیا ہو۔

(۵) پانچویں یہ کہ یہ لوگ قرآن کی تعلیم وتدریس سے وابستہ رہتے۔ اس لیے ان کا حافظ قرآن ہونا مشہور ہوگیا اور ان سے واقفیت رکھنے والے حضرت انس کو دیگر حضرات کا علم نہ ہوسکا۔ اس لیے انھوں نے اپنے علم وآگہی کے مطابق جمع قرآن کو انھیں چار میں منحصر کردیا جب کہ حقیقت امر ایسی نہ تھی۔

(۶) چھٹی وجہ یہ ہے کہ حضرت انس کے قول میں "جَمْع" سے مراد کتابت (لکھنا) ہے۔ لہٰذا یہ دوسروں کے پورا قرآن جمع کر لینے یعنی زبانی یاد کر لینے کے منافی نہ ہوگا۔ رہے یہ چار حضرات تو انھوں نے قرآن کو لکھ کر بھی جمع کیا اور اسے زبانی یاد بھی کیا۔

(۷) ساتویں یہ کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان چار حضرات نے صاف صاف یہ بتایا کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانے ہی میں پورا قرآن یاد کرلیا۔ دوسرے حفاظ نے یہ صراحت نہ کی۔ کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ قرآن کی آخری آیت جب نازل ہوئی ہو تو وہ دیگر حفاظ موجود نہ رہے ہوں اگرچہ دوسرے بہت سے لوگ موجود ہوں جن میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیان کردہ چار حفاظ بھی شامل ہیں۔

(۸) آٹھویں یہ کہ جمع قرآن سے مراد "قرآن کی اطاعت وفرماں برداری کرنا اور اس کے موجب پر عمل کرنا" ہے۔ امام احمد نے کتاب الزہد میں ابو الزاہریہ کے طریق سے روایت کی کہ ایک شخص نے حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آکر ان سے کہا: میرے بیٹے نے قرآن جمع کرلیا، تو آپ نے فرمایا: اے اللہ! مغفرت فرما، جامع قرآن تو وہ ہے جو اس کی اطاعت وفرماں برداری کرے۔

علامہ ابن حجر نے کہا: مذکورہ بالا اکثر احتمالات اور خاص طور سے آخری احتمال تکلف سے خالی

نہیں۔ پھر فرمایا: میرے ذہن میں ایک اور احتمال آیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت انس کا مقصد صرف قبیلۂ خزرج کے لیے اس کا اثبات اور قبیلۂ اَوس سے اس کی نفی ہے۔ لہٰذا ان کا یہ قول مہاجرین سے اس کی نفی نہ کرے گا۔ کیوں کہ انھوں نے یہ بات اَوس وخزرج کے درمیان جاری باہمی مفاخرت کے پس منظر میں کہی ہے۔ جیسا کہ ابن جریر، بطریق سعید بن عروبہ، قتادہ سے اور یہ حضرت انس سے روایت کرتے ہیں انھوں نے کہا: اوس اور خزرج نے ایک دوسرے پر اپنے فخر وتعلی کا اظہار کیا۔ چناں چہ اوس نے کہا: ہمارے درمیان چار قابل فخر لوگ ہیں۔

(۱) ایک سعید بن معاذ جن کے لیے عرش خوشی سے جھوم اٹھا۔

(۲) دوسرے خزیمہ بن ثابت جن کی گواہی دو مردوں کے برابر قرار پائی۔

(۳) تیسرے حنظلہ بن ابو عامر جنھیں فرشتوں نے غسل دیا۔

(۴) چوتھے عاصم بن ثابت جن کی حفاظت شہد کی مکھیوں کی فوج نے کی۔

اس کے جواب میں خزرج نے کہا: ہم میں بھی چار ایسے مایۂ ناز افراد موجود ہیں جنھوں نے پورا قرآن اپنے سینوں میں محفوظ کر لیا جب کہ ان کے علاوہ کوئی اور حفظ نہ کر سکا۔ پھر حضرت انس نے ان چاروں کے اسما کا ذکر فرمایا۔

علامہ ابن حجر مزید کہتے ہیں: کثیر احادیث سے ظاہر ہے کہ حضرت ابو بکر حیات رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں قرآن حفظ کیا کرتے تھے۔ چناں چہ صحیح میں ہے کہ انھوں نے اپنے گھر کے صحن میں ایک مسجد بنائی تھی جس میں وہ قرآن کریم پڑھتے یعنی حفظ کرتے تھے۔

یہ بات اس پر محمول ہے کہ جتنا قرآن اس وقت تک نازل ہو چکا تھا اسے پڑھتے اور حفظ کرتے تھے۔

پھر کہتے ہیں: یہ ایسی بات ہے جس میں ذرا بھی شک نہ ہونا چاہیے۔ کیوں کہ حضرت ابو بکر کو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے قرآن سیکھنے کا زبردست شوق تھا اور مکہ میں قیام کے دوران ان کو اس کا بھرپور موقع بھی ملا۔ کیوں کہ وہاں دونوں حضرات کثرت سے ساتھ ساتھ رہے۔ یہاں تک کہ حضرت عائشہ نے کہا: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہمارے گھر صبح وشام آیا کرتے تھے۔ اور حدیث صحیح میں ہے ''لوگوں کی امامت وہ شخص کرے جو ان میں کتاب اللہ کا زیادہ پڑھنے والا ہو'' تو حضور کا حضرت ابو بکر کو اپنی بیماری میں مہاجرین وانصار کا امام ہونے کی حیثیت سے آگے بڑھانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ان میں سب سے بڑے قاری قرآن تھے۔ (اور اس زمانے میں جو جتنا قرآن پڑھتا اتنی مقدار کا وہ عالم وحافظ بھی ہوتا)

ابوعبید نے کتاب القراءات میں اصحاب نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں سے قراء یعنی حفاظ کا ذکر کرتے ہوئے مہاجرین میں خلفاے اربعہ، طلحہ، سعد، ابن مسعود، حذیفہ، سالم، ابو ہریرہ، عبد اللہ بن سائب، عبد اللہ بن عباس، عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن عمرو، عائشہ، حفصہ، اور ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وعنہن کا اور انصار میں عُبَادَہْ بن صَامِت، اَبوحَلِیْمَہْ معاذ، مُجَمِّعْ بن جَارِیَہ، فُضَالَہْ بن عُبَید اور مَسْلَمَہْ بن خَالِد کا شمار کیا اور تصریح کی کہ بعض نے تکمیل حفظ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پردہ فرمانے کے بعد کی۔

طبقات القراء میں ذہبی کے بیان کے مطابق، جو صحابہ قرآن پڑھانے میں مشہور ہوئے وہ سات حضرات ہیں۔ عثمان، علی، ابی بن کعب، زید بن ثابت، ابن مسعود، ابودرداء اور ابوموسیٰ اشعری۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

پھر لکھا کہ حضرت ابی بن کعب سے ایک جماعت صحابہ نے پڑھا جن میں حضرت ابو ہریرہ، ابن عباس، اور عبد اللہ بن سائب رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں۔

ان میں حضرت ابن عباس نے حضرت زید بن ثابت سے بھی پڑھا اور ان لوگوں سے تابعین کی ایک جماعت نے قرآن اخذ کیا۔

## مدینہ کے قراے تابعین

ابن مسیّب، عروہ، سالم، عمر بن عبد العزیز، سلیمان بن یسار، عطاء بن یسار، معاذ بن حارث معروف بہ معاذ القاری، عبد الرحمٰن بن ہرمز اعرج، ابن شہاب زہری، مسلم بن جُنْدَب، زید بن اسلم۔ رحمہم اللہ

## مکہ کے قراے تابعین

عبید اللہ بن عُمَیر، عطاء بن ابی رباح، طاؤس، مجاہد، عکرمہ، ابن ابوملیکہ۔ رحمہم اللہ

## کوفہ کے قراے تابعین

علقمہ، اسود، مسروق، عَبِیدہ، عَمرو بن شُرَحْبِیل، حارث بن قیس، ربیع بن خُثَیم، عمرو بن میمون، ابوعبد الرحمٰن سُلَمی، زِرّ بن حُبَیش، عُبید بن نُضَیلَہ، سعید بن جُبَیر، نخعی، شعبی۔ رحمہم اللہ

## بصرہ کے قراے تابعین

ابوالعالیہ، ابورجاء، نصر بن عاصم، یحییٰ بن یعمر، حسن، ابن سیرین، قتادہ۔ رحمہم اللہ

## شام کے قراے تابعین

مغیرہ بن ابی شہاب مخزومی تلمیذ حضرت عثمان، خلیفہ بن سعد تلمیذ حضرت ابودرداء۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

پھر کچھ لوگوں نے یک سُو ہوکر ضبط قراءت سے پورے طور پر اعتنا کیا۔ یہاں تک کہ اس فن میں وہ ایسے امام ثابت ہوئے جن کی اقتدا کی جاتی اور تشنگان فن قراءت جن کے پاس پڑھنے کے لیے سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے جاتے۔ چناں چہ مدینہ میں ابوجعفر یزید بن قعقاع، پھر شیبہ بن نصاع اور پھر نافع بن نعیم، مکہ میں عبداللہ بن کثیر، حمید بن قیس اعرج، محمد بن ابی محیصن، کوفہ میں یحیی بن وثاب، عاصم بن ابی النَّجود، سلیمان بن اعمش، پھر حمزہ پھر کسائی، بصرہ میں عبداللہ بن ابی اسحاق، عیسی بن عمر، ابو عمرو بن علاء، عاصم جُحْدَرِی، پھر یعقوب حَضْرمی اور شام میں عبد اللہ بن عامر، عطیہ بن قیس کلابی، اسمٰعیل بن عبداللہ بن مہاجر، پھر یحییٰ بن حارث ذِماری، پھر شُریح بن یزید حضرمی ایسی ہی نادرۂ روزگار شخصیتیں تھیں۔

ان میں سات ائمۂ قراءت وہ ہیں جنھیں چاردانگ عالم میں شہرت وناموری حاصل ہوئی۔

(۱) **نافع**: انھوں نے ستر تابعین سے علم قراءت اخذ کیا جن میں ابوجعفر بھی شامل ہیں۔

(۲) **ابن کثیر**: انھوں نے صحابیِ رسول عبداللہ بن سائب سے اکتساب علم کیا۔

(۳) **ابوعمرو**: انھوں نے تابعین سے علم قراءت حاصل کیا۔

(۴) **ابن عامر**: انھوں نے حضرت ابودرداء اور تلامذۂ حضرت عثمان سے اکتساب کیا۔

(۵) **عاصم**: انھوں نے تابعین سے استفادہ کیا۔

(۶) **حمزہ**: انھوں نے عاصم، اعمش، سَبِیْعی اور منصور بن معتمر وغیرہ سے پڑھا۔

(۷) کسائی: انھوں نے حمزہ اور ابوبکر بن عیاش سے استفادہ کیا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

اس کے بعد ان کی قراءتیں دنیا کے چپے چپے میں پھیل گئیں اور ان کے حاملین ہر چہار جانب اس طرح منتشر ہوگئے کہ یکے بعد دیگرے ہر زمانے میں ان کے گروہ موجود رہے۔

ان ساتوں طرق میں سے ہر طریق کے رواۃ میں دو دو راویوں نے شہرت پائی۔

(۱) امام نافع کے راوی قالون اور وَرْش۔ یہ دونوں حضرات امام نافع سے بلا واسطہ روایت کرتے ہیں۔

(۲) امام ابن کثیر کے راوی قُنبل ــــ بَزِّی۔ یہ حضرات ابن کثیر سے بواسطۂ تلامذۂ ابن کثیر راوی ہیں۔

(۳) امام ابوعمرو کے راوی دُورِی — سُوسی۔ یہ حضرات ابوعمرو سے بواسطۂ امام یزید روایت کرتے ہیں۔

(۴) امام ابن عامر کے راوی ہشام — ابن ذَکوان۔ یہ حضرات ابن عامر سے ان کے تلامذہ کے واسطے سے روایت کرتے ہیں۔

(۵) امام عاصم کے راوی حفص بن سلیمان — ابوبکر شعبہ بن عَیّاش۔ یہ حضرات امام عاصم سے بلاواسطہ راوی ہیں۔

(۶) امام حمزہ کے راوی خَلَف — خَلّاد۔ یہ حضرات بواسطۂ سلیم بن عیسیٰ، امام حمزہ کے راوی ہیں۔

(۷) امام کسائی کے راوی ابوالحارث — دُوری۔ اول بلاواسطہ، ثانی بواسطۂ یزیدی۔

پھر جب اختلاف روایات کا شگاف وسیع ہوگیا اور قریب تھا کہ حق و باطل خلط ملط ہو جائیں تو باخبر ناقدِین امت اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے اپنی بے اندازہ جد و جہد سے حروف و قراءات کو جمع کیا، وجوہِ قراءات اور روایات کو ان کے اصحاب کی طرف منسوب کیا، صحیح، مشہور، اور شاذ کو اپنے وضع کردہ اصول اور تفصیل کردہ ارکان کی مدد سے ایک دوسرے سے ممتاز اور الگ کیا۔ چناں چہ قراءات کے بیان میں سب سے پہلے ابوعبید قاسم بن سلّام نے پھر احمد بن جبیر کوفی پھر اسمٰعیل بن اسحٰق مالکی شاگردان قالون پھر ابوجعفر بن جریر طبری پھر ابوبکر محمد بن احمد بن عمر دانی پھر ابوبکر بن مجاہد نے تصنیفات کیں۔

ابوبکر بن مجاہد کے دور میں اور ان کے بعد کے ادوار میں علماے قراءت مسلسل کتب قراءت تصنیف کرتے رہے۔ بعض میں تمام انواع قراءات کا بیان ہوتا، بعض میں کسی ایک قراءت کا ذکر ہوتا، کوئی کتاب مختصر ہوتی، کوئی بہت طویل ہوتی۔

ان قراءتوں کے ائمہ حد شمار سے باہر ہیں۔ طبقات قرا کے بیان میں حافظ اسلام ابوعبداللہ ذہبی اور ان کے بعد حافظ قراءات ابوالخیر ابن الجزری نے کتابیں لکھیں۔

## مشہور، متواتر، آحاد، شاذ، موضوع اور مدرج کی معرفت

### قراءت کی تین قسمیں ہیں: متواتر، آحاد، شاذ

اس سلسلے میں سب سے اچھی بحث اپنے وقت کے امام اور استاذ اساتذۂ امام سیوطی، ابوالخیر ابن الجزری نے کی ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب "النشر" کے آغاز میں فرمایا: جو قراءت کسی بھی "وجہ" سے زبان عربی کے موافق اور مصاحف عثمانی میں کسی ایک مصحف کے مطابق ہو اگرچہ یہ مطابقت صرف بطور احتمال ہو اور اس کی سند ثابت ہو تو وہ قراءت صحیح ہے اور اس کا ردو انکار کسی طرح جائز نہیں۔ بلکہ یہ

ان سات حروف (قراءات) میں سے ایک ہے جن کے ساتھ قرآن کا نزول ہوا اور جن کا قبول کرنا لوگوں پر لازم ہوا خواہ وہ قراءت، ائمۂ سبعہ یا ائمۂ عشرہ یا ان کے علاوہ اور دوسرے قابل اعتماد و اعتبار ائمہ سے مروی ہو۔ لیکن اگر ان تینوں بنیادی ارکان میں سے کوئی ایک رکن بھی فوت ہو تو اس قراءت کو ضعیف یا شاذ یا باطل کہا جائے گا خواہ وہ ائمہ سبعہ یا ان سے بھی عظیم تر ائمہ سے مروی ہو۔ یہی محققین ائمۂ سلف و خلف کے نزدیک صحیح ہے۔

ابن جزری مزید فرماتے ہیں: مذکورہ بالا ضابطہ کے بیان میں ہمارے قول "وَلَوْ بِوَجْهٍ" سے وجوہ نحو میں سے کوئی ایک وجہ مراد ہے۔ خواہ وہ وجہ افصح ہو یا فصیح متفق علیہ، یا فصیح مختلف فیہ باختلاف غیر مضر۔ ہاں یہ شرط ہے کہ وہ قراءت شائع و ذائع ہو اور اسناد صحیح کے ساتھ ائمہ نے اسے تسلیم کیا ہو۔ کیوں کہ یہی سب سے عظیم بنیاد اور سب سے صحیح رکن ہے۔ اسی لیے کتنی قراءتیں ایسی ہیں جن کا بعض اہل نحو یا کثیر اہل نحو نے انکار کیا مگر ان کے انکار کا چنداں اعتبار نہ کیا گیا۔ جیسے "بارئکم" میں ہمزہ اور "یأمرکم" میں را کو ساکن کرنا اور "والارحام" کی میم کو جر دینا۔

امام جزری نے مزید فرمایا: کسی ایک مصحف عثمانی کی موافقت سے ہماری مراد یہ ہے کہ وہ قراءت، بعض مصاحف عثمانی میں موجود ہو گو بعض دوسرے مصاحف عثمانی میں موجود نہ ہو۔ جیسے سورۂ بقرہ میں ابن عامر کا "قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ" کو بے واو پڑھنا اور "بِالزُّبُرِ وَ بِالْكِتَابِ" میں الزبر اور الکتاب کو حرف با کے اثبات کے ساتھ پڑھنا کیوں کہ اس کا اثبات مصحف شامی میں ہے۔ اور جیسے ابن کثیر کا آخر سورۂ براءت میں "تحتها" سے پہلے "من" کی زیادتی کے ساتھ "تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ" پڑھنا کہ یہ مصحف مکی میں موجود ہے۔

ہم نے چند قراءتیں بطور مثال پیش کر دیں۔ مزید کتب فن میں دیکھیں۔

لیکن اگر وہ قراءت کسی بھی مصحف عثمانی میں موجود نہ ہو تو رسم متفق علیہ کی مخالفت کی وجہ سے وہ قراءت شاذ ہوگی۔

پھر فرمایا: ہمارے قول "اس کی سند صحیح ہو" سے مراد یہ ہے کہ اس قراءت کو عادل اور ذہن و تحریر میں محفوظ رکھنے والے شخص نے اپنے ہی جیسے شخص سے روایت کیا ہو اور ایسا ہی منتہائے سند تک ہو، اسی کے ساتھ وہ قراءت، ائمہ قراءات کے نزدیک مشہور ہو ان کے نزدیک غلط یا شاذ میں اس کا شمار نہ ہو۔

امام جزری نے اس فصل کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ ان کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ قراءتوں کی چار قسمیں ہیں:

(۱) **متواتر**: یہ وہ قراءت ہے جسے ایسی جماعت نے نقل کیا ہو جس کا جھوٹ پر متفق ہونا ممکن

نہ ہو۔اور یہی حال منتہائے سند تک ہو۔ بیشتر قراءتیں اسی درجے کی ہیں۔

(۲) **مشہور**: یہ وہ قراءت ہے جس کی سند تو صحیح ہو مگر درجۂ تواتر تک نہ پہنچتی ہو۔ ہاں زبان عربی ورسم عثمانی کے موافق اور قرا کے نزدیک مشہور ہو۔

یہی وجہ ہے کہ قرا نے اسے نہ تو از قبیل غلط شمار کیا اور نہ ہی اسے شاذ قرار دیا۔امام جزری کے بیان کے مطابق اس کی قراءت کی جائے گی۔اس کی مثال وہ قراءت ہے جس کے قرائے سبعہ سے منقول ہونے میں اختلاف طرق ہو کہ بعض راویوں نے اسے ان سے روایت کیا ہو اور بعض نے روایت نہ کیا ہو۔اس کی مثالیں کتب قراءات میں احکام حروف کی تفصیل میں بکثرت موجود ہیں۔

اس باب میں امام دانی کی تیسیر ،قصیدۂ امام شاطبی ،اوعیة النشر فی القراءات العشر اور تقریب النشر مشہور ترین تصنیفات سے ہیں جن میں مؤخر الذکر دونوں کتابیں ابن جزری کی تصنیف ہیں۔

(۳) **آحاد**: وہ ہیں جن کی سند صحیح ہو مگر وہ رسم عثمانی یا زبان عربی کے خلاف ہوں یا مشہور جیسی شہرت انھیں حاصل نہ ہو۔ان کی قراءت نہ کی جائے گی۔

امام ترمذی نے جامع ترمذی میں اور حاکم نے مستدرک میں اس کے لیے ایک مستقل باب قائم کیا ہے جس میں دونوں حضرات نے صحیح سندوں کے ساتھ بہت سی احادیث کی تخریج کی ہے۔انہی میں ایک حدیث وہ ہے جسے حاکم نے عاصم جحدری کے طریق سے ،حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ”مُتَّكِئِيْنَ عَلَىٰ رَفَارِفٍ خُضْرٍ وَّعَبَا قِرِيٍّ حِسَانٍ“ پڑھا۔[۱]

حاکم نے ہی حضرت ابو ہریرہ کی یہ حدیث روایت کی کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ”فَلَاتَعْلَمُ نَفْسٌ مَا اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّاتِ اَعْيُنٍ“ پڑھا۔[۲]

اور حضرت ابن عباس سے حاکم کی روایت ہے کہ حضور نے ”لَقَدْ جَاءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنفَسِكُمْ“فا کے فتحے کے ساتھ پڑھا۔[۳]

اور حضرت عائشہ سے روایت کی کہ حضور نے ”روح“کی را کے ضمے کے ساتھ ”فَرُوْحٌ وَّرَيْحَانٌ“پڑھا۔[۴]

---

[۱] ”اہل جنت سبز بچھونوں اور منقش خوبصورت چاندنیوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے۔“

[۲] تو کسی جان کو معلوم نہیں جو آنکھوں کی ٹھنڈک اس کے لیے چھپا رکھی گئی ہے۔

[۳] بیشک تمھارے پاس ایک رسول آئے جو تم میں سب سے نفیس تر اور اشرف وافضل ہیں۔

[۴] تو روح ہے اور پھول۔

(۴) **شاذ**: وہ قراءت ہے جس کی سند صحیح نہ ہو جیسے " مَلَكَ يَوْمَ الدِّيْنِ [۱]"صیغۂ ماضی اور لفظ یوم کے نصب کے ساتھ اور "اِيَّاكَ تُعْبَدُ [۲] "صیغۂ مجہول کے ساتھ۔ اس موضوع پر بھی کئی کتابیں تالیف ہوئیں۔

(۵) **موضوع**: جیسے خزاعی کی قراءتیں۔

پھر یہاں ایک چھٹی قسم بھی ہے جو اقسام حدیث میں سے "مُدرَج " کے مشابہ ہے۔ اور یہ وہ لفظ ہے جو قراءتوں میں بطور تفسیر بڑھا دیا جائے جیسے براویت سعید بن منصور، حضرت سعد بن ابی وقاص کی قراءت "وَلَهٗ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ مِّنْ أُمٍّ"[۳] میں "من أم" کی زیادتی برائے تفسیر ہے۔ اور بخاری کی تخریج کے مطابق حضرت عبداللہ بن عباس کی قراءت "لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِّنْ رَّبِّكُمْ فِيْ مَوَاسِمِ الْحَجِّ"[۴] میں "في مواسم الحج" کا اضافہ اور ابن زبیر کی قراءت "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَيَسْتَعِيْنُوْنَ بِاللّٰهِ عَلٰى مَا أَصَابَهُمْ" [۵] میں خط کشیدہ عبارت کا اضافہ محض تفسیر کے لیے ہے۔ مگر عمرو اس (خط کشیدہ عبارت) کے متعلق کہتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ ان کی قراءت تھی یا ان کی تفسیر۔ اس کی تخریج سعید بن منصور نے کی اور ابن الانباری نے بھی اس کی تخریج کی اور اس پر جزم کیا کہ یہ تفسیر ہے قراءت نہیں۔

ابن الانباری ہی نے حسن بصری سے تخریج کی کہ وہ "وَ إِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا وَالْوُرُوْدُ الدُّخُوْلُ" پڑھتے تھے۔ (مریم/۷۱)[۶]

ابن الانباری کہتے ہیں: حسن کے قول" الورود الدخول" میں لفظ دخول، ورود کے معنیٰ کی تفسیر ہے جسے بعض راویوں نے غلطی سے قرآن کے ساتھ لاحق کر دیا۔

## تنبیہات

تنبیہ اول: ایک پیچیدہ مسئلہ یہ منقول ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود، سورۂ فاتحہ اور معوذتین (قل أعوذ برب الفلق الخ اور قل أعوذ برب الناس الخ) کی قرآنیت کا انکار کرتے تھے۔ اور یہ غایت درجہ مشکل امر ہے۔ کیوں کہ اگر ہم یہ کہیں کہ عصر صحابہ میں ان سورتوں کے قرآن کا جز ہونے

---

[۱] وہ روز جزا کا مالک ہوا۔ [۲] تیری ہی عبادت کی جاتی ہے۔ [۳] اور ماں کی طرف سے اس کا بھائی ہو یا بہن۔

[۴] تمھارے اوپر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ حج کے مواقع پر اپنے رب کا فضل یعنی روزی طلب کرو۔

[۵] اور ضرور تم میں ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خیر کی دعوت دے، بھلائی کا حکم دے، برائی سے روکے اور اپنے اوپر آنے والی افتاد پر اللہ سے مدد چاہے۔

[۶] اور تم میں کوئی ایسا نہیں جس کا گذر دوزخ پر نہ ہو۔

کی نقل متواتر پائی گئی تھی تو حضرت ابن مسعود کا انکار موجبِ کفر ہوگا اور اگر ہم یہ کہیں کہ اس زمانے میں نقل متواتر نہیں پائی گئی تھی تو لازم آئے گا کہ قرآن اصل میں متواتر نہیں۔

امام فخر الدین رازی نے فرمایا: ظن اغلب یہ ہے کہ ابن مسعود سے انکار کی نقل باطل اور بے بنیاد ہے اور اسی جواب سے اس عقدۂ لاینحل سے گلوخلاصی ہوسکتی ہے۔

قاضی ابوبکر نے فرمایا: ابن مسعود سے ثابت نہیں کہ سورۂ فاتحہ اور معوذتین قرآن کا جز نہیں اور نہ یہ ان سے محفوظ ہی ہے۔ رہی یہ بات کہ انھوں نے ان کو اپنے مصحف سے کھرچ دیا اور ساقط کردیا تھا تو یہ محض ان کی کتابت کا انکار کرنے کی وجہ سے تھا نہ کہ ان کی قرآنیت کا منکر ہونے کی وجہ سے۔ کیوں کہ ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ مصحف میں صرف وہی لکھتے تھے جسے ثبت کرنے کا حکم نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دیا ہو اور انھوں نے حضور کو نہ تو انھیں لکھتے ہوئے پایا اور نہ حضور سے سنا کہ حضور نے انھیں لکھنے کا حکم دیا۔

امام نووی نے کہا: حضرت ابن مسعود سے جو قول منقول ہے وہ باطل اور نادرست ہے۔ لیکن علامہ ابن حجر نے حضرت ابن مسعود کے انکار کی روایات کو صحیح قرار دینے کے بعد فرمایا: جس نے یہ کہا کہ ''یہ قول ابن مسعود پر افترا ہے'' اس کا یہ قول مردود اور ناقابل قبول ہے کیوں کہ صحیح روایتوں میں بے سند طعن، غیر مقبول اور ناپسندیدہ ہے۔ بلکہ یہ روایتیں صحیح ہیں اور ان میں تاویل کا احتمال موجود ہے۔

ابن قتیبہ نے مشکل القرآن میں کہا کہ ابن مسعود کا یہ گمان کہ ''معوذتین قرآن نہیں'' اس لیے ہے کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا کہ وہ معوذتین سے حضرات حسنین کے لیے اللہ کے حفظ وامان کی دعا کررہے ہیں اس لیے وہ اپنے اس گمان پر قائم ہوگئے کہ یہ دونوں قرآن کی سورتیں نہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ اس بارے میں صحیح خیال پر ہیں اور مہاجرین وانصار غلطی پر۔

## تنبیہ دوم

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول ''اِنَّ الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ'' (قرآن سات حروف پر نازل ہوا) میں ''حرف'' بمعنی ''وجہ'' ہے جس سے مراد یہ ہے کہ قرآن اس توسیع کے ساتھ اس طرح نازل ہوا کہ لفظ واحد کی ادائیگی میں وجوہ اختلاف ان سات وجوہ سے تجاوز نہ کریں گی۔

## تنبیہ سوم

مکی نے کہا: جس نے یہ گمان کیا کہ قرا جیسے نافع اور عاصم وغیرہما کی قراءتیں ہی وہ سات حروف ہیں جن کا ذکر حدیث مذکورہ بالا میں ہے اس نے ایک زبردست غلطی کا ارتکاب کیا۔ کیوں کہ اس سے یہ لازم آئے گا کہ وہ قراءت، قرآن ہی نہ ہو جو ان قراے سبعہ کی قراءت سے خارج ہوا گرچہ

وہ ان کے علاوہ دوسرے ائمہ سے ثابت اور خطِ مصحف عثمانی کے موافق ہو۔اور یہ ایک عظیم غلطی ہے۔

ائمۂ قراءت میں، قرائے سبعہ سے زیادہ وہ حضرات ہیں جو ان سے بلند رتبہ یا ان کے ہم رتبہ ہیں۔اس کے باوجود صرف قرائے سبعہ پر اکتفا کرنے کا سبب یہ ہے کہ ائمۂ قراءت سے روایت کرنے والے لوگ پہلے بہت زیادہ ہوا کرتے۔مگر جب لوگوں کے اندر پست حوصلگی اور کم ہمتی پیدا ہوئی تو انھوں نے خط مصحف سے موافقت کرنے والی صرف انھیں قراءتوں پر انحصار کر لیا جن کا حفظ آسان ہو اور جن سے قراءت منضبط ہو جائے۔اس لیے انھوں نے ان قرا پر نظر ڈالی جو ثقاہت و امانت میں مشہور ہوں، قراءت سے وابستگی میں جن کی عمر کا لمبا حصہ گذرا ہو اور جن سے اخذ و تحصیل پر اہل علم کا اتفاق ہو۔چناں چہ انھوں نے ہر شہر کے ایک ایک امام قراءت کا انتخاب کر لیا۔لیکن اس کے باوجود انھوں نے ان قراءتوں کو نقل و روایت کرنا ترک نہیں کر دیا جنھیں ان سات قرا کے علاوہ دیگر ائمۂ قراءت نے اختیار کیا تھا اور نہ ہی ان کی قراءت ترک کی جیسے یعقوب، ابوجعفر، اور شیبہ وغیرہم کی قراءتیں۔

تمام قراءتوں میں سند کے اعتبار سے صحیح تر نافع و عاصم کی قراءت اور فصیح تر ابو عمرو اور کسائی کی قراءت ہے۔

معلوم ہو کہ قراءات سبعہ مشہورہ سے جو قراءتیں خارج ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں۔

**اول**: جو رسم مصحف کے مخالف ہو۔اور اس میں شک نہیں کہ نماز یا بیرون نماز اس کی قراءت (پڑھنا) جائز نہیں۔

**دوم**: جو رسم مصحف کی مخالف تو نہ ہو مگر اس کی قراءت مشہور نہ ہو بلکہ وہ کسی غریب نا قابل اعتماد طریق سے وارد ہو۔اس کی قراءت کا ممنوع ہونا بھی ظاہر ہے۔

ایک اور قسم وہ ہے جس کی قراءت جدید و قدیم ائمۂ قراءت کے نزدیک مشہور ہو۔نظر برآں کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کی قراءت کو ممنوع قرار دیں۔

قراءت یعقوب وغیرہ اسی قبیل سے ہے۔

## تنبیہ چہارم

کبھی قراءتوں کے ختلاف سے احکام میں بھی اختلاف پیدا ہوتا ہے۔اسی لیے فقہا کے نزدیک ملموس (جسے مس کیا گیا ہو) کا وضو ٹوٹنے یا نہ ٹوٹنے کا مبنیٰ "لَمَسْتُمْ" اور "لَامَسْتُمْ" میں قراءت کا اختلاف ہے۔اور ماہواری بند ہونے کے بعد غسل سے پہلے عورت سے جماع کے جواز یا عدم جواز کا مبنیٰ "یطھرن" کی قراءت کا ختلاف ہے۔(ایک قراءت میں "یَطْھُرْنَ" بے تشدید ہے۔اس کا معنیٰ "پاک ہوجائیں"۔خون منقطع ہونے سے عورت پاک ہوجاتی ہے تو اس سے قربت کا جواز ہونا

چاہیے۔ دوسری قراءت "یَطَّھَّرْنَ" ط اور ہ کی تشدید کے ساتھ ہے۔ اس کا معنیٰ "خوب خوب پاک ہوجائیں"۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ غسل بھی کرلیں تب قربت حلال ہو۔ اسی طرح "لمس" کا معنیٰ "چھونا" اور "ملامسة" کا معنیٰ "جماع"۔ اول "لَمَسْتُمُ النِسَاءَ" کا تقاضا یہ ہوگا کہ عورت کو چھونا بھی ناقض وضو ہو۔ دوم "لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ" کا تقاضا یہ ہوگا کہ جماع، ناقض وضو ہو۔ صرف چھونا ناقض وضو نہ ہو۔ (دونوں مسئلوں میں حنفیہ کا مذہب اور ان کی دلیل فقہ و اصول کی کتابوں میں دیکھیں۔ ۱۲، مترجم)

## تحصیل قرآن کی کیفیت

قرآن کے اکتساب و تحصیل کے دو طریقے ہیں: (۱) قراءت علی الشیخ یعنی شیخ کو پڑھ کر سنانا۔ (۲) شیخ کی زبان سے اس کے الفاظ سننا۔

قراءت علی الشیخ پر ہی سلف و خلف کا عمل رہا ہے۔ اور سماع من لفظ الشیخ کا بھی یہاں قول کیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ صحابۂ کرام نے قرآن کی تحصیل نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اسی طرح کی تھی۔ لیکن چوں کہ کسی قاری نے اخذ قرآن اس طرح نہیں کیا اس لیے طریقۂ تحصیل میں اس قسم کا ممنوع ہونا ظاہر و آشکار ہے۔ کیوں کہ یہاں مقصود کیفیت ادا ہے اور لفظ شیخ کو سننے والا ہر انسان اُسی کی طرح ادا پر قادر نہیں ہوسکتا۔ برخلاف حدیث کے کہ اس میں مقصود صرف معنیٰ یا لفظ ہوتا ہے۔ اس میں وہ ہیئتیں مقصود نہیں ہوتیں جو ادائے قرآن میں معتبر ہوتی ہیں۔ رہے صحابۂ کرام تو ان کی فصاحت اور پاکیزہ طبیعتیں اُسی طرح ادا پر اُن کے قادر ہونے کی متقاضی ہیں جس طرح انھوں نے قرآن کو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا۔ کیوں کہ وہ ان کی زبان میں اترا۔

قراءت علی الشیخ پر ایک دلیل "رسول اللہ کا ہر سال، ماہ رمضان میں جبریل کے سامنے دور کرنا یعنی اسے زبانی سنانا" ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ شیخ شمس الدین بن الجزری جب قاہرہ آئے اور ان کے پاس خلق خدا کی بھیڑ جمع ہوگئی تو سب کی قراءت کے لیے وقت کی گنجائش نہ ہونے کے باعث وہ خود ان کے سامنے ایک ایک آیت پڑھتے پھر لوگ اسے ایک ساتھ دہراتے۔ اس طرح انھوں نے صرف اپنی قراءت پر اکتفا نہیں فرمایا۔

قراءت علی الشیخ اس صورت میں بھی جائز ہے جب کوئی دوسرا شخص بھی شیخ کو قرآن پڑھ کر سنا رہا ہو مگر اس کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ پڑھنے والوں کا حال شیخ سے پوشیدہ نہ رہے۔

شیخ علم الدین سخاوی کے سامنے قرآن کے مختلف مقامات سے دو دو تین تین پڑھنے والے

قراءت کرتے اور وہ ہر ایک کو جواب بھی دیتے۔

اِسی طرح اگر شیخ کسی دوسرے کام مثلاً لکھنے یا مطالعہ کرنے میں مصروف ہو تو بھی قرآن سننے اور سنانے کا کام جاری رہ سکتا ہے۔

رہی بات حفظ سے قراءت کرنے کی تو ظاہر یہی ہے کہ یہ شرط نہیں ہے۔ بلکہ اگر صرف مصحف سے قراءت ہو تو بھی کافی ہے۔

## قراءت کی کیفیت

قراءت کی تین کیفیات ہیں (۱) تحقیق (۲) حدر (۳) تدویر

**تحقیق**: یعنی ہر حرف کو اس کا حق دینا جیسے: مد کا اشباع، ہمزہ کی تحقیق، اتمام حرکات، اظہار، تشدیدات پر اعتماد، حروف کو واضح اور جدا جدا ادا کرنا، ایک حرف کو دوسرے سے سکتہ، ترتیل اور ٹھہراؤ کے ذریعہ ممتاز کرنا اور جائز وقفوں کی رعایت کرنا کہ نہ تو قصر یعنی خلاف مد ہو، نہ اختلاس یعنی خلاف اشباع ہو، نہ کسی حرف متحرک کا اسکان یا ادغام ہو۔ اور یہ کمال، زبانی مشق اور الفاظ کو صحیح اور درست کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

علم قراءت کے متعلموں کے لیے اس کی پابندی مستحب ہے۔ مگر اس میں حد افراط تک تجاوز نہ کریں کہ حرکات سے حروف پیدا کر دیں، ایک "ر" کو کئی "ر" بنا دیں، ساکن حروف کو متحرک کر دیں اور غنوں میں مبالغہ کر کے کئی نون کی آواز پیدا کر دیں جیسا کہ امام حمزہ نے ایک شخص کو اس میں مبالغہ کرتے ہوئے سنا تو فرمایا: کیا تمھیں معلوم نہیں کہ بیاض کی حد سے بڑھے تو "بَرَص" ہو جاتا ہے اور گھنگھریالے پن سے بڑھے تو "قَطَطُ" ہو جاتا ہے۔ اور جو حد قراءت سے زیادہ ہو وہ قراءت نہیں۔ (بالوں میں "جُعُودَة" یعنی گھنگھریالا ہونا تو حسن ہے مگر قطط یعنی بہت سکڑا ہوا ہونا عیب ہے۔ ۱۲، مترجم)

**حدر**: (حا کے فتحے اور دال کے سکون کے ساتھ) یعنی سبک روی اور تیز رفتاری سے قراءت کرنا، اور ایسی تخفیف کرنا جو روایت کی رو سے ثابت و صحیح ہو۔ جیسے قصر، تسکین، اختلاس، بدل، ادغام کبیر، تخفیف ہمزہ وغیرہ۔ ساتھ ہی تصحیح اعراب و الفاظ کی رعایت کرنا، حروف کو قرار اور جماؤ کے ساتھ ادا کرنا۔ اس طرح کہ حروف مد کو پورا ادا کرنے سے پہلے ہی نہ کاٹ دیا جائے، نہ اکثر حرکتوں کا اختلاس ہو، نہ غُنّہ کی آواز زائل ہو اور نہ اس حد تک تفریط و کمی ہو کہ اس کے باعث قراءت صحیح و درست نہ رہ جائے۔

**تدویر**: دونوں قسموں تحقیق اور حدر کے بیچ کی حالت کو اختیار کرنا۔

یہی ان اکثر ائمہ سے منقول ہے جنھوں نے منفصل کا مد کیا اور اس میں اشباع نہیں کیا۔ اور

یہی باقی قرا کا مذہب اور اکثر اہل ادا کے نزدیک مختار و پسندیدہ ہے۔

تجوید قرآن ایک اہم امر ہے۔ اسی لیے اس پر ایک بہت بڑی جماعت علما نے مستقل تصنیفی کام کیا ہے۔ جیسے امام دانی وغیرہ۔

حضرت عبداللہ بن مسعود سے بسند مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: "جَوِّدُوا الْقُرْاٰنَ" "قرآن، تجوید کے ساتھ پڑھو"۔

قرا نے کہا: تجوید، قراءت کا زیور ہے۔

**تجوید**: حروف کو ان کے حقوق دینا، ان کی ترتیب کی رعایت کرنا۔ حرف کو اس کے مخرج اور اس کی اصل کی طرف پھیرنا، حرف کو اس کی کامل ہیئت کے ساتھ نرمی سے زبان پر اس طرح لانا کہ نہ حد سے کسی طرح کا تجاوز ہو، نہ کوئی تکلف ہو، نہ کوئی افراط ہو اور نہ کوئی تصنع ہو۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَّقرَأَ الْقُرْاٰنَ غَضًّا كَمَا أُنْزِ لَ فَلْيَقْرَأْهُ عَلَىٰ قِرَاءَ ةِ ابْنِ أُمِّ عَبْدٍ" "جو یہ پسند کرے کہ قرآن اُسی طرح تر و تازہ پڑھے جس طرح وہ نازل ہوا تو وہ ابن ام عبد یعنی عبداللہ بن مسعود کی قراءت کے مطابق پڑھے"۔

بلاشبہہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تجوید قرآن سے حظ وافر عطا ہوا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ امت جس طرح معانی قرآن کو سمجھنے اور اس کے احکام و حدود کو قائم کرنے کی مکلّف ہے اِسی طرح وہ اس بات کی بھی مکلّف ہے کہ قرآن کے الفاظ و حروف کو ٹھیک ٹھیک اسی صفت پر ادا کرے جو ائمۂ قراءت سے ماخوذ ہے اور جس کا سلسلہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک متصل ہے۔ اسی لیے قراءت بلا تجوید کو علما نے لَحن و خطا قرار دیا ہے۔

## قراءتوں کو الگ الگ اور یکجا اخذ کرنے کی کیفیت

پانچ سو سال تک سلَف کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ہر ایک ختم قرآن کو صرف ایک روایت کے ساتھ اخذ کرتے۔ اور کسی بھی روایت کو دوسری روایتوں کے ساتھ جمع نہ کرتے ۔ پھر ایک بار کے ختم میں ہی قراءتوں کو جمع کرنے کا طریقہ ظہور پذیر ہوا اور اسی پر سب کا با قاعدہ عمل بھی ہو گیا۔ لیکن سلف اُسی شخص کو اس کی اجازت دیتے تھے جو قراءتوں کو الگ الگ حاصل کرے، ان کے طرق کا اسے بخوبی علم ہو۔ اور اس نے ہر قاری کے ختم کو الگ الگ پڑھا ہو۔ بلکہ اگر کسی شیخ کی چند روایتیں ہوں تو وہ ہر راوی کا ایک ختم پڑھاتے، پھر اس کے لئے جمع قراءت کراتے۔

پھر کچھ لوگوں نے سہولت و آسانی کے پیش نظر اس بات کی اجازت دے دی کہ طالب علم امام نافع اور امام حمزہ کے علاوہ قراے سبعہ میں سے ہر قاری کی قراءت کو ایک ختم میں جمع کر کے پڑھ

سکتا ہے۔ پھر قراءت امام نافع کے لیے یہ لوگ قالون، پھر ورش، پھر قراءت امام حمزہ کے لئے خَلَف پھر خلّاد، ہر ایک کے ایک ایک ختم کی تحصیل کراتے۔ اس کے بعد ہی کسی کو جمع کی اجازت دی جاتی۔ ہاں جب کسی ایسے شخص کو دیکھتے جس نے کسی شیخ معتبر کو انفرادی اور اجتماعی طور پر قراءتیں پڑھ کر سنادی ہیں اور شیخ کی جانب سے اسے اجازت بھی مل گئی ہے اور وہ اہل بھی ہو گیا ہے اور اب وہ ایک ختم میں تمام قراءتیں جمع کرنا چاہتا ہے تو وہ اس پر اِفراد کو لازم نہیں قرار دیتے تھے۔ کیوں کہ انھیں معلوم ہوتا کہ وہ حد معرفت ومہارت اور درجۂ کمال تک رسائی حاصل کر چکا ہے۔ پھر جمع کی بابت ان کے دو مذاہب ہیں:

(۱) جمع بالحروف: یعنی قراءت شروع کر کے جب ایسے کلمہ سے گذرے جس میں کوئی اختلاف ہو تو تنہا اس کلمے کا اعادہ کر کے ان تمام اختلافات کا استیعاب کرے جو اس کلمہ میں پائے جائیں۔ پھر اگر وقف مناسب ہو تو اس پر وقف کرے۔ ورنہ کسی دوسری وجہ سے اس کا وصل کرے یہاں تک کہ وقف تک پہنچ جائے۔ لیکن اگر اختلاف، مثلاً مدِّ منفصل، دو کلموں سے متعلق ہو تو دوسرے کلمہ پر وقف کر کے خلاف کا استیعاب کرے۔ پھر اس کے مابعد کی طرف منتقل ہو۔ یہ مذہب، قرائے مصر کا ہے۔

(۲) جمع بالوقف: یعنی جس قاری کو اس نے مقدم کیا ہے اُس کی قراءت سے ابتدا کر کے وقف تک پہنچے، پھر اس کے بعد کے قاری کی طرف مراجعت کر کے اسی وقف تک پہنچے، پھر اس کے بعد کے قاری کی طرف عَود کر کے اسی وقف تک پہنچے اور ایسا ہی کرتا جائے یہاں تک کہ تمام قراءتوں سے فارغ ہو جائے۔ یہ قرائے شام کا مذہب ہے۔ اس مذہب میں پہلے مذہب کے مقابلے میں زیادہ استحضار اور زیادہ طویل زمانہ درکار ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا مقام پہلے سے بہتر ہے۔

ابوالحسن علی بن عمر قبجاطی (م ۷۲۳ھ) نے اپنے قصیدے اور اس کی شرح میں جامع قراءات کے لیے سات شرطیں ذکر کی ہیں جن کا حاصل ان پانچ شرطوں میں آجاتا ہے۔

(۱) حسنِ وقف (۲) حسن ابتدا (۳) حسن ادا (۴) عدم ترکیب

لہٰذا جب ایک قاری کی قراءت شروع کرے تو دوسرے کی قراءت کی طرف اسی وقت منتقل ہو جب پہلے کی قراءت مکمل کر لے۔

(۵) قراءت میں ترتیب کی رعایت اور اُسی قراءت سے ابتدا کرنے کا لحاظ جس سے مؤلفین نے اپنی کتابوں میں ابتدا کی ہے۔ لہٰذا ابن کثیر سے پہلے نافع کی قراءت اور ورش سے پہلے قالون کی قراءت سے ابتدا کرے۔

امام ابن جزری نے کہا: صحیح یہ ہے کہ یہ شرط نہیں بلکہ مستحب ہے۔

حالت اخذ وتحصیل میں قراءت کی مقدار کیا ہو؟ اس بارے میں صدر اول کے قرا کا حال یہ تھا کہ وہ دس آیتوں سے زیادہ قراءت نہ کراتے خواہ کوئی بھی ہو۔ لیکن بعد کے قرا نے تحصیل قراءت کرنے والے کی قوت وصلاحیت کے لحاظ سے فرق کرنے کو مناسب سمجھا۔

## فائدہ

ابن خیر نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا کہ کسی کو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی کوئی حدیث نقل کرنا روا نہیں جب تک وہ کسی شیخ سے اس حدیث کا راوی نہ ہو یا کم از کم اتنا ہی ہو کہ شیخ نے اسے اپنی حدیث روایت کرنے کی اجازت ہی دے دی ہو۔ اس کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآن کا حکم بھی ایسا ہی ہوگا کہ کسی کے لیے کوئی آیت نقل کرنا یا اس کی قراءت کرنا روا نہ ہو جب تک کسی شیخ کو وہ آیت پڑھ کر سنا نہ دے؟

امام سیوطی نے فرمایا: میں نے اس بارے میں کسی سے کوئی حکم منقول نہ پایا۔ قرآن کے لئے مذکورہ بالا شرط رکھنے کی بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے اور نہ رکھنے کی بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ شرط رکھنا اس لحاظ سے کہ الفاظ قرآن کی ادائیگی میں الفاظ حدیث کی ادائیگی سے زیادہ سخت احتیاط ہے۔ اور شرط نہ رکھنا اس لحاظ سے کہ حدیث کے لیے وہ شرط اس لیے رکھی گئی کہ حدیث میں غیر حدیث کو شامل کرنے یا نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف غلط طور پر کوئی کلام منسوب کرنے کا اندیشہ ہے۔ اور قرآن کے بارے میں یہ اندیشہ نہیں۔ اس لیے کہ قرآن بحفظ الٰہی محفوظ ہے۔ ہر دور میں اس کے سیکھنے سکھانے کا سلسلہ برابر جاری ہے اور اس میں آسانی رکھی گئی ہے۔ اس لیے قرآن کے لیے شرط مذکور نہ ہونا یہی صورت ظاہر وواضح ہے۔

## دوسرا فائدہ

علم قراءت پڑھانے اور اس کا فائدہ دوسروں تک پہنچانے کے جواز میں شیخ کی اجازت شرط نہیں بلکہ جسے ذاتی طور پر اپنی اہلیت وقابلیت کا علم ویقین ہو اس کے لیے ایسا کرنا جائز ہے۔ اگرچہ کسی شیخ نے اسے اجازت نہ دی ہو۔ اسی طریقے پر سلف اولین اور آغاز اسلام کے زمانے کے لوگ گامزن تھے۔ یہی بات ہر علم میں اور قراءت کی تعلیم دینے اور فتویٰ صادر کرنے میں بھی ہے۔ برخلاف ان جاہلوں کے جو اجازت شیخ کے شرط ہونے کا وہم کر بیٹھے۔

لوگوں نے اجازت شیخ کا دستور اس لیے قائم کیا کہ کسی شخص کی اہلیت سے غالباً وہ مبتدی طلبہ اور ان جیسے دوسرے لوگ واقف نہیں ہوتے جو اس سے اخذ وتحصیل کرنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ اس کی

اہلیت کا پتہ لگانے سے قاصر ہوتے ہیں۔ جب کہ اخذ سے پہلے اہلیت کی تحقیق اور چھان بین شرط ہے۔ نظر برآں شیخ کی اجازت گویا مُجاز کے اہل ہونے کی شہادت ہے۔

## قراءت قرآن زیادہ کرنے کا استحباب

قرآن کی قراءت وتلاوت میں زیادتی مستحب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے خوگر مسلمان کی مدح وثنا کرتے ہوئے فرمایا: "یَتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّیْلِ" (اٰل عمران/۱۱۳) "وہ رات کی ساعتوں میں اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں۔"

صحیحین میں حدیث ابن عمر ہے: "لَا حَسَدَ اِلَّا فِی اثْنَتَیْنِ: رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْقُرْاٰنَ فَهُوَ یَقُوْمُ بِهٖ اٰنَاءَ اللَّیْلِ وَاٰنَاءَ النَّهَارِ" "اگر حسد کرنا جائز ہوتا تو صرف دو شخصوں پر جائز ہوتا۔ ایک وہ جسے اللہ نے قرآن سے نوازا اس لیے وہ روز وشب کی ساعتوں میں اسے پڑھتا رہتا ہے۔"

ترمذی نے یہ حدیثِ ابنِ مسعود، روایت کی: "مَنْ قَرَاَ حَرْفاً مِّنْ کِتَابِ اللّٰهِ فَلَهٗ بِهٖ حَسَنَةٌ، وَّالْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا" "جو کتاب الٰہی کا ایک حرف پڑھتا ہے اُسے اس کے عوض ایک نیکی ملتی ہے۔ اور ایک نیکی کا ثواب اس کا دس مثل (اس کا دس گنا) ہوتا ہے۔"

ترمذی نے ہی حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے حدیثِ ابی سعید خدری روایت کیا: "یَقُوْلُ الرَّبُّ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالیٰ مَنْ شَغَلَهُ الْقُرْاٰنُ وَ ذِکْرِیْ عَنْ مَسْئَلَتِیْ اَعْطَیْتُهٗ اَفْضَلَ مَا اُعْطِی السَّائِلِیْنَ، وَفَضْلُ کَلَامِ اللّٰهِ عَلیٰ سَائِرِ الْکَلَامِ کَفَضْلِ اللّٰهِ عَلیٰ سَائِرِ خَلْقِهٖ" "رب پاک وبرتر فرماتا ہے: جو قرآن اور میرے ذکر میں مشغولیت کے باعث مجھ سے سوال نہ کر پائے اس کو اس سے افضل وبہتر عطا کروں گا جو دست سوال دراز کرنے والوں کو عطا کرتا ہوں اور کلام الٰہی کی فضیلت وبرتری باقی کلاموں پر اسی طرح ہے جیسے اللہ کو اس کی تمام مخلوق پر برتری ہے۔"

مسلم نے حدیث ابو امامہ روایت کی: "اِقْرَءُوا الْقُرْاٰنَ فَاِنَّهٗ یَاْتِیْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ شَفِیْعاً لِاَصْحَابِهٖ" "قرآن پڑھا کرو کیوں کہ وہ قیامت کے دن اپنے اصحاب کا سفارشی بن کر آئے گا۔"

بیہقی نے یہ حدیثِ عائشہ تخریج کی: "اَلْبَیْتُ الَّذِیْ یُقْرَاُ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ یَتَرَاءَیٰ لِاَهْلِ السَّمَاءِ کَمَا تَتَرَاءَی النُّجُوْمُ لِاَهْلِ الْاَرْضِ" "جس گھر میں قرآن پڑھا جاتا ہے وہ اہل سما کو اسی طرح نظر آتا ہے جیسے اہل زمین کو آسمان کے ستارے نظر آتے ہیں۔"

بیہقی نے یہ حدیثِ انس بھی تخریج کی: "نَوِّرُوْا مَنَازِلَکُمْ بِالصَّلٰوةِ وَ تِلَاوَةِ الْقُرْاٰنِ" "اپنے گھروں کو نماز اور تلاوت قرآن سے روشن وتاباں کرو۔"

یہی امام بیہقی ،نعمان بن بشیر کی یہ حدیث روایت کرتے ہیں :"أَفْضَل عِبَادَةِ أُمَّتِی قِرَاءَ ةَ الْقُرانِ" ''میری امت کی سب سے زیادہ فضیلت والی عبادت ،تلاوت قرآن ہے۔''

انہی نے اِس حدیث سمرہ بن جندب کی بھی تخریج کی:"کُلُّ مُؤْ دِبٍ یُّحِبُّ أَنْ تُؤْ تَیٰ مَأْدُبَتُہٗ، وَمَاْ دُبَۃُ اللّٰہِ الْقُرْاٰنُ فَلَا تَھْجُرُوْہُ" ''ہر دعوت دینے والا پسند کرتا ہے کہ لوگ اس کے خوانِ ضیافت پر حاضر ہوں اور خدا کا خوانِ ضیافت قرآن ہے اس لیے اسے نہ چھوڑو۔''

## مقدارِ قراءت میں سلف کی عادتیں

مقدارِ قراءت میں سلف کی عادتیں مختلف تھیں۔ چناں چہ بعض کے بارے میں منقول ہے کہ وہ ایک دن اور رات میں تین بار، بعض دو بار اور بعض ایک بار ختمِ قرآن کرتے۔ اس سلسلے میں اور بھی اقوال کتابوں میں مذکور ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس کی مذمت فرمائی۔ ابنِ ابی داؤد نے مسلم بن مخراق سے تخریج کی۔ انھوں نے کہا میں نے حضرت عائشہ سے کہا کہ کچھ لوگ ایک رات میں دو تین بار پورا قرآن پڑھتے ہیں۔ اس پر حضرت عائشہ نے فرمایا: انھوں نے پڑھا اور حقیقت میں نہیں پڑھا۔ لیکن میرا حال یہ تھا کہ میں چودہویں رات میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ کھڑی ہوتی تو آپ بقرہ، آل عمران اور نساء کی تلاوت فرماتے۔ دوران تلاوت جب کسی بھی ایسی آیت سے گذرتے جس میں خوشی ہوتی تو دعا فرماتے اور اس کا شوق ظاہر فرماتے اور جب ایسی آیت سے گذرتے جس میں کسی چیز سے ڈرایا گیا ہو تو بھی دعا فرماتے اور اس سے اللہ کی پناہ مانگتے۔

ان کے بعد وہ لوگ ہیں جو دو راتوں میں ختم قرآن کرتے اور ان کے بعد وہ ہیں جو تین راتوں میں ختم کرتے۔ اور یہ اچھا ہے۔

علما کی کئی جماعتوں نے اِس سے کم وقت میں ختم قرآن کو مکروہ قرار دیا ہے۔ کیوں کہ ابوداؤد اور بافادۂ تصحیح ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عمر کی یہ حدیثِ مرفوع روایت کی ''جو تین راتوں سے کم میں قرآن ختم کرے وہ فہم قرآن سے محروم رہے گا''۔

ابن ابی داؤد اور سعید بن منصور نے حضرت ابن مسعود سے موقوفاً روایت کی ،انھوں نے کہا: ''پورا قرآن تین راتوں سے کم میں مت پڑھو''۔

امام احمد اور ابوعبید نے حضرت سعید بن منذر سے روایت کی ،وہ کہتے ہیں میں نے عرض کی: یارسول اللہ! پورا قرآن تین راتوں میں پڑھوں؟ فرمایا: ہاں اگر تم سے ہو سکے تو پڑھو۔ (حضرت سعید

بن منذر سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے )

اِن کے بعد وہ لوگ ہیں جنھوں نے چار، پھر جنھوں نے پانچ، پھر جنھوں نے چھ، پھر جنھوں نے سات راتوں میں ختم قرآن کیا۔ یہی آخری معمول، راہِ اعتدال اور طریقۂ خوب تر ہے۔ اور اسی پر زیادہ تر صحابۂ کرام وغیرہم قائم تھے۔

شیخین نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے تخریج کی۔ انھوں نے کہا: مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن ایک مہینہ میں پڑھ۔ میں نے کہا میں اپنے اندر اس سے کم مدت میں پڑھنے کی قدرت رکھتا ہوں۔ فرمایا: دس دن میں پڑھ۔ میں نے پھر عرض کی۔ میں اس سے بھی کم مدت میں پڑھ سکتا ہوں۔ فرمایا: سات دنوں میں پڑھ اور اس پر اضافہ مت کر یعنی سات دنوں سے کم میں مت پڑھ۔

ابوعبید وغیرہ نے بطریق واسع بن حبان، حضرت قیس بن ابی صعصعہ سے روایت کی انھوں نے کہا: یارسول اللہ! میں قرآن کتنی مدت میں ختم کروں؟ فرمایا: پندرہ دن میں۔ میں نے عرض کی: میں اس سے زیادہ کی قوت رکھتا ہوں۔ فرمایا: ایک جمعہ (ایک ہفتہ) میں ختم کرو۔

ان کے بعد وہ لوگ ہیں جنھوں نے آٹھ راتوں میں، پھر وہ لوگ ہیں جنھوں نے دس راتوں میں، پھر وہ لوگ ہیں جنھوں نے ایک مہینے میں، پھر وہ ہیں جنھوں نے دو مہینوں میں ختم قرآن کیا۔

ابن ابی داؤد نے مکحول سے روایت کی انھوں نے کہا: اصحاب رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں قدرت رکھنے والے لوگ سات راتوں میں، بعض ایک مہینے میں، بعض دو مہینوں میں اور بعض اس سے بھی زیادہ مدت میں پورا قرآن پڑھتے۔

فقیہ ابواللیث نے بستان میں فرمایا: قرآن پڑھنے والے کو سال میں دو بار ختم کرنا چاہیے۔ اگر اس سے زیادہ کی قدرت نہ ہو۔

امام حسن بن زیاد نے امام ابوحنیفہ سے روایت کی کہ امام نے فرمایا: جو ہر سال دو بار قرآن پڑھ لے اس نے اس کا حق ادا کر دیا۔ یہ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اِس دارِ فانی سے کوچ کرنے کے سال دو بار حضرت جبریل کو زبانی قرآن سنایا تھا۔

امام نووی نے اذکار میں فرمایا: مختار یہ ہے کہ یہ اشخاص کے اعتبار سے مختلف ہوگا۔ اس لیے جس کے ذہن میں فکرِ دقیق سے لطائف ومعانی قرآن منکشف ہوں وہ اتنی ہی مقدار کی تلاوت پر اکتفا کرے جس سے پڑھی ہوئی مقدار کا فہم کامل اسے میسر آجائے۔ اسی طرح جو شخص اشاعت علم یا فیصلۂ نزاعات یا اہم دینی خدمات اور رفاہِ عام کے کاموں میں مصروف رہتا ہو وہ اتنی ہی مقدار کی

تلاوت کرے جس سے اس کی مصروفیت کے کاموں میں نہ کوئی خلل واقع ہو اور نہ پورے طور پر انجام دہی سے وہ کام محروم رہ جائیں۔ ہاں اگر وہ ان مذکورہ اشخاص کے زمرے میں شامل نہ ہو تو مقدور بھر تلاوت کی کثرت کر سکتا ہے۔ مگر اس میں یہ شرط ہے کہ زیادتی تلاوت اس حد تک نہ ہو کہ اس سے دل برداشتگی اور اکتاہٹ پیدا ہو جائے یا اتنی تیز رفتاری سے تلاوت ہو کہ معانی قرآن میں تدبُّر کی نعمت سے محروم رہ جائے۔

## تلاوت قرآن کے آداب

تِلاوتِ قرآن کے لئے باوضو ہونا مستحب ہے۔ اس لیے کہ قرآن تمام ذکروں میں سب سے افضل ذکر ہے۔ اور حدیث شریف میں ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بے طہارت، ذکرِ الٰہی کو ناپسند فرماتے تھے۔

تلاوت، صاف ستھری جگہ مسنون ہے اور سب سے اچھی جگہ مسجد ہے۔

کچھ علما نے غسل خانے اور راستے میں تلاوت کرنے کو مکروہ قرار دیا ہے۔

مستحب ہے کہ قبلہ رخ، سکون و وقار کے ساتھ، خاکساری و فروتنی کرتے ہوئے سر جھکا کر بیٹھے۔

مسنون ہے کہ قرآن کی تعظیم اور منہ کو پاک صاف کرنے کے مقصد سے مسواک کر لے۔

ابنِ ماجہ نے حضرت علی سے موقوفاً اور بزّار نے انھیں سے بسندِ جیّد مرفوعاً روایت کی "تمھارے منہ قرآن کے راستے ہیں۔ اِس لئے انھیں مسواک سے صاف کر لیا کرو"۔

قراءت سے پہلے "أعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم" کہہ لینا مستحب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُراٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِن الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" (النحل/۹۸) "جب تو قرآن پڑھنے کا ارادہ کرے تو شیطان لعین سے اللہ کی پناہ طلب کر۔"

امام نووی نے فرمایا: تعوُّذ کا پسندیدہ صیغہ "أعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم" ہے۔

سلَف کی ایک جماعت اس کے ساتھ "السميعِ العليم" کا اضافہ کر کے اِسے اس طرح پڑھتی تھی۔ "أعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰن الرَّجِيْمِ"۔

حمید بن قیس سے "أَعُوذُ بِاللّٰهِ القَادِرِ مِنَ الشيطٰنِ الغَادِرِ" مروی ہے۔ "میں عہد شکن اور وعدہ خلاف شیطان سے قدرت والے اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں۔"

ابو السَّمَّال سے "أَعُوذُ بِاللّٰهِ القَوِيِّ مِنَ الشيطٰنِ الغَوِيِّ" مروی ہے۔ "میں گمراہ شیطان

سے قوت وتوانائی والے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔"

ایک جماعت سے "أعوذ بالله العَظِيم مِنَ الشيطٰنِ الرَّجِيم" مروی ہے۔"میں شیطان لعین سے بڑی عظمت والے رب کی پناہ طلب کرتا ہوں۔"

کچھ اور لوگوں سے "أعوذ با لله من الشيطٰن ا لرجيم اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيم" مروی ہے۔"میں دھتکارے ہوئے شیطان سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ بیشک اللہ ہی بڑا سننے والا اور بے انتہا علم والا ہے"

اِن کے علاوہ کچھ اور الفاظ بھی مروی ہیں۔

حلوانی نے اپنی جامع میں کہا: تعوذ کی کوئی حد اور اس کا کوئی منتہیٰ نہیں ہے۔اس لیے جو چاہے زیادتی کرے اور جو چاہے کمی کرے۔

سورۂ براءت کے علاوہ ہر سورہ کے شروع میں ہمیشہ بسم الله الرحمٰن الرحیم پڑھے۔اس لیے کہ اکثر علما کے نزدیک یہ بسم اللہ قرآن کی ایک آیت ہے۔اس لیے اسے چھوڑنے کی صورت میں اکثریت کے نزدیک ختم قرآن میں ایک آیت کا تارک ہوجائے گا۔

اگر درمیان سورہ سے پڑھے تو بھی حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تصریح کی رو سے اس کے لیے بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے۔

تلاوت قرآن میں ترتیل مسنون ہے۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔"وَرَتِّلِ الْقُرانَ تَرْتِيلًا"(المزمل/٤) "قرآن کو خوب ترتیل کے ساتھ پڑھو۔"

ابوداؤد وغیرہ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کی کہ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قراءت کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا: وہ ایسی قراءت تھی جو ہر ہر حرف کو واضح کردیتی تھی۔

بخاری میں حضرت انس سے مروی ہے کہ ان سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قراءت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا: حضور کی قراءت ، مد تھی۔پھر انھوں نے بسم الله الرحمٰن الرحیم کو اللہ،الرحمن اور الرحیم کے مد کے ساتھ پڑھا۔

صحیحین میں حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ان سے کہا: میں ایک رکعت میں پوری مُفَصَّل پڑھتا ہوں۔اِس پر آپ نے فرمایا: تو نے تو اشعار کے تیزی کے ساتھ پڑھنے کی طرح قرآن کو بھی پڑھا۔بلاشبہہ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو قرآن پڑھتے تو ہیں مگر وہ ان کی ہنسلی کی ہڈیوں سے آگے نہیں بڑھتا۔حالاں کہ قرآن اُسی وقت مفید ہوگا جب وہ دل میں اتر کر اس میں راسخ

اور مستحکم ہو جائے۔

آجری نے "حملة القرآن" میں حضرت ابن مسعود سے روایت کی۔ انھوں نے کہا: تم قرآن کو اِس طرح نہ بکھیرو جس طرح ردّی اور گھٹیا کھجوریں بکھیری جاتی ہیں اور نہ اسے اتنی تیزی سے پڑھو جیسے اشعار تیزی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ اس کے عجائب کے پاس ٹھہرو، اس سے دلوں میں حرکت پیدا کرو اور تم میں سے کسی کو بھی صرف یہ فکر نہ ہو کہ آخر سورہ تک پہنچ جائے۔

آجری نے ہی حضرت ا بنِ عمر سے مرفوعاً روایت کی: قیامت میں صاحب قرآن سے کہا جائے گا قرآن پڑھ اور زینۂ بہشت کے پایوں پر چڑھ اور اسی خوبی وعمدگی کے ساتھ تلاوت کر جیسی دنیا میں کرتا تھا کہ تیرا درجہ اس آخری آیت کے پاس ہے جس کی تو قراءت کرتا تھا۔

شرح مہذب میں ہے: تمام علما اس پر متفق ہیں کہ قرآن کو حد سے زیادہ تیز پڑھنا مکروہ ہے۔ علما نے یہ بھی فرمایا کہ ترتیل کے ساتھ ایک پارے کی تلاوت اتنی ہی مدت میں دو پاروں کی بے ترتیل تلاوت سے افضل ہے۔ مزید فرماتے ہیں: ترتیل کا استحباب، قرآن میں تدبر کے لیے ہے۔ اس لیے کہ یہ قرآن کی تعظیم وتوقیر سے قریب تر اور دل میں زیادہ اثر انگیز ہے۔

## اس میں اختلاف ہے کہ ترتیل اور قلتِ تلاوت افضل ہے یا سرعت اور کثرتِ تلاوت؟

ہمارے بعض ائمہ نے کیا اچھی بات ارشاد فرمائی کہ ترتیل والی قراءت کا ثواب قدر و مرتبہ کے لحاظ سے زیادہ جلیل ہے۔ اور زیادہ مقدار والی قراءت کا ثواب کمیت اور تعداد کے لحاظ سے زیادہ کثیر ہے۔ کیوں کہ ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں ہیں۔

علامہ زرکشی کی کتاب "برہان" میں ہے: کامل ترتیل یہ ہے کہ اس میں اَلفاظِ قرآن کی تفخیم اور اس کے تمام حروف کی واضح طور سے ادا کے ساتھ ایک حرف کا دوسرے حرف میں اِدغام نہ ہو۔ لیکن یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ترتیل کا ادنیٰ درجہ ہے۔ کامل تر درجہ یہ ہے کہ قرآن کو اس کے مَنازِل کے مُوافق اس طرح پڑھے کہ اگر کسی ایسے لفظ پر آئے جس میں تہدید یعنی وعیدِ عذاب ہو تو اُسے اس طرح زبان سے نکالے جس طرح تہدید کے الفاظ نکالے جاتے ہیں اور اگر عظمت پر دلالت کرنے والے کسی لفظ کو ادا کرے تو اس طرح ادا کرے جیسے تعظیم کا انداز ہوتا ہے۔

غور وفکر کے ساتھ سمجھ کر قرآن کی تلاوت مسنون ہے۔ کیوں کہ یہی سب سے بڑا مقصود اور سب سے اہم مطلوب ہے۔ اسی سے انشراحِ صدر حاصل ہوتا اور تاریک دل روشن ہوتے

ہیں۔ارشادِ خداوندی ہے: " کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْا اٰیٰتِهٖ " (ص/ ۲۹) "ہم نے تمھاری جانب ایک بابرکت کتاب اتاری تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں تدبر کریں۔" دوسرے مقام پرارشاد ہے: " اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ "(النساء/ ۸۲) " تو کیا وہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔"

تدبر کی صفت یہ ہے کہ تلاوت کرنے والا جو لفظ ادا کر رہا ہے اُس کے معنیٰ کے اندر غور کرنے میں اپنے دل کو لگائے۔تاکہ ہر آیت کے معنیٰ سے آشنا ہو،اوامر ونواہی میں تأمل کرے اوراس تدبر و تأمل کی قبولیت کا عقیدہ رکھے۔پھر اگر ماضی میں اس کے تعلق سے کوتاہی اور بےتوجہی ہوئی ہو تو بارگاہ خداوندی میں قبول عذر کی درخواست پیش کرے اوراس فروگذاشت کی معافی کا خواستگار ہو۔جب آیتِ رحمت سے گذرے تو خوش ہو اور سوال کرے،آیت عذاب سے گذرے تو سہم جائے اور پناہ طلب کرے،آیت تنزیہ سے گذرے تو اللہ کی پاکی وعظمت کا اظہار کرے اور آیت دعا سے گذرے تو گڑگڑا کر اپنی حاجت طلب کرے۔

امام مسلم نے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی۔وہ کہتے ہیں: میں نے ایک رات رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی،حضور نے سورۂ بقرہ شروع کی اور پوری پڑھی، پھر آل عمران شروع فرمائی اور پوری پڑھی،پھر سورۂ نساء شروع کی اور پوری پڑھی۔حضور اطمینان سے بغیر جلد بازی کے قراءت فرماتے۔اس دوران آپ جب کسی ایسی آیت سے گذرتے جس میں تسبیح ہوتی تو تسبیح کرتے،آیت سوال سے گذرتے تو سوال کرتے اور جب آیت تعوذ سے گذرتے تو اللہ کی پناہ مانگتے۔

تدبر قرآن یہ بھی ہے کہ جب قرآن تقاضا کرے تو اس کی پکار پر لبیک کہے۔اِسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضور نے ارشاد فرمایا: جو سورۂ "وَالتِّینِ وَالزَّیْتُوْنِ" آخر تک پڑھے وہ کہے کیوں نہیں میں اس پر گواہ ہوں۔اور جو " لَا اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ" آخر تک یعنی اَلَیْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی(القیامۃ/ ۴۰) تک پڑھے تو کہے ہاں اللہ مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے۔اور جو سورۂ مرسلات پڑھتے ہوئے فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ (الأعراف/ ۱۸۵) پر پہنچے تو کہے اٰمَنَّا بِاللّٰهِ :"ہم اللہ پر ایمان لائے۔" (ابوداؤد وترمذی)

امام احمد وابو داؤد نے حضرت ابن عباس سے روایت کی کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَی" (الأعلیٰ/ ۱) پڑھتے تو" سُبْحٰنَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی" کہتے۔

ترمذی وحاکم نے حضرت جابر سے روایت کی انھوں نے کہا: ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے درمیان تشریف لائے اورانھیں سورۂ رحمٰن از اول تا آخر پڑھ کر سنائی

تو وہ خاموش رہے۔فرمایا: میں نے اسے جنوں کو پڑھ کر سنایا تو انہوں نے تم سے بہتر جواب دیا۔ میں جب بھی اللہ تعالیٰ کے قول "فَبِاَیِّ اٰلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ" پر آتا، وہ کہتے اے ہمارے رب ہم تیری کوئی نعمت نہیں جھٹلاتے ،حمد کا سزاوار تو ہی ہے۔

ابنِ مردویہ، دیلمی اور ابن ابی الدنیا نے "دعا" میں اور ان کے علاوہ اور محدثین نے ایک بہت ضعیف سند سے حضرت جابر سے روایت کی کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے "وَاِذَا سَأَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیبٌ" (البقرہ /١٨٦) ختم تک تلاوت فرمائی۔ پھر فرمایا: اے اللہ! تو نے دعا کا حکم دیا اور قبول فرمانے کا ذمہ لیا۔"لَبَّیْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّیْكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ لَبَّیْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَاشَرِیْكَ لَكَ،أَشْهَدُ أَنَّكَ فَرْدٌ أَحَدٌ صَمَدٌ، لَمْ تَلِدْ وَلَمْ تُوْلَدْ، وَلَمْ یَكُنْ لَّكَ كُفُوًا أَحَدٌ، وَأَشْهَدُ أَنَّ وَعْدَكَ حَقٌّ،وَّلِقَاءَكَ حَقٌّ،وَّالْجَنَّةَ حَقٌّ،والنَّارَ حَقٌّ،والسَّاعَةَ اٰتِیَةٌ لَّا رَیْبَ فِیْهَا، وَأَنَّكَ تَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ" "میں حاضر ہوں۔ اے اللہ میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ میں حاضر ہوں۔ بے شک حمد اور نعمت تیری ہے اور ملک تیرا ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو ایک اور بے نیاز ہے۔ نہ تو نے کسی کو جنا اور نہ تو کسی سے جنا گیا اور نہ کوئی تیرا ہمسر ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرا وعدہ حق ، تیری ملاقات حق، جنت حق اور جہنم حق ہے۔اور قیامت بے کسی شک وشبہہ کے آنے والی ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو قبروں میں مدفون مردوں کو دوبارہ زندہ فرمائے گا۔"

ابوداؤد وغیرہ نے حضرت وائل بن حُجر سے روایت کی ۔وہ کہتے ہیں: میں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نے "وَلَا الضَّآ لِّیْنَ" پڑھنے کے بعد آمین کھینچ کر کہا۔

قرآن کا جواب دینے کا یہی مطلب ہے۔

طبرانی نے اسی حدیث کو اس لفظ سے روایت کیا کہ حضور نے تین بار آمین کہا۔اور بیہقی نے اسی کو لفظ "قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ اٰمِیْن "کے ساتھ روایت کیا۔"حضور نے فرمایا :اے میرے رب مجھے بخش دے۔آمین۔"

امام نووی نے فرمایا:ایک ادب یہ بھی ہے کہ جب "وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ عُزَیْرُ ابْنُ اللّٰهِ (التوبہ/٣٠) اور "وقَالَتِ الْیَهُوْدُ یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ" (المائدۃ/٦٤) جیسی آیات پڑھے تو پست آواز میں پڑھے۔حضرت امام نخعی کا یہی عمل تھا۔

تلاوت قرآن کے وقت رونا اور جسے رونا نہ آئے اُس کا رونے کی صورت بنانا اور غم واندوہ اور خشوع وخضوع ظاہر کرنا مستحب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَیَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْکُوْنَ"

(ألا سراء/۱۰۹) ''وہ ٹھوڑیوں کے بل گر کر روتے ہیں۔''

صحیحین میں حضرت ابنِ مسعود کے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو قرآن پڑھ کر سنانے کی جو حدیث وارد ہے اُس میں ہے "فَاِذَاعَیْنَاہُ تَذْرِفَانِ" "دیکھا کہ حضور کی دونوں آنکھیں اشک بار ہیں''۔

بیہقی کی شعب الایمان میں حضرت سعد بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: بیشک یہ قرآن غم اور شکستہ دلی کے ساتھ اترا اِس لیے جب تم اس کی تلاوت کرو تو روؤ اور اگر رونا نہ آئے تو رونے کی صورت بناؤ۔

اِسی میں عبد الملک بن عمیر کی حدیث مرسَل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تمہیں ایک سورہ پڑھ کر سناتا ہوں جو اس کی تلاوت ہونے پر روئے گا اس کے لیے جنت ہے۔ اور اگر نہ رو سکو تو رونے کی صورت بناؤ۔

مسند ابی یعلیٰ میں ہے: قرآن کو غم کے ساتھ پڑھو۔ کیوں کہ یہ غم لے کر نازل ہوا۔

طبرانی کی روایت ہے: قرآن کو سب سے اچھا پڑھنے والا وہ ہے جو اسے پڑھتے وقت اس کے سبب غم زدہ ہو جائے۔

مہذّب میں ہے: گریہ لانے کا طریقہ یہ ہے کہ عذاب کی دھمکی ،سخت وعید اور عہد و پیمان والی آیتوں میں تأمل کرے، پھر اُن عہدوں اور پیمانوں کی تعمیل میں اپنی طرف سے ہونے والی غفلت و کوتاہی میں غور کرے۔ اگر اب بھی اسے غم و اندوہ اور گریہ و بکا کی کیفیت طاری نہ ہو تو اس کیفیت کے پیدا نہ ہونے پر روئے کیوں کہ یہ بھی ایک مصیبت ہی ہے۔

تلاوت میں آواز عمدہ بنانا سنوارنا مسنون ہے۔ ابن حبان وغیرہ کی حدیث ہے: "زَیِّنُوا القرانَ بِاَصْوَاتِکُمْ" "قرآن کو اپنی آوازوں سے آراستہ کرو" دارمی کے الفاظ یوں ہیں "حَسِّنُواالْقُرانَ بِأَصْوَاتِکُمْ فَاِنَّ الصَّوْتَ الْحَسَنَ یَزِیْدُ الْقُرانَ حُسْنًا" "قرآن کو خوش آوازی کے ساتھ پڑھو۔ اس لیے کہ خوش آوازی قرآن کے حسن و جمال میں اضافہ کر دیتی ہے"۔ بزار وغیرہ نے روایت کی: ''اچھی آواز قرآن کی زینت ہے۔''

احادیث مذکورہ کے علاوہ اس باب میں اور بہت سی صحیح احادیث وارد ہیں۔

اگر کوئی خوش اِلحان نہ ہو تو جہاں تک ہو سکے آواز اچھی بنائے۔ لیکن اس حد تک نہیں کہ کھینچ تان اور گانے کی صورت پیدا ہو جائے۔ کیوں کہ طبرانی اور بیہقی کی حدیث میں آیا ہے ''قرآن کو عربوں کی لے اور ان کی آوازوں کے مطابق پڑھو۔ اور اہل کتاب یہود و نصاریٰ اور حدودِ شرع سے

تجاوز کر جانے والوں کی آوازوں سے پرہیز کرو۔ کیوں کہ جلد ہی کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو گانے اور رہبانیت کی طرح قرآن کے الفاظ کو خوش گلوئی کے ساتھ بار بار دہرائیں گے۔ مگر وہ ان کے نرخروں سے آگے نہ بڑھے گا۔ ان کے دل اور ان کے اس حال کو پسند کرنے والوں کے دل فتنے میں مبتلا ہوں گے۔

امام نووی نے فرمایا: حدیث صحیح کے مطابق خوش آواز قاری سے قرآن پڑھنے کی درخواست کرنا اور اسے توجہ سے سننا مستحب ہے۔

اس میں کوئی مضایقہ نہیں کہ ایک پوری جماعت یک جا ہو کر قراءت کرے اور اگر یوں قراءت کریں کہ جماعت کے بعض افراد ایک حصہ پڑھیں، پھر دوسرے افراد اس کے بعد کا حصہ پڑھیں تو اس میں بھی حرج نہیں۔

تفخیم کے ساتھ قرآن کی تلاوت، مستحب ہے۔ حاکم کی حدیث ہے: قرآن تفخیم کے ساتھ نازل ہوا۔ حلیمی نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو مَردوں کی طرز پر پڑھے۔ اور عورتوں کی گفتگو کی طرح آواز جھکا کر اور مائل کر کے نہ پڑھے۔ مزید کہا: اس میں اِمالہ کی کراہت داخل نہیں جو بعض قرا کا مختار ہے۔ اور یہ ممکن ہے کہ قرآن تفخیم کے ساتھ نازل ہوا ہو پھر اس میں جہاں امالہ اچھا ہو وہاں امالے کی رخصت دے دی گئی ہو۔

## بلند آواز سے تلاوت

کچھ احادیث ایسی آئی ہیں جن کا تقاضا یہ ہے کہ تلاوت میں آواز بلند کرنا مستحب ہو اور دوسری کچھ احادیث کا تقاضا یہ ہے کہ خفی اور پست آواز میں قراءت مستحب ہو۔

قسم اول سے متعلق صحیحین کی یہ حدیث ہے: "مَا أَذِنَ اللّٰهُ لِشَيْءٍ مَا أَذِنَ لِنَبِيٍّ حَسَنِ الصَّوْتِ يَتَغَنّٰى بِالْقُرْاٰنِ يَجْهَرُ بِهٖ" "اللہ تعالیٰ کسی چیز پر ویسی توجُّہ (توجُّہِ قربت ومحبت) نہیں فرماتا جیسی کسی خوش آواز نبی کی طرف فرماتا ہے جو بآواز بلند خوش آوازی سے قرآن پڑھتا ہو"۔

قسم دوم سے متعلق ابوداؤد، ترمذی اور نسائی کی یہ حدیث ہے۔ "اَلْجَاهِرُ بِالْقُرْاٰنِ كَالْجَاهِرِ بِالصَّدَقَةِ ، وَالْمُسِرُّ بِالْقُرْاٰنِ كَالْمُسِرِّ بِالصَّدَقَةِ" "قرآن کو بلند آواز سے پڑھنے والا، علانیہ صدقہ دینے والے کی طرح ہے۔ اور اسے آہستہ پڑھنے والا چھپا کر صدقہ دینے والے کی طرح ہے۔"

امام نووی نے کہا: دونوں حدیثوں کے درمیان تطبیق یوں ہوگی کہ جہاں جہر سے رِیا کا اندیشہ ہو یا نمازیوں یا سونے والوں کو اس سے اذیت پہنچے تو اخفا بہتر ہے۔ اور اگر یہ صورتیں نہ ہوں تو جہر

افضل ہے۔ کیوں کہ اس میں اخفا کی بہ نسبت عمل زیادہ ہے اور اس کا فائدہ سامعین کو پہنچتا ہے، یہ پڑھنے والے کے دل کو بیدار کرتا، اس کی توجہ کو فکر کے لیے یکسو کرتا، اس کے کان کو اس کی طرف پھیرتا، نیند کو دور کرتا اور نشاط و چستی میں اضافہ کرتا ہے۔ اس تطبیق کی دلیل ابوداؤد کی یہ حدیث ہے جو بسند صحیح، حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک بار مسجد میں اعتکاف فرمایا تو وہاں لوگوں کو جہر سے تلاوت کرتے سنا۔ اِس پر پردہ ہٹایا اور فرمایا: سنو! تم سب اپنے رب سے مناجات (سرگوشی) کررہے ہو۔ اس لیے تم میں سے کوئی کسی کو ہرگز تکلیف نہ دے، اور نہ کوئی قراءت میں اپنی آواز دوسرے کی آوز سے بلند کرے۔

بعض علما نے کہا: قراءت کا کچھ حصہ جہر سے اور کچھ حصہ اخفا سے ہونا مستحب ہے۔ کیوں کہ آہستہ پڑھنے والا کبھی اکتاہٹ کی وجہ سے جہر سے انس اور سکون پاتا ہے اور جہر سے پڑھنے والا کبھی تھک کر اِخفا سے راحت پاتا ہے۔

## مصحف میں دیکھ کر پڑھنا

مصحف میں پڑھنا، زبانی پڑھنے سے افضل ہے۔ اس لیے کہ مصحف میں دیکھنا بھی ایک عبادت مطلوبہ ہے۔ نووی نے کہا: یہی ہمارے اصحاب اور سلف کا قول ہے اور میں نے اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں دیکھا۔ مزید فرمایا: اس بارے میں یہ کہنا اچھا ہوگا کہ یہ امر اشخاص کے اختلاف سے مختلف ہوگا۔ اُس شخص کے لیے قرآن دیکھ کر پڑھنا مختار و پسندیدہ ہوگا جس کا خشوع اور تدبر دیکھ کر اور زبانی پڑھنے کی حالتوں میں یکساں ہو۔ اور اس شخص کے لیے زبانی تلاوت پسندیدہ ہوگی جس کا خشوع اس کی وجہ سے درجۂ کمال کو پہنچ جائے اور مصحف سے پڑھنے کی بہ نسبت اس کا خشوع اور تدبر زیادہ ہو جائے۔

امام سیوطی نے کہا: مصحف میں پڑھنے کی دلیل حضرت اوس ثقفی کی وہ حدیث مرفوع ہے جو طبرانی اور بیہقی نے اپنی کتاب شعب الایمان میں روایت کی: "قِرَاءَةُ الرَّجُلِ فِيْ غَيْرِ الْمُصْحَفِ أَلْفُ دَرَجَةٍ، وقِرَاءَتُهُ فِي الْمُصْحَفِ تُضَاعَفُ أَلْفَيْ دَرَجَةٍ" "کسی شخص کا غیر مصحف میں قرآن پڑھنا ایک ہزار درجے رکھتا ہے اور اس کا مصحف میں پڑھنا دو ہزار درجے تک بڑھا دیا جاتا ہے۔"

ابوعبید نے بسند ضعیف روایت کی: زبانی قرآن پڑھنے والے پر، دیکھ کر پڑھنے والے کی فضیلت ایسی ہے جیسی فرض کی نفل پر ہے۔

بیہقی نے حضرت ابن مسعود سے مرفوعاً روایت کی: جو اللہ اور اس کے رسول کی محبت پر خوش ہو

وہ مصحف دیکھ کر پڑھے۔ بیہقی کہتے ہیں یہ حدیث مُنکَر ہے۔ پھر انہوں نے حضرت ابن مسعود سے بسند حَسَن یہ حدیثِ موقوف روایت کی: ''ہمیشہ مصحف میں دیکھ کر پڑھو۔''

ایک ادب یہ ہے کہ جب پڑھنے والے کو التِباس ہو جانے کے باعث یہ معلوم نہ ہو کہ جس جگہ تک وہ پہنچا ہے اُس کے بعد کیا ہے۔ اِس لیے وہ دوسرے سے پوچھے تو جس سے پوچھے اُس کے ساتھ اُسے وہی ادب اختیار کرنا چاہیے جو حضرت ابن مسعود، امام نخعی اور بشیر بن ابی مسعود سے منقول ہے۔ ان حضرات نے فرمایا: جب تم میں کوئی اپنے بھائی سے کسی آیت کے بارے میں دریافت کرے تو اس سے پہلے کی آیت کو پڑھ کر خاموش ہو جائے اور یہ نہ کہے ایسا ایسا کیسے ہے۔ کیوں کہ وہ اُسے اشتِباہ میں ڈال دے گا۔

ایک ادب یہ ہے کہ مصحف کی ترتیب کے مطابق پڑھے۔ شرحِ مہذب میں ہے: یہ اس لیے ہے کہ قرآن کی ترتیب ایک حکمت کی وجہ سے ہے۔ اس لیے ترتیب صرف اسی جگہ ترک کرے جہاں ترک کرنا شرع سے ثابت ہو۔ جیسے روز جمعہ کی نمازِ فجر میں "الٓم تنزیل" اور "ھل أتیٰ" پڑھنا۔ (اس کے دوسرے نظائر بھی ہیں۔)

پھر اگر سورتیں مسلسل پڑھنے کی بجائے چھوڑ چھوڑ کر متفرق طور پر پڑھے یا ترتیب کے برخلاف تقدیم وتاخیر کر کے پڑھے تو جائز ہے مگر خلاف اولیٰ ہے۔

کسی سورہ کو اس کے آخر سے اول تک پڑھنا بالاتفاق ممنوع ہے۔ کیوں کہ اس سے قرآن کا کچھ اعجاز جاتا رہے گا اور ترتیب کی حکمت مفقود ہو جائے گی۔

میں کہتا ہوں: اس بارے میں ایک اثر موجود ہے جسے طبرانی نے بسندِ جید حضرت ابنِ مسعود سے روایت کیا کہ ان سے ایسے شخص کے بارے میں سوال ہوا جو قرآن کو الٹا پڑھتا تھا۔ آپ نے جواب دیا ''وہ الٹے دل کا ہے''۔

رہی بات ایک سورہ کو دوسری سورہ سے مخلوط کرنے کی تو حلیمی نے اس کے ترک کو آدابِ تلاوت میں شمار کیا ہے۔ کیوں کہ ابوعبید نے سعید بن مسیّب سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب حضرت بلال کے پاس سے گذرے تو سنا کہ وہ کچھ اِس سورہ سے اور کچھ اُس سورہ سے پڑھ رہے ہیں۔ فرمایا: بلال میں تمھارے پاس سے گذرا تو میں نے تم کو کچھ اس سورہ اور کچھ اس سورہ سے پڑھتے ہوئے سنا؟ انہوں نے عرض کی: اچھی چیز کو اچھی چیز سے ملاتا ہوں۔ فرمایا: سورہ کو وہ جیسی ہو ویسی ہی پڑھو۔ یہ حدیث مرسل صحیح ہے۔ اور ابوداؤد کے نزدیک حضرت ابو ہریرہ سے موصولاً مروی ہے لیکن اس میں حدیث کا آخری حصہ نہیں ہے۔

ابوعبید نے اسی حدیث کو ایک دوسرے طریق سے عُفرَہ کے غلام عمر سے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت بلال سے فرمایا: جب کوئی سورہ پڑھو تو پوری پڑھو۔

ابوعبید کہتے ہیں کہ ہم سے مُعاذ نے ابنِ عَون کے حوالے سے بیان کیا کہ ابن عون نے کہا: میں نے ابن سیرین سے ایسے شخص کے متعلق سوال کیا جو ایک سورہ کی دو آیتیں پڑھ کر چھوڑ دے اور دوسری سورہ شروع کر دے۔ آپ نے فرمایا: تمہیں اس سے ڈرنا چاہیے کہ کسی بڑے گناہ کے مرتکب ہو جاؤ اور تمھیں پتہ نہ چلے۔

ابوعبید نے ہی حضرت ابن مسعود سے روایت کی: انہوں نے کہا: اگر تم کسی سورہ کی قراءت شروع کرنے کے بعد اس سے دوسری سورہ کی طرف منتقل ہونا چاہو تو "قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ" کی طرف منتقل ہو جاؤ۔ پھر جب اسے شروع کرو تو ختم کر لینے سے پہلے اس سے منتقل مت ہو۔ انہی نے ابن ہذیل سے روایت کی، ابن ہذیل نے کہا: علما ایک آیت کا کچھ حصہ پڑھنے اور کچھ حصہ چھوڑ دینے کو مکروہ قرار دیتے تھے۔

ابوعبید کہتے ہیں: ہماری رائے میں مختلف آیتوں کی قراءت مکروہ ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت بلال کے ایسا کرنے پر نکیر فرمائی۔ اور ابن سیرین نے بھی اس پر نکیر فرمائی۔ لیکن حدیث ابن مسعود کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ کوئی شخص ایک سورہ پوری پڑھنے کے ارادے سے شروع کرے پھر دوران قراءت دوسری سورہ پڑھنے کا خیال اس کے دل میں آئے تو وہ پہلے "قل هو الله" کی طرف منتقل ہو۔ مگر جو شخص شروع ہی سے ارادہ رکھتا ہو کہ ایک آیت سے دوسری آیت کی طرف منتقل ہوتا رہے گا اور آیات قرآنی کی تالیف وترتیب کے مطابق نہ پڑھے گا تو یہ کام وہی کرے گا جسے علم نہ ہو، کیوں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اسی طور پر اسے نازل فرماتا۔

حلیمی نے کہا: ہر ایسے حرف کا پورے طور پر ادا کرنا مسنون ہے جسے کسی قاری نے برقرار رکھا ہوتا کہ ان تمام حروف کا احاطہ واستیعاب کر لے جو قرآن کا جز ہوں۔

ابن صلاّح اور نووی نے کہا: جب کسی قاری کی قراءت کی ابتدا کرے تو جہاں تک کلام، ما قبل سے مرتبط ہو اس قراءت سے عدول نہ کرے۔ لیکن جب نیا مضمون شروع ہو اور ما قبل سے ربط نہ رہے تو دوسری قراءت کا شروع کرنا جائز ہے۔ مگر بہتر یہی ہے کہ اس مجلس میں پہلی قراءت پر ہی برقرار رہے۔

تلاوت قرآن پوری توجہ سے سننا اور دوران قراءت شور غل اور بات چیت سے پرہیز کرنا مسنون ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ"

"جب قرآن پڑھا جائے تو اسے بغور سنو اور خاموش رہو اس امید پر کہ تمھارے او پر رحم کیا جائے۔"

آیت سجدہ پڑھنے کے وقت سجدہ مسنون ہے۔

امام نووی نے فرمایا: قراءت کے لئے پسندیدہ اوقات میں افضل وہ وقت ہے جو نماز میں ہو پھر رات اور پھر رات کا نصف اخیر۔

مغرب وعشا کے درمیان تلاوت محبوب ومرغوب ہے۔ دن کا افضل حصہ، صبح کے بعد کا وقت ہے۔

کسی وقت خاص میں کسی علت کی وجہ سے قراءت قرآن مکروہ ہو، ایسا نہیں۔ اور جہاں تک بات اس رائے کی ہے جو ابو داؤد نے معاذ بن رفاعہ سے اور انھوں نے اپنے مشائخ سے روایت کی کہ انھوں نے عصر کے بعد قراءت کو مکروہ قرار دیا اور کہا کہ یہ یہود کے پڑھنے کا وقت ہے تو یہ نا مقبول ہے اور اس کی کوئی اصل نہیں۔

ایام میں عَرَفہ کا دن، پھر جمعہ، پھر دوشنبہ اور پنج شنبہ مختار ہیں۔ اور عَشَروں میں رَمَضَان کا آخری عشرہ (آخری دس دن)، ذوالحجہ کا پہلا عشرہ اور مہینوں میں ماہ رمضان مختار ہے۔

قرآن شروع کرنے کے لیے شبِ جمعہ اور ختم کرنے کے لیے شب پنج شنبہ مختار ہے۔ کیوں کہ ابن ابی داؤد نے حضرت عثمان بن عَفَّان سے روایت کی کہ وہ ایسا کیا کرتے تھے۔

اَفضل یہ ہے کہ ختم قرآن، دن یا رات کے ابتدائی حصہ میں ہو۔ کیوں کہ دارمی نے بسَنَدِ حَسَن حضرت سعد بن ابی وقّاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ حدیث روایت کی کہ آپ نے فرمایا: اگر قرآن، اولِ شب میں ختم کرنے کا اتفاق ہو تو ختم کرنے والے کے لیے فرشتے صبح تک دعائے مغفرت ورحمت کرتے ہیں۔ اور اگر دن کے ابتدائی وقت میں ختم کرنے کا اتفاق ہو تو فرشتے اس ختم کرنے والے کے حق میں شام تک دعائے رحمت ومغفرت کرتے ہیں۔

اِحیاء العلوم میں ہے: ختم قرآن، دن کے آغاز میں فجر کی دو رکعتوں میں ہو۔ اور اول شب میں سنتِ مغرب کی دو رکعتوں میں ہو۔

ختم قرآن کے دن روزہ رکھنا مسنون ہے۔ اسے ابو داؤد نے تابعین کی ایک جماعت سے روایت کیا۔

یہ بھی مسنون ہے کہ اپنے اہل خانہ اور دوستوں کو بلا لے۔ طبرانی نے حضرت انس سے روایت کی کہ وہ جب ختم قرآن کرتے تو اپنے اہل خانہ کو اکٹھا کرتے اور دعا فرماتے۔

ابن ابی داؤد نے حَکَم بن عتیبہ سے روایت کی۔ انھوں نے کہا کہ مجاہد اور ابن ابی امامہ نے

میرے پاس ایک شخص کو بھیج کر مجھے اطلاع دی کہ ہم قرآن ختم کرنا چاہتے ہیں اور ختم قرآن کے وقت دعا مقبول ہوتی ہے۔ (اس لیے آپ بھی اِس ساعتِ سعید میں شرکت کریں۔)

ابن ابی داؤد نے ہی مجاہد سے تخریج کی۔ انھوں نے کہا: صحابۂ کرام، ختم قرآن کے وقت جمع ہوتے۔ اور حضرت مجاہد کا قول ہے کہ اس وقت، رحمت الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔

سورۂ ضحیٰ سے آخر قرآن تک تکبیر کہنی مستحب ہے۔ یہی مکی قرا کی قراءت ہے۔

بیہقی نے شعب الایمان میں اور ابن خزیمہ نے، ابن ابی بزّہ کے طریق سے روایت کی۔ ابن ابی بزہ نے کہا: میں نے عِکرَمہ بن سلیمان کو کہتے ہوئے سنا: میں نے اسمٰعیل بن عبداللہ مکی کو قرآن پڑھ کر سنایا، جب میں سورۂ ضحیٰ پر پہنچا تو انھوں نے یہاں سے ختمِ قرآن تک تکبیر کہنے کا حکم دیا اور کہا کہ میں نے عبداللہ بن کثیر کو قرآن سنایا تو انھوں نے مجھے یہی حکم دیا اور بتایا کہ میں نے مجاہد کو قرآن سنایا تو انھوں نے یہی حکم دیا اور مجاہد نے خبر دی کہ انھوں نے حضرت ابن عباس کو سنایا تو انھوں نے یہی حکم دیا اور حضرت ابن عباس نے خبر دی کہ انھوں نے حضرت اُبی بن کعب کو قرآن سنایا تو انھوں نے یہی حکم دیا۔

ہم نے اس حدیث کو موقوفاً اسی طرح روایت کیا۔ پھر اسے بیہقی نے ایک دوسری سند سے ابن ابی بزہ سے مرفوعاً روایت کیا۔ اسی حدیث کو حاکم نے اپنی مستدرک میں اِسی مرفوع طریق سے بافادۂ تصحیح روایت کیا۔ اور بزی سے تو اس کے کثیر طرق ہیں۔

موسیٰ بن ہارون سے مروی ہے کہ مجھ سے بزی نے کہا کہ مجھ سے محمد بن ادریس شافعی نے کہا کہ اگر تم تکبیر چھوڑو گے تو اپنے نبی کی سنتوں میں سے ایک سنت چھوڑو گے۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر نے کہا: امام شافعی کا یہ قول اس بات کا مقتضی ہے کہ انھوں نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا۔

مسنون ہے کہ جب ایک ختم سے فارغ ہو جائے تو بعدِ ختم دوسرے ختم کے لیے ابتدا کردے۔ کیوں کہ ترمذی وغیرہ کی حدیث ہے: اللہ کے نزدیک سب سے محبوب عمل اس ٹھہرنے اور کوچ کرنے والے کا ہے جو اوّلِ قرآن سے آخرِ قرآن تک سفر کرے اور جب بھی ٹھہرے کوچ کرے۔

دارمی نے بسند حسن، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے، انھوں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب "قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ"، ختم کر لیتے تو "ألحمد" سے ابتدا فرماتے پھر سورۂ بقرہ کی چند آیات "أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ" تک پڑھتے۔ پھر ختم قرآن کی دعا مانگتے۔ پھر کھڑے ہوتے۔

کسی سے گفتگو کرنے کے لیے قراءت بند کرنی مکروہ ہے۔حلیمی نے کہا: کیوں کہ اللہ کے کلام پر دوسرے کے کلام کو ترجیح دینا مناسب نہیں۔

بیہقی نے اس کی تائید اِس حدیث سے فراہم کی جو صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر جب تلاوت کرتے تو بات نہ کرتے یہاں تک کہ تلاوت سے فارغ ہو جائیں۔

تلاوت کے وقت ہنسی، بے فائدہ کام اور غافل کرنے والی چیز کو دیکھنا بھی مکروہ ہے۔

عجمی یا غیر عربی زبان میں قرآن پڑھنا مطلقاً جائز نہیں خواہ پڑھنے والا عربی زبان اچھی طرح ادا کرسکتا ہو یا نہیں۔نماز میں پڑھے یا اس سے باہر۔

ابن عبدالبر نے اس پر اجماع نقل کیا کہ شاذ کی قراءت جائز نہیں ۔لیکن مَوہوب جزری نے غیر نماز میں اس کا جواز ذکر کیا ہے۔انھوں نے حدیث کی روایت بالمعنیٰ کے جواز پر اس کا قیاس کیا ہے۔

قرآن کو ذریعۂ مَعاش بنانا مکروہ ہے۔آجری نے حدیث عمران بن حصین کو مرفوعاً روایت کیا کہ جو قرآن پڑھے وہ قرآن کو وسیلہ بنا کر اللہ سے سوال کرے۔اس لیے کہ زیادہ زمانہ نہ گذرے گا کہ ایسے لوگ پیدا ہو جائیں گے جو قرآن پڑھیں گے اور اسے واسطہ و وسیلہ بنا کر لوگوں سے سوال کریں گے۔

یہ کہنا مکروہ ہے کہ میں فلاں آیت بھول گیا بلکہ یہ کہے کہ فلاں آیت میرے ذہن سے بھلا دی گئی۔کیوں کہ اس کی ممانعت میں حدیث صحیحین وارد ہے۔

قرآن کو بھول جانا حدیثِ ابی داؤد وغیرہ کی وجہ سے گناہِ کبیرہ ہے۔حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کے گناہ میرے سامنے پیش کیے گئے تو میں نے اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں دیکھا کہ ایک شخص کو قرآن کی کوئی سورہ یا آیت عطا کی گئی مگر اس نے اسے بھلا دیا۔

## اقتباس اور اس کا قائم مقام

**اقتباس**:شعر یا نثر میں قرآن کا کوئی ٹکڑا اس طور پر شامل کر لینا کہ وہ اپنے کلام کا حصہ بن جائے ــــ نہ اس طور پر کہ اس کے کلام اللہ ہونے کا اظہار ہو۔مثلاً اس میں "قَالَ اللّٰهُ تَعَالَىٰ" (اللہ تعالیٰ نے فرمایا) یا اس جیسا کوئی اور جملہ نہ استعمال کیا جائے۔اگر اس طرح کے جملے استعمال کیے جائیں یا کسی عبارت سے اس کے کلام اللہ ہونے کا اظہار کیا جائے تو اسے اقتباس نہیں کہا جائے گا۔

مشہور ہے کہ مالکی علما نے اِسے حرام قرار دیا اور ایسا کرنے والے پر سخت نکیر کی۔مذہبِ

شافعی کے علماے متقدمین نے اقتباس کے بارے میں کچھ ذکر نہ کیا۔ ہاں علماے متأخرین کی ایک جماعت نے اس سے بحث کی۔ چناں چہ اقتباس کے متعلق، شیخ عزالدین بن عبدالسلام سے پوچھا گیا تو انھوں نے اسے جائز قرار دیا اور اس کے لیے انھوں نے نماز وغیرہ میں وارد حضور کے قول "وَجَّهْتُ وَجْهِيَ" (آخر تک) اور حضور کے قول "فَالِقَ الإِصْبَاحِ، وَجَاعِلَ اللَّيْلِ سَكَناً، والشَّمْسِ وَالْقَمَرِ حُسْبَاناً، اقْضِ عَنِّيَ الدَّيْنَ، وَأَغْنِنِيْ مِنَ الْفَقْرِ" سے استدلال فرمایا۔ "اے رات کی تاریکی دور کر کے صبح کا اجالا پھیلانے والے، رات کو وجہ سکون وآرام بنانے والے اور چاند سورج کو ایک دقیق تدبیر کے ساتھ وجود بخشنے والے تو میری طرف سے میرا بار قرض اتار دے اور مجھے فقر سے دور رکھ۔"

ابنِ حُجَّه کی "شرح بدیعیہ" میں ہے، اقتباس کی تین قسمیں ہیں: (۱) مقبول (۲) مباح (۳) مردود۔

**مقبول**: جو خطبہ وتقریر، پند وموعظت اور عہد وپیمان میں ہو۔

**مباح**: جو غزل، خطوط اور قصوں میں ہو۔

**مردود**: اِس کی دو قسمیں ہیں۔

[۱] ایک وہ کہ کسی عبارت کا مضمون اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہو اور کوئی شخص اسے اپنی طرف منسوب کرلے۔ معاذ اللہ۔ جیسے بنی مَروَان میں سے ایک بادشاہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کے پاس ایک عرضی آئی جس میں اس کے کارندوں کی شکایت درج تھی۔ اس نے اسے پڑھنے کے بعد توقیع (نوٹ) میں لکھا "اِنَّ اِلَيْنَا اِيَابَهُمْ، ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (الغاشية/۲۶) "بیشک انھیں پلٹ کر ہمارے ہی پاس آنا ہے، پھر ہمارے ہی ذمہ ان سے محاسبہ کرنا ہے۔"

[۲] دوسری۔ نعوذ باللہ۔ کسی بیہودہ مضمون میں آیت کی تضمین ہو۔ جیسے شاعر کا درج ذیل قول:

اَوْحَىٰ اِلَىٰ عُشَّاقِهِ طَرْفُهُ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ
وَرِدْفُهُ يَنْطِقُ مِنْ خَلْفِهِ "لِمِثْلِ ذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ"

"اس کے عاشقوں سے اس کی نظر نے سرگوشی کی کہ "دور بہت دور ہے وہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے"۔ اور اس کی سرین پیچھے سے یوں گویا ہے کہ "اِسی کے مثل کے لیے عاملوں کو عمل کرنا چاہیے۔"

امام سیوطی فرماتے ہیں: یہ تقسیم وتفریق بہت عمدہ ہے اور میں بھی اسی کا قائل ہوں۔

شیخ تاج الدین سبکی نے اپنے طبقات میں شافعیّہ کے بڑے عالم اور نہایت جلیل القدر امام ابو منصور عبدالقاہر بن طاہر تمیمی بغدادی کے تذکرے میں ان کا مندرجہ ذیل شعر لکھا ہے۔

يَا مَنْ عَدَىٰ ثُمَّ اعْتَدَىٰ ثُمَّ اقْتَرَفَ ثُمَّ انْتَهَىٰ ثُمَّ ارْعَوَىٰ ثُمَّ اعْتَرَفَ

أَبْشِرْ بِقَوْلِ اللّٰهِ فِيْ اٰيَاتِهِ اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّاقَدْ سَلَفَ

"اے وہ شخص جس نے حد سے تجاوز کیا، پھر حد سے تجاوز کیا، پھر ارتکاب گناہ کیا، پھر گناہ چھوڑ دیا، پھر اس سے باز آ گیا، پھر اعتراف گناہ کرلیا۔ تو اللہ کی آیات میں اُس کے اِس قول سے خوش ہو جا کہ اگر لوگ گناہوں سے باز آ جائیں تو ان کے ماضی کے گناہ بخش دیے جائیں گے۔"

امام سیوطی نے کہا: چوں کہ امام ابومنصور نے "قول الله "کی تصریح فرمادی ہے اس لیے یہ دونوں شعر اقتباس کے تحت نہیں آتے۔

تاج الدین سبکی کے بھائی بہاء الدین سبکی عروس الافراح شرح تلخیص المفتاح میں لکھتے ہیں کہ: وَرَع اور زیادہ تقوی یہ ہے کہ اقتباس کی سبھی صورتوں سے اجتناب کیا جائے اور اللہ ورسول کے کلام کو ایسے مواقع سے دور رکھا جائے۔ امام سیوطی فرماتے ہیں: مگر جلیل القدر ائمہ سے اقتباس کا استعمال ثابت ہے۔ جیسے امام ابوالقاسم رافعی نے فرمایا:

اَلْمُلْكُ لِلّٰهِ الَّذِىْ عَنَتِ الْوُجُوْ..............هُ لَهُ وَذَلَّتْ عِنْدَهُ الْأَرْبَابُ

مُتَفَرِّدٌ بِالْمُلْكِ وَالسُّلْطَانِ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ تَجَا ذَبُوْهُ وَ خَابُوْا

دَعْهُمْ وَزَعْمَ الْمُلْكِ يَوْمَ غُرُوْرِهِمْ فَسَيَعْلَمُوْنَ غَداً مَّنِ الْكَذَّابُ

"بادشاہی اسی اللہ کی ہے جس کے حضور چہرے جھکے ہوئے ہیں اور جس کے سامنے ملک وسیادت والے ذلیل وحقیر ہیں۔

بادشاہت اور اقتدار میں وہ منفرد ہے، جن لوگوں نے بھی اس سے کشاکش کی، خائب وخاسر ہوئے۔

انھیں ان کی فریب خوردگی کے دن یعنی دنیا میں ان کے حکمراں ہونے کے دعویٔ باطل کے ساتھ چھوڑ دے۔ کیوں کہ کل یعنی روز قیامت انھیں معلوم ہو جائے گا کہ کون بہت جھوٹا ہے۔"

بیہقی نے شعب الایمان میں اپنے شیخ ابو عبد الرحمن سلمی سے روایت کی: انھوں نے کہا: ہمیں احمد بن محمد بن یزید نے اپنے یہ اشعار پڑھ کر سنائے:

سَلِ اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ وَاتَّقِهٖ فَاِنَّ التُّقَىٰ خَيْرُ مَا تَكْتَسِبُ

وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَصْنَعْ لَهٗ "وَ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ"

"اللہ سے اس کے فضل کا سوال کر اور اس سے ڈر اس لیے کہ سب سے اچھی کمائی" خدا ترسی" ہے۔

جو اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ اس کی کارسازی فرماتا اور اسے ایسے مقام سے روزی عطا فرماتا ہے جہاں اس کا گمان بھی نہ ہو۔''

## غریب القرآن کی معرِفت

غریب: اس لفظ کو کہتے ہیں جس کے معنی لغت میں تلاش کرنے کی ضرورت پڑے۔

دراصل زبان کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے، بعض فصیح الفاظ ایسے بھی ہوتے ہیں جو خاص اہل زبان کے استعمال میں آئے مگر عام اہل زبان کو ان سے آشنائی نہ ہوئی، اس لیے وہ انھیں اجنبی و بے گانہ معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی دور میں ان کا رواج عام تھا، بعد میں کم ہو گیا، اس لیے بعد والوں کو وہ الفاظ بے گانہ و اجنبی معلوم ہونے لگے، ایسے ہی الفاظ کو ''غریب'' کہتے ہیں۔ ان کے معانی سے آگاہی کے لیے ماہرین زبان اور کتبِ لغت سے مراجعت کی ضرورت ہوتی ہے۔

قرآن کریم میں بھی ایسے مشکل الفاظ بہت ملتے ہیں، اور ان کی تفسیر میں علما نے مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جیسے ابوعبید قاسم بن سلاّم علیہ الرحمہ کی ''غریب القرآن'' اور امام راغب اصفہانی کی ''مفردات القرآن''

یہ فن اِس لائق ہے کہ اس سے اعتنا کیا جائے۔ کیوں کہ بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ کی یہ حدیث مرفوع روایت کی کہ حضور نے فرمایا: "أَعْرِبُوا الْقُرْآنَ ، وَالْتَمِسُوْا غَرَائِبَهٗ" "الفاظ قرآن کے معانی جانو اور اس کے غریب الفاظ کو تلاش کرو۔''

بیہقی ہی نے اِسی کے مثل عمرو بن عمرو بن مسعود سے موقوفاً روایت کی۔ اور حضرت عمر کی یہ حدیث مرفوع بھی تخریج کی "مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فَأَعْرَبَهٗ كَانَ لَهٗ بِكُلِّ حَرْفٍ عِشْرُوْنَ حَسَنَةً ، وَّ مَنْ قَرَأَهٗ بِغَيْرِ اِعْرَابٍ كَانَ لَهٗ بِكُلِّ حَرْفٍ عَشْرُ حَسَنَاتٍ "

''جو قرآن کو اعراب (فہمِ معانی) کے ساتھ پڑھے، اسے ہر حرف کے عوض بیس نیکیاں ملیں گی۔ اور جو اسے بے اعراب (بے ادراکِ معانی) پڑھے، اُسے ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں ہی ملیں گی۔''

یہاں اعرابِ قرآن سے مراد الفاظِ قرآن کے معانی کی معرفت ہے۔ نہ کہ نحویوں کا اصطلاحی اعراب جو لحن (اِعرابی غلطی) کا مُقابل ہے۔ اس لیے کہ اعراب نحوی کے مفقود ہونے کی صورت میں قراءتِ قرآن حقیقت میں نہ تو قراءت ہے اور نہ ہی اس میں کوئی ثواب ہے۔

اِس موضوع سے شغل رکھنے والے پر تحقیق، جلد بازی سے پرہیز، اہلِ فن کی کتابوں کی طرف

مُرَاجَعَت اور ظن و تخمین سے اجتناب لابدی وضروری ہے۔ کیوں کہ صحابۂ کرام جو خالص عرب، فصیح ترین زبان کے مالک اور وہ خوش نصیب انسان تھے جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا انھوں نے بھی ایسے الفاظ میں توقف سے کام لیا جن کے معانی انھیں معلوم نہ تھے اور اسی لیے انھوں نے ان کے متعلق کچھ بھی لب کشائی نہیں فرمائی۔

ابو عبید نے فضائل میں ابراہیم تیمی سے تخریج کی کہ جب حضرت ابوبکر صدیق سے اللہ تعالیٰ کے قول "وَ فَاكِهَةً وَّ أَبًّا"(عبس/۳۱)[۱] کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا: کون آسمان میرے اوپر سایہ کرے گا اور کون زمین میرا بار اٹھائے گی اگر میں اللہ کی کتاب کے متعلق ایسی بات کہہ دوں جس کا مجھے علم نہیں۔

ابو عبید نے ہی حضرت انس سے روایت کی کہ حضرت عمر بن خطاب نے برسرِ منبر "وفاكهةً وَّ أَبًّا"(عبس/۳۱)[۱] پڑھنے کے بعد فرمایا: ہم فاکھۃ (میوہ) کے معنیٰ سے تو واقف ہیں لیکن أبّ کا کیا معنیٰ ہے یہ ہمیں معلوم نہیں۔ پھر روے سخن اپنی طرف کرتے ہوئے فرمایا: اے عمر! حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ایک بے جا شوق ہے۔ (کہیں کَلَف ہے کہیں تَكَلُّف۔ کلف کا معنیٰ شدتِ شوق، تکلف کا معنیٰ بے جا زحمت یعنی ہر لفظ کا معنیٰ جان لینا ضروری نہیں۔ اجمالاً اتنا جان لینا بھی کفایت کرسکتا ہے کہ یہاں رب تعالیٰ نے اپنی نعمتیں بیان فرمائی ہیں۔۱۲، مترجم)

انھیں نے بطریقِ مُجاہد، حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کی کہ انھوں نے فرمایا: مجھے "فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ" کے معنیٰ معلوم نہ تھے۔ یہاں تک کہ دو بادیہ نشین میرے پاس ایک کنویں کے متعلق باہم جھگڑا کرتے ہوئے آئے تو ایک نے کہا: "أَنَا فَطَرْتُهَا" یعنی میں نے اِسے ازسرِ نو بنایا ہے۔ اس وقت میں نے "فاطر" کے معنی جانے۔

ابن جَرِیْر نے سعید بن جُبَیر سے تخریج کی کہ ان سے اللہ تعالیٰ کے قول "وَ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا" (مریم/۱۳)[۲] کے متعلق سوال ہوا تو انھوں نے کہا: میں نے اس کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباس سے پوچھا تو انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

فِرْیَابی نے تخریج کی کہ ہم سے اسرائیل نے اور اِن سے سماک بن حَرْب نے حضرت عکرمہ کے حوالے سے بیان کیا کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا: چار الفاظ غِسْلِيْن، حنانا، أَوَّاہ، اور رَقِيْم کے سوا پورے قرآن کے معانی میں جانتا ہوں۔

---

[۱] اور زمین میں میوے اور دوب اُگائے۔

[۲] اور اپنی طرف سے مہربانی عطا کی۔ [اور ان کے دل میں رقت و رحمت رکھی کہ لوگوں پر مہربانی کریں۔]

ابن ابی حاتم نے قتادہ سے تخریج کی کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ کے قول "رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ" (الأعراف /٨٩)[1] کے معنیٰ اس وقت تک نہ جان سکا جب تک میں نے بنتِ ذی یزن کا یہ قول نہیں سن لیا "تَعَالَ أُفَاتِحْكَ" آؤ میں تمھیں قاضی کے پاس فیصلے کے لیے لے چلوں۔ ابن ابی حاتم نے ہی بطریقِ مجاہد، حضرت عبداللہ بن عباس سے تخریج کی کہ انھوں نے فرمایا: مجھے یقین سے پتہ نہیں کہ غسلین کیا ہے۔ لیکن میرا گمان ہے کہ اس سے مراد ''تھوہڑ کا درخت'' ہے۔

## فصل

مفسر کے لیے اس فن سے آگہی ضروری ہے۔ برہان میں ہے: غریب القرآن سے نقاب کشائی کرنے والے کو اَسما، اَفعال اور حروف کے لحاظ سے علم اللغۃ کی معرفت کی ضرورت ہوتی ہے۔

نحویوں نے ''حروف'' کے کم ہونے کے باعث ان کے معانی سے بحث کردی ہے۔ اس لیے ان کے معانی ان نحویوں کی کتابوں سے اخذ کیے جائیں۔ اور جہاں تک اسما و افعال کا تعلق ہے تو ان کی تحصیل علمِ لغت کی کتابوں سے کی جائے۔ سب سے بہتر یہ ہوگا کہ اس سلسلے میں ان اقوال کی طرف رجوع کیا جائے جو حضرت ابن عباس اور ان سے اکتسابِ علم کرنے والے ان کے تلامذہ سے ثابت ہیں۔ چناں چہ ان سے بأسانیدِ صحیحہ وہ اقوال وارِد ہیں جو غریب القرآن کی پوری تفسیر کو حاوی ہیں۔ انھیں میں وہ اقوال بھی ہیں جو حضرت عبداللہ بن عباس سے بہ طریقِ ابنِ ابی طلحہ مروی ہیں۔ حضرت ابن عباس تک پہنچنے والی سندوں میں یہ سند سب سے زیادہ صحیح ہے۔ ان سے اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل ارشادات کی تفسیر میں وارد ہے کہ: يُؤْمِنُونَ سے يُصَدِّقُونَ (تصدیق کرتے ہیں)، يَعْمَهُونَ سے يَتَمَادَوْنَ (انتہا کو پہنچ جائیں)، مُطَهَّرَة سے مُطَهَّرَةٌ مِّنَ الْقَذَىٰ وَالْأَذَىٰ (گندگی اور قابلِ نفرت چیزوں سے پاک بیویاں)، وَفِي ذَٰلِكُم بَلَاءٌ میں بلاء سے ''نعمت''، وَفُومِهَا" سے گیہوں اور أَمَانِيَ سے ''داستانیں'' مراد ہیں۔

قرآن کے کلمات غریبہ کی تفسیر میں بطریق ابن ابی طلحہ، حضرتِ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے جو اقوال وارد ہیں انھیں امام سیوطی نے اپنی کتاب ''اتقان'' میں سورتوں کی ترتیب کے مطابق، استیعاب کے ساتھ بہترین انداز میں تحریر فرمادیا ہے۔

## فائدہ

یہاں یہ اشکال درپیش ہوتا ہے کہ قرآن میں غریب کا وجود کیوں کر ہے؟ جب کہ کلام کا

[1] اے ہمارے رب ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق فیصلہ فرمادے۔

غرابت سے محفوظ ہونا، فصاحت کی ایک شرط ہے۔ اور قرآن سب سے فصیح کلام ہے اس لیے اس کا اِس سے خالی ہونا ضروری ہے۔

اِس کا جواب یہ ہے کہ غرابت کے دو معنیٰ ہیں:

(۱) پہلا معنیٰ: ایسے لفظ کا استعمال جو وحشی ہو اور جس کا استعمال نامانوس ہو۔ یہ فصاحت میں خَلَل انداز ہوتا ہے۔

(۲) دوسرا معنیٰ: ایسے لفظ کا استعمال جس میں رائے کا کوئی دخل نہ ہو بلکہ اس کے معنیٰ کی معرفت کا تعلق نقل سے ہو۔ جیسے لفظِ قَسْوَرَة کا أَسَد (شیر) کے لیے استعمال۔

قرآن میں یہی دوسری قسم پائی جاتی ہے اور اس کے معانی سے آشنائی کے لیے اس فن کے ماہرین اور شناورانِ زبان ولغت کے بیان کی حاجت ہے۔

## فصل

ابوبکر بن انباری نے کہا: صحابہ اور تابعین نے غریب القرآن اور مُشْكِلُ القرآن پر اشعارِ عرب سے بکثرت استدلال فرمایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا: ''شعر عربوں کا دفتر ہے''۔ اس لیے جب قرآن کا کوئی لفظ ہم سے مخفی رہتا ہے تو ہم زبانِ عرب کے دیوان یعنی اشعارِ عرب کی طرف رجوع کر کے اُس لفظ کے معنی سے آگہی حاصل کرتے ہیں، اس لیے کہ قرآن کو رب تعالیٰ نے عرب کی زبان میں نازل فرمایا ہے۔

ابن انباری نے ہی بطریقِ عکرمہ، حضرت ابن عباس سے تخریج کی کہ آپ نے فرمایا: اگر تمھیں غریب القرآن کے متعلق مجھ سے پوچھنا ہو تو اسے شعر میں تلاش کرلو کیوں کہ شعر عربوں کا دفتر ہے۔

ابوعبید نے اپنی کتاب ''فضائل القرآن'' میں کہا: ہم سے ہُشَیم نے حُصَین بن عبدالرحمٰن سے، انھوں نے عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن عتبہ سے اور انھوں نے حضرت ابن عباس کے حوالے سے بیان کیا کہ حضرت ابن عباس سے قرآن کے بارے میں سوال کیا جاتا تو آپ جواب میں شعر پڑھتے۔ ابوعبید نے کہا: مطلب یہ کہ تفسیرِ قرآن پر وہ شعر سے استدلال کرتے تھے۔

امام سیوطی نے کہا: حضرت ابن عباس سے اس قسم کے بہت سے اقوال مروی ہیں جن میں سب سے زیادہ جامع ''مسائلِ نافع بن ازرق'' ہیں۔ اِن میں سے بعض اقوال کی ابن الانباری نے ''کتاب الوقف'' میں اور طبرانی نے اپنی ''معجم کبیر'' میں تخریج کی ہے۔ انھیں میں سے ایک ابن عباس کے حوالے سے نافع کا یہ قول بھی ہے: آپ (ابن عباس) مجھے ''عَنِ الْيَمِينِ وَ عَنِ الشِّمَالِ عِزِيْن''

(المعارج/۳۷)[۱] کے بارے میں بتایئے؟ آپ نے فرمایا: عِزُوْن: حِلَقُ الرِّفَاقِ (ساتھیوں کے حلقوں) کے معنیٰ میں ہے۔ انھوں نے عرض کی: کیا عرب اِسے جانتے ہیں؟ فرمایا: ہاں! کیا تم نے عبید بن الابرص کا یہ قول نہیں سنا:

فَجَاءُوْا يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ حَتّٰى يَكُوْنُوْا حَوْلَ مِنْبَرِهٖ عِزِيْنَا

''وہ اس کی جانب دوڑتے ہوئے آئے یہاں تک کہ اس کے منبر کے اردگرد حلقوں کی صورت میں ہو گئے۔''

نافع نے پوچھا: مجھے اللہ تعالیٰ کے ارشاد "وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ" (المائدۃ/ ۳۵)[۲] کے بارے میں بتایئے؟ جواب دیا: وسیلہ حاجت کے معنیٰ میں ہے۔ اِس پر نافع نے پوچھا کیا عرب اس سے واقف ہیں؟ فرمایا: ہاں! کیا تم نے عَنْتَرَہ کا یہ شعر نہیں سنا:

اِنَّ الرِجَالَ لَهُمْ اِلَيْكِ وَسِيْلَةٌ اِنْ يَّأْخُذُوْكِ تَكَحَّلِيْ وَ تَخَضَّبِيْ

''بلاشبہہ لوگوں کو تجھ سے حاجت ہے۔ اگر وہ تجھے قید کرلیں تو تُو اپنی آنکھوں میں سرمہ لگالے اور اپنے ہاتھوں کو مہندی سے رنگ لے۔''

## قرآن میں وارد غیر عربی الفاظ

ایسے غیر عربی الفاظ جنھیں عربی بنالیا گیا ہو، قرآن میں آئے ہیں یا نہیں؟ اس بارے میں ائمہ اسلام کے درمیان اختلاف ہے۔

اکثر ائمہ جیسے امام شافعی، ابن جریر، ابوعبید، قاضی ابوبکر اور ابن فارس ایسے الفاظ کے عدمِ وُقوع کے قائل ہیں۔ ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا قول "قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا" اور ارشاد باری "وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا أَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗٓ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّ عَرَبِيٌّ" ہے (فُصِّلَتْ/۴۴)[۳]

حضرت امام شافعی نے قرآن میں غیر عربی لفظ کے وقوع کے قائل پر سخت تنقید فرمائی۔

ابوعبید نے کہا: قرآن روشن عربی زبان میں اتارا گیا اِس لیے جو شخص اس میں غیر عربی لفظ کے ہونے کا قائل ہے اس نے ایک بڑی بات کہی اور جو قرآن میں آئے ہوئے کسی لفظ کے بارے میں یہ کہے کہ ایسا نبطی زبان میں ہے اُس نے بھی بڑی بات کہی۔

اِس کے برخلاف بعض دوسرے ائمہ کا قول ہے کہ قرآن میں ایسے لفظ کا وقوع جائز و غیر

[۱] پوری عبارت اس طرح ہے۔ "فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ، عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ" (المعارج/۳۶، ۳۷) ''تو ان کافروں کو کیا ہوا جو تمھارے دہنے اور بائیں گروہ در گروہ جمع ہو کر تمھاری طرف تیز نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

[۲] اور اس کی طرف وسیلہ ڈھونڈھو۔

[۳] اور اگر ہم اسے عجمی زبان کا قرآن کرتے تو ضرور کہتے کہ اس کی آیتیں کیوں نہ کھولی گئیں۔ کیا کتاب عجمی اور نبی عربی [ہیں]

ممنوع ہے۔ کیوں کہ عربی زبان میں ایسے غیر عربی الفاظ موجود ہیں جنھیں عربوں نے استعمال کیا اور وہ فصیح عربی لفظ کے قائم مقام ہو گئے کہ ان سے اپنی مراد کا اظہار و بیان ہونے لگا تو قرآن میں ان کا نزول ہوا۔

کچھ اور علما نے کہا: یہ تمام الفاظ خالص عربی ہیں۔ لیکن چوں کہ عربی انتہائی وسیع زبان ہے اس لیے بعید نہیں کہ اس کے کچھ الفاظ کے معانی ، جلیل القدر اکابر پر مخفی رہ جائیں۔ جیسے حضرت عبداللہ بن عباس سے "فاطِر "اور "فَاتح"کا معنیٰ مخفی رہ گیا۔

امام شافعی نے اپنی کتاب "الرسالہ"میں فرمایا: کسی بھی زبان پر پوری طرح عبور نبی ہی کو حاصل ہوتا ہے۔

ابوعبید قاسم بن سلام نے کہا: میرے نزدیک درست یہ ہے کہ یہ الفاظ اپنے اصول کے اعتبار سے عجمی ہیں جیسا کہ فقہا نے کہا۔ لیکن جب ان کا وقوع عربوں کی گفتگو میں ہوا تو انھوں نے اپنی زبان کے اُصول وضَوابِط کے مطابق انھیں عربی کے قالَب میں ڈھال لیا اور عجمی الفاظ کی فہرست سے انھیں عربی الفاظ کے ذخیرے میں منتقل کر لیا، یوں وہ الفاظ عربی ہو گئے۔ پھر جب قرآن نازل ہوا تو اس وقت حال یہ تھا کہ یہ الفاظ ،کلام عرب میں پوری طرح گھل مل چکے تھے۔ اِس لیے جس نے یہ کہا کہ یہ الفاظ عربی ہیں اس نے بھی سچ کہا اور جس نے یہ کہا کہ یہ الفاظ عجمی ہیں اس نے بھی سچ کہا۔ جوالیقی ،ابنِ جوزی اور چند دوسرے علما کا مَیلان اِسی قول کی طرف ہے۔

ایسے الفاظ کی چند مثالیں:

أَبَارِیق: ثعالبی نے "فقه اللغه" میں نقل کیا کہ یہ فارسی زبان کا لفظ ہے۔ جوالیقی نے بھی یہی کہا کہ "اِبْرِیق"فارسی ہے جسے عربی بنا لیا گیا۔ معنیٰ ہے "دستہ اور ٹونٹی والا پانی کا ظرف" یا "آہستہ آہستہ پانی انڈیلنے کا ایسا برتن، آفتابہ"

أبٌّ: بعض علما نے کہا: اہلِ مغرب کی زبان میں اس کا معنیٰ "خشک گھاس" ہے۔ اس قول کو شیدلہ نے نقل کیا۔

ابْلَعِیْ: ابن ابی حاتم نے اللہ تعالیٰ کے قول: "اِبْلَعِی مَا ءَكِ " (هود/٤٤) کے بارے میں وَہْب بن مُنَبِّہ سے تخریج کی کہ حبشی زبان میں "ابلعی"کا معنیٰ ہے "تو پانی کو نگل جا"۔

أخلد : واسطی نے ارشاد میں کہا: عبرانی زبان میں أَخْلَدَ اِلَی الاَ رْضِ (الأعراف/١٧٦) بمعنیٰ "رکن ہے۔ یعنی "وہ زمین کی طرف مائل ہو کر اس پر مقیم ہو گیا"

أرَائِك: ابن جوزی نے "فنون الافنان" میں نقل کیا کہ یہ حبشی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی

سُرُر یعنی ''تختوں'' ہے۔

اِستَبرَق: ابن ابی حاتم نے ضحاک سے تخریج کی کہ زبانِ عجم میں اِس کا معنیٰ ہے ''ایک قسم کا دبیز ریشمی کپڑا''۔

أَسفَار: واسطی نے ''ارشاد'' میں کہا کہ سریانی زبان میں ''کُتُب''یعنی ''کتابوں'' کے معنیٰ میں ہے۔

اِصرِیٰ: ابوالقاسم نے ''لغات القرآن'' میں کہا: اصر نبطی زبان میں ''عہد'' کے معنیٰ میں آیا ہے۔

أَکوَاب: ابن جوزی نے نقل کیا کہ نبطی زبان میں ''کوزوں'' کے معنیٰ میں ہے۔

انَاہُ: اہل مغرب کی زبان میں '' پکنا'' کے معنیٰ میں ہے۔

أَوَّاہٌ: ابوالشیخ ابنِ حِبّان نے بطریقِ عکرمہ، حضرت عبداللہ بن عباس سے تخریج کی کہ آپ نے فرمایا: أَوَّاہ حبشی زبان میں ''یقین کرنے والا'' کے معنیٰ میں ہے۔ اور اس کے دوسرے معنی بھی بتائے گئے ہیں۔

## چند اہم قواعد جن سے واقفیت مفسر کے لئے ضروری ہے

**ضمیر کا مرجع:** ضمیر کا ایک ایسا مرجع ہونا ضروری ہے جس کی طرف وہ ضمیر راجع ہو۔ مرجع یا تو لفظ ہوگا جو ضمیر سے پہلے اور ضمیر کے مطابق ہوگا۔ جیسے ''وَنَادَیٰ نُوحُ ابنَہٗ'' [۱] (ھود/۴۲) ''وَعَصَیٰ اٰدَمُ رَبَّہٗ'' [۲] (طٰہٰ/۱۲۱) ''اِذَا أَخرَجَ یَدَہٗ لَم یَکَدْ یَرَاھَا'' [۳] (النور/۴۰) یا مرجع مُتَضَمَّن یعنی کسی لفظ کے ضِمن میں ہوگا۔ جیسے ''اِعدِلُوا ھُوَ أَقرَبُ لِلتَّقوَیٰ'' (المائدۃ/۸) ''عدل کرو وہ یعنی عدل، تقویٰ سے قریب تر ہے۔ یا کوئی لفظ اس (مرجع) پر اِلتزَامًا دلالت کرے گا۔ جیسے ''اِنَّا أَنزَلنٰہُ'' [۴] (ألقدر/۱) یہاں ''ہ'' ضمیر منصوب متصل کا مرجع، قرآن ہے کیوں کہ لفظِ انزال، التزاماً اس پر دلالت کر رہا ہے۔ اور جیسے ''فَمَنْ عُفِیَ لَہٗ مِنْ أَخِیہِ شَیئٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعرُوفِ وَأَدَاءٌ اِلَیہِ بِاِحسَانٍ'' [۵] (ألبقرۃ/۱۷۸) اِس میں فعلِ ماضی مجہول ''عُفِیَ'' ایک ''عَافِیْ'' یعنی ایسے معاف کرنے والے کو مُستَلزِم ہے جس کی طرف ''الیہ'' کی ضمیر ''ہ'' لوٹائی گئی ہے۔ یا مرجع لفظاً ضمیر کے بعد مگر رُتبۃً ضمیر سے پہلے اور ضمیر کے مطابق ہوگا۔ جیسے ''فَأَوجَسَ فِی نَفسِہٖ خِیفَۃً مُّوسَیٰ'' [۶] (طٰہٰ/۶۷) ''وَلَا یُسئَلُ عَن ذُنُوبِھِمُ المُجرِمُونَ'' [۷] (القصص/۷۸) ''فَیَومَئِذٍ لَا یُسئَلُ عَن ذَنبِہٖ اِنسٌ وَّ لَا جَانٌّ'' (الرحمٰن/۳۹) ''تو اس

---

[۱] اور نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا۔ [۲] اور آدم سے اپنے رب کے حکم میں لغزش ہوئی۔ [۳] جب اپنا ہاتھ نکالے تو سوجھائی دیتا معلوم نہ ہو۔ [۴] ''بے شک ہم نے اسے (قرآن کو) نازل کیا۔'' [۵] ''تو جس کے لیے اس کے (مقتول) بھائی کی طرف سے کچھ معافی ہوئی تو بھلائی سے تقاضا ہو اور اچھی طرح ادا'' [۶] ''تو اپنے جی میں موسیٰ نے خوف پایا'' ۔ [۷] ''اور مجرموں سے ان کے گناہوں کی پوچھ نہیں۔''

دن گنہ گار کے گناہ کی پوچھ نہ ہوگی کسی آدمی اور جن سے۔"

کبھی ضمیر صرف "لفظِ مذکور" کی طرف راجع ہوتی ہے۔اس کے معنیٰ کی طرف راجع نہیں ہوتی جیسے "وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهِ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ" (فاطر/۱۱)[۱] میں عمرہ کی ضمیر مجرور متصل،صرف لفظاً"معمر" کی طرف راجع ہے۔کیوں کہ اس ضمیر سے مراد "دوسرا معمر شخص" ہے۔"ما يعمر من معمر" میں مذکور معمر شخص نہیں۔

کبھی ضمیر کسی شے کے لفظ کی طرف تو عائد ہوتی ہے مگر اس ضمیر سے مراد وہ شے نہیں بلکہ اس کی جنس ہوتی ہے۔زمخشری کے قول کے مطابق اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے "اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ أَوْلٰى بِهِمَا" [۲] (النساء/۱۳۵) کیوں کہ اس میں "بهما" کی ضمیر تثنیہ سے مراد جنسِ فقیر اور جنسِ غنی ہے۔یہ اس لیے کہ دونوں جنسوں پر "غنيا أو فقيرا" دلالت کر رہا ہے۔اگر ضمیر صرف اسی مشہود علیہ کی طرف راجع ہوتی جس کے متعلق کلام فرمایا گیا تو ضمیر واحد ہوتی نہ کہ تثنیہ۔

کبھی ضمیر تثنیہ ذکر کی جاتی ہے۔مگر وہ دو مذکور میں سے کسی ایک ہی کی طرف راجع ہوتی ہے۔جیسے "يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ" [۳] (الرحمٰن/۲۲) میں "منهما" کی ضمیر تثنیہ میٹھے اور کھارے پانی والے دوسمندروں میں سے ایک ہی کی طرف راجع ہے۔کیوں کہ موتی اور مونگا ان میں سے صرف ایک (کھارے سمندر) سے نکلتا ہے دونوں سے نہیں۔

کبھی ایک شے سے متعلق ضمیر تو آتی ہے لیکن اس کا مرجع وہ شے نہیں بلکہ دوسری شے ہوتی ہے۔جیسے: "وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ" (المؤمنون/۱۲)[۴] پھر فرمایا: "ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً" (المؤمنون/۱۳)[۵] اس میں "جعلنٰه" کی ضمیرِ منصوب متصل،حضرت آدم کے لیے نہیں بلکہ ان کی اولاد کے لیے ہے۔کیوں کہ حضرت آدم کی تخلیق نطفے سے نہیں ہوئی۔یہی بابِ اِستخدام ہے اور اسی قبیل سے اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی ہے: "لَاتَسْئَلُوْا عَنْ أَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ" [۶] (المائدۃ/۱۰۱) پھر فرمایا: "قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ" [۷] (المائدۃ/۱۰۲) "سألها" کی ضمیرِ "ها" سے کچھ دوسری اشیا مراد ہیں جو پہلے ذکر شدہ لفظِ "اشیاء" سے مفہوم ہو رہی ہیں۔

کبھی ضمیر اس شے کے مُلابِس کی طرف عائد ہوتی ہے جس (شے) کے لیے وہ ملابس

---

(۱) اور جس بڑی عمر والے کو عمر دی جائے یا جس کسی کی عمر کم رکھی جائے، یہ سب ایک کتاب میں ہے۔[۲] جس پر گواہی دو وہ غنی ہو یا فقیر، بہر حال اللہ کو اس کا سب سے زیادہ اختیار ہے۔[۳] ان میں سے موتی اور مونگا نکلتا ہے۔[۴] ہم نے انسان یعنی آدم کو کشید کی ہوئی مٹی سے پیدا فرمایا۔[۵] پھر (ہم نے) اسے پانی کی بوند کیا۔[۶] ایسی باتیں نہ پوچھو جو تم پر ظاہر کی جائیں تو تمھیں بری لگیں۔[۷] تم سے اگلی ایک قوم نے انھیں پوچھا۔(یعنی دوسری باتوں کے بارے میں پوچھا)

ہے۔ جیسے: "اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا"[1] (النازعات/٤٦) یہاں "ضُحٰهَا" سے مراد "ضُحٰی يَوْمِهَا" ہے۔ یعنی شام کے دن کا وقتِ چاشت مراد ہے نہ کہ خود شام کا وقتِ چاشت کیوں کہ شام کا وقتِ چاشت ہوتا ہی نہیں۔ اور "یوم" (دن) "عشیة" (شام) کو مُلاَبِس یعنی شام پر مشتمل ہے۔

## قاعدہ

عاقلات کی جمع کی طرف ضمیر اکثر صیغۂ جمع کے ساتھ ہی عائد ہوتی ہے۔ خواہ وہ جمعِ قلت ہو یا جمعِ کثرت۔ جیسے: "وَالْوٰلِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ"[2] (البقرۃ/٢٣٣) "وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ"[3] (البقرۃ / ٢٢٨) پہلی مثال میں "ن" ضمیرِ جمع مؤنث "الوالدات" کی طرف اور دوسری مثال میں "ن" ضمیرِ جمع مؤنث "المطلقات" کی طرف راجع ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے قول "اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ"[4] (البقرۃ/٢٥۔ ال عمران/١٥۔ النساء/٥٧) میں "مطهرة" صیغۂ مفرد آیا جس میں "ھی" ضمیر مستتر مرفوع واحد ہے جو "زوج" کی جمع "أزواج" کی طرف راجع ہے "مطهرات" بصیغۂ جمع نہ آیا۔

لیکن غیر عاقل کی جمع کثرت میں اکثر ضمیر مفرد اور جمع قلت میں اکثر ضمیر جمع آتی ہے۔ اور قرآن کریم میں ایک مقام پر دونوں ضمیریں جمع ہوگئی ہیں۔ ارشاد ہے: "اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا"[5] (التوبة/٣٦) (الیٰ قوله تعالیٰ: مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ") ـــــ "منها" میں ضمیر "ھا" صیغۂ اِفْرَاد کے ساتھ "الشهور" کی طرف عائد ہے جو جمع کثرت ہے۔ اس کے بعد فرمایا: "فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ" اِس میں "أربعة حرم" کی طرف ضمیر عائد ہے اور یہ جمع قلت کے لیے ہے۔

## قاعدہ

اگر ضمیروں میں لفظ اور معنیٰ دونوں کی رعایت مقصود ہو تو سب سے پہلے لفظ کی رعایت کرتے ہوئے اس کی طرف ضمیر مفرد عائد کی جائے گی اُس کے بعد معنیٰ کی رعایت سے ضمیر جمع عائد ہوگی۔ قرآن کریم کا عام طریقہ یہی ہے۔ ارشاد ہوا: "وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ" پھر فرمایا: "وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ"[6] (البقرۃ / ٨) اِس مثال میں لفظِ "مَنْ" کا اعتبار کرتے ہوئے پہلے اس کی طرف "یقول" کی ضمیر مفرد عائد ہوئی۔ پھر معنیٰ کے اعتبار سے "مَنْ" کے لیے "هُمْ" ضمیر

---

[١] پوری آیت اس طرح ہے: كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا: گویا جس دن وہ اسے دیکھیں گے (تو خیال کریں گے کہ) دنیا میں نہ رہے تھے مگر ایک شام یا اس کے دن چڑھے۔ [٢] اور مائیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس۔ [٣] اور طلاق والیاں اپنی جانوں کو روکے رہیں تین حیض تک۔ [٤] (جنت میں) پاک بیویاں ہیں۔ [٥] بیشک مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں، اللہ کی کتاب میں، جب سے اس نے آسمان و زمین بنائے۔ ان میں چار حرمت والے ہیں۔ تو ان مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔ [٦] اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور وہ ایمان والے نہیں۔

جمع آئی۔ اِسی طرح "وَ مِنْهُم مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ أَكِنَّةً"[۱] (الأنعام/۲۵) اور "وَمِنْهُمْ مَنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ، اَلَافِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا" [۲] (ألتوبة/۴۹) میں ہے۔

شیخ علم الدین عراقی نے فرمایا: قرآن میں صرف ایک جگہ پہلے، معنیٰ کے اعتبار کو راجح قرار دیا گیا۔ ارشاد باری ہے: "وَ قَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَ نْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰى أَزْوَاجِنَا"[۳] (ألأنعام/۱۳۹) کیوں کہ اس مثال میں معنیٰ "ما" پر حمل کرنے کے سبب پہلے لفظِ "خالصة" تاے تانیث کے ساتھ، مؤنث آیا، پھر لفظِ "ما" کے لحاظ سے "محرم" مذکر آیا۔

## تعریف وتنکیر کا قاعدہ

تعریف وتنکیر میں سے ہر ایک کے استعمال کا ایک خاص مقام ہے جو دوسرے کے لائق اور موزوں نہیں۔ اس لیے ہم دونوں کے اَسباب الگ الگ ذکر کریں گے۔

## اَسْبابِ تنکیر

[۱] وحدت مراد لینا جیسے: "وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً رَّجُلاً فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشَاكِسُوْنَ وَ رَجُلاً سَلَماً لِّرَجُلٍ"[۴] (الزُمَر/۲۹)

[۲] نوع مراد لینا جیسے: "هٰذَا ذِكْرٌ (ص/۴۹)" یہ ایک قسم کا ذکر ہے۔" "وَعَلٰى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ" (البقرة /۷) یعنی ان کی آنکھوں پر ایک عجیب قسم کا ایسا پردہ پڑا ہوا ہے جس سے لوگ متعارف ہی نہیں کیوں کہ اس پردے نے جو کچھ چھپا دیا اسے اور کوئی پردہ چھپا ہی نہیں سکتا۔ "وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ" (البقرة/۹۶) یہاں "حیوۃ" سے ایک خاص نوع کی زندگی مراد ہے یعنی مستقبل میں زیادتی حیات کا تم انھیں ضرور تمام لوگوں سے زیادہ حریص پاؤ گے۔ کیوں کہ حرص نہ تو ماضی کی ہوتی ہے نہ حاضر کی۔ مگر اللہ تعالیٰ کا قول "وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ" (النور/۴۵) ایک ساتھ وحدت اور نوعِیّت دونوں کا احتمال رکھتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے چوپایوں کی انواع میں سے ہر نوع کو پانی (نطفے) کی انواع میں سے ایک نوع سے یا چوپایوں کے اَفراد میں سے ہر فرد کو نطفوں کے افراد میں سے ایک فرد سے پیدا کیا۔

[۳] تعظیم: یعنی شے اس بات سے عظیم تر ہے کہ اس کی تعیین کی جائے اور اسے معرفہ بنا جائے۔ اس لیے اسے نکرہ ہی رکھا گیا۔ جیسے: "فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ" (البقرة/۲۷۹) تو تم یقین کرو

---

[۱] اور ان میں کوئی وہ ہے جو تمھاری طرف کان لگاتا ہے۔ اور ہم نے ان کے دلوں پر غلاف کر دیے ہیں۔ [۲] اور ان میں کوئی تم سے یوں عرض کرتا ہے کہ مجھے رخصت دیجیے اور فتنہ میں نہ ڈالیے۔ سن لو وہ فتنہ ہی میں پڑے۔ [۳] اور بولے جو ان مویشیوں کے پیٹ میں ہے وہ نرا ہمارے مردوں کا ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے۔ [۴] اللہ ایک مثل بیان فرماتا ہے، ایک غلام میں کئی بدخو آقا شریک اور ایک نرے ایک مولیٰ کا۔

ایک جنگ کا، یعنی ایک جنگ عظیم کا یقین کرو۔

[۴] تکثیر: جیسے "اَئِنَّ لَنَا لَأَ جراً "(الشعراء/۴۱) "کیا ہمارے لیے یقینی طور پر کثیر و وافر معاوضہ ہوگا"۔ اور ارشادِ باری :"وَاِنْ یُّکَذِّبُوْكَ فَقَدْ کُذِّ بَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ "(فاطر/۴) میں بیک وقت تعظیم وتکثیر دونوں کا احتمال ہے۔" اگر وہ تمھیں جھٹلائیں تو تم سے پہلے بھی "بہت سے" "باعظمت" رسولوں کو جھٹلایا جا چکا۔"

[۵] تحقیر: یعنی کسی کی شان اتنی گری ہوئی ہو کہ تعریف وتعیین کے لائق نہ ہو۔ جیسے: "وَاِنْ نَّظُنُّ اِ لاظَنًّا" (ألجاثية/۳۲) "یعنی ہم محض ایک حقیر گمان رکھتے ہیں جو کسی اعتبار وشمار کے لائق نہیں۔"

[۶] تقلیل: "وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَکْبَرُ" "اللہ کی قلیل رضا، جنتوں سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔" اس لیے کہ یہی رضا و خوشنودی ہر سعادت وخوش بختی کی اصل اور بنیاد ہے۔

قَلِیْـلٌ مِّنْـكَ یَکْـفِیْـنِیْ وَ لٰـکِنْ قَلِیْلُـكَ لَا یُقَـالُ لَـهٗ قَلِـیْـل

"تیری قلیل عطا میرے لیے کافی ہوتی ہے۔ لیکن تیرے قلیل کو قلیل نہیں کہا جاتا۔"

## اَسْبابِ تعریف

[۱] تعریف بالاضمار: یہ اس لیے ہوتی ہے کہ مقام یا تو مقامِ تکلّم ہے یا مقامِ خِطاب یا مقامِ غَیْبَت۔

[۲] تعریف بالعلمیة: یہ کسی شے کے ساتھ مخصوص اسم کے ذریعے اس شئی معین کو براہِ راست ذہنِ سامع میں حاضر کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ جیسے :"قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ "(ألاخلاص/۱) "تم فرماؤ وہ اللہ ایک ہے۔" اس مثال میں ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص اسم "الله" کے ذریعہ ذات باری کو ذہنِ سامع میں براہِ راست مُسْتَحْضَر کیا گیا۔ "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ "(ألفتح/۲۹) اِس مثال میں ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ خاص اسم "محمد" کے ذریعہ ذاتِ رسالت کو اِسْتِقْلَالاً ذہنِ سامع میں مُسْتَحْضَر کیا گیا۔

- یہ تعریف، تعظیم یا اِہانت کے لیے بھی آتی ہے۔

**تعظیم**: جیسے اللہ تعالیٰ کا حضرت یعقوب کو ان کے لقب "اِسْرَائِیْل" سے ذکر کرنا۔ اِس میں آپ کی مدح وتعظیم اس طور پر ہے کہ اس کا معنیٰ ہے "صَفْوَ ةُ اللّٰهِ "اللہ کا برگزیدہ بندہ یا "سَرِیُّ اللّٰهِ" اللہ کا شریف وبلند مرتبہ بندہ۔

**اہانت**: جیسے اللہ تعالیٰ کا قول "تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ "(تبت/۱) "ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہوجائیں۔"

ابولہب کا اصل نام عبدالعزیٰ تھا۔لیکن اس مثال میں اس کی کنیت "ابولہب" (شعلے والا) کا ذکر اہانت کے لیے کیا گیا۔اس میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ یہ کنیت اس کے جہنمی ہونے سے کنایہ ہے۔

[۳] تعریف بالاشارہ: یہ شے کو محسوس طور پر ذہن سامع میں حاضر کر کے دوسرے سے بالکل جدا اور ممتاز کرنے کے لیے ہوتی ہے۔جیسے:"هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَأَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِه"(لقمان/۱۱)"یہ جسے تم محسوس طور پر آنکھوں سے دیکھ رہے ہو،اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے تو اب مجھے وہ دکھاؤ جسے اللہ کے علاوہ دوسروں نے پیدا کیا۔"

● یہ سامع کی غَبَاوَت وکند ذہنی پر تعریض کرنے کے لیے بھی آتی ہے کہ وہ اتنا کند ذہن اور ناسمجھ ہے کہ بغیر اشارۂ حِسّیہ اس کے نزدیک کوئی شے ممتاز ہی نہیں ہوتی۔یہی مذکورہ بالا آیتِ کریمہ اس کی مثال بھی بن سکتی ہے۔یعنی سامع اتنا غبی ہے کہ اللہ کی مخلوق کی طرف "هٰذَا" کے ذریعہ جب تک اشارۂ حسیہ نہ کردیا جائے وہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ وہ خدا کی مخلوق ہے۔

● شے کے قریب ہونے کے سبب اس کی تحقیر کے لیے بھی آتی ہے۔جیسے کفار کے یہ اقوال: "أهٰذَا الَّذِیْ یَذْ کُرُ اٰلِهَتَكُمْ (ألأ نبیاء/۳٦)" کیا یہی وہ حقیر شخص ہے جو تمھارے معبودوں کو برا کہتا ہے۔" "أهٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْ لًا " (الفرقان/۴۱) "کیا یہی وہ معمولی شخص ہے جسے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا۔" "مَا ذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا "(البقرة/ ۲٦) "اس حقیر مثال سے اللہ کا کیا مقصود ہے؟"اور جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "وَمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّ نْیَا اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ" (ألعنكبوت/٦٤) "یہ حقیر دنیوی زندگی تو محض لہو ولعب ہے۔"

● شے کے دور ہونے کے سبب اس کی تعظیم کے لیے بھی آتی ہے۔جیسے :"ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ" (ألبقرة/۲)"وہ بلند رتبہ کتاب (قرآن کریم) کوئی شک کی جگہ نہیں۔"اس مثال میں اشارۂ بعید لاکر قرآن کے بُعدِ مرتبہ و رِفعَتِ مقام کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

**تعریف بالموصولیۃ**: یہ کسی شے کو اس کے خاص نام سے ذکر کرنے کو ناپسند کرنے کے سبب لائی جاتی ہے۔خواہ یہ ناپسندیدگی اس کو مخفی رکھنے یا اس کی توہین کرنے کے لیے ہو یا کسی اور وجہ سے ہو۔جیسے:(وَالَّذِی قَالَ لِوَالِدَیْهِ أُفٍّ لَّكُمَا ۔الأحقاف/۱۷)"اور وہ جس نے اپنے ماں باپ سے کہا:اف تم سے دل پک گیا" (وَرَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا۔ یوسف/۲۳) "اور اس (عورت) نے بدکاری کے لیے اسے پھسلایا جس کے گھر میں وہ تھا۔"

● کبھی تعریف بالموصولیۃ عموم کے لیے آتی ہے۔جیسے: (اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۔حٰم السجدة/۳۰) "بیشک جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب

ہے پھر اسی پر قائم رہے ان پر فرشتے اترتے ہیں۔" (وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۔ العنکبوت / ٦٩) "اور جنھوں نے ہماری راہ میں کوشش کی ضرور ہم انھیں اپنے راستے دکھا دیں گے۔" (اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ ۔ غافر / ٦٠) "بیشک جو لوگ گھمنڈ کے سبب ہماری عبادت سے منہ موڑتے ہیں وہ جلد جہنم میں داخل ہوں گے۔"

● کبھی اختصار کے لیے آتی ہے۔ جیسے: لَاتَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ۔ الاحزاب / ٦٩) "اے ایمان والو! ان جیسے نہ ہونا جنھوں نے موسیٰ کو ستایا تو اللہ نے اسے بری فرمادیا اس بات سے جو انھوں نے کہی۔"

یہاں اختصار اس طور پر ہے کہ اگر حضرت موسیٰ پر ورم خصیہ کا الزام رکھنے والے تمام لوگوں کا نام ذکر کیا جاتا تو بات طویل ہو جاتی۔

یہ مثال عموم کے لیے نہیں ہوسکتی کیوں کہ تمام بنی اسرائیل نے آپ پر ورم خصیہ کا الزام نہیں لگایا تھا۔

## دوسرا قاعدہ

جب کوئی اسم دوبار ذکر کیا جائے تو اس کے چار احوال ہوتے ہیں۔ [۱] دونوں معرفہ ہوں [۲] دونوں نکرہ ہوں [۳] اول نکرہ ہو دوم معرفہ [۴] اول معرفہ ہو دوم نکرہ۔

اگر دونوں معرفہ ہوں تو اکثر یہ ہوتا ہے کہ ثانی سے اول ہی مراد ہوتا ہے اس لیے کہ لام یا اضافت میں اصل یہ ہے کہ عہد کے لیے ہوں یعنی معہود اور متعین شی پر دلالت کریں۔ جیسے: (اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (الفاتحہ /٦) (صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۔ الفاتحہ /٧)، (وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ۔ غافر /٩) "اور انھیں گناہوں کی شامت سے بچالے اور جسے تو اس دن گناہوں کی شامت سے بچائے تو بیشک تو نے اس پر رحم فرمایا۔"

اگر دونوں نکرہ ہوں تو اکثر یہ ہوتا ہے کہ دوسرے سے اول مراد نہیں ہوتا، اس لیے کہ اگر ثانی سے اول ہی مراد ہوتا تو مناسب یہ تھا کہ ثانی کو معرفہ لایا جائے اس لیے کہ معہود سابق کو بتانے کے لیے معرفہ لانا ہی مناسب ہوتا ہے۔ جیسے: (اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ، ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً ۔ الروم /٥٤) "اللہ ہے جس نے تمھیں ابتدا میں کمزور بنایا، پھر تمھیں ناتوانی سے طاقت بخشی، پھر قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا دیا۔"

اس مثال میں کلمۂ ضعف تین بار آیا ہے اور تینوں جگہ نکرہ ہے لیکن تینوں سے مراد ایک نہیں بلکہ پہلے ضعف سے نطفہ، دوسرے ضعف سے طفولیت اور تیسرے ضعف سے بڑھاپا مراد ہے۔

اللہ تعالیٰ کے قول ( فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ، اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا)[1] (الانشراح/ ۵، ۶) میں دونوں قسمیں جمع ہوگئی ہیں اس لیے کہ دوسرے عسر سے پہلا ہی عسر مراد ہے لیکن دوسرے یسر سے پہلا یسر مراد نہیں بلکہ ایک اور یسر مراد ہے۔اسی لیے حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے اس آیت کریمہ کے متعلق فرمایا: ہرگز ایک تنگی دو آسانیوں پر غالب نہیں آئے گی۔

اگر اسم اول نکرہ اور دوم معرفہ ہو تو عہد پر محمول ہونے کے سبب ثانی سے مراد اول ہی ہوگا۔ جیسے:(أَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا فَعَصٰی فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ ۔ المزمل/۱۵، ۱۶) "ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تو فرعون نے اس رسول کا حکم نہ مانا۔" (فِیْھَا مِصْبَاحٌ ، اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ ،اَلزُّجَاجَةُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ ۔ النور/۳۵) "جس میں چراغ ہے، وہ چراغ ایک فانوس میں ہے، وہ فانوس گویا ایک ستارہ ہے موتی سا چمکتا۔" ( اِنَّكَ لَتَھْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ، صِرَاطِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ ۔الشوریٰ/۵۲، ۵۳) "اور بیشک تم ضرور سیدھی راہ بتاتے ہو اللہ کی راہ کہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں (ہے)۔" ( مَاعَلَیْھِمْ مِنْ سَبِیْلٍ ،اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ ۔الشوری/۴۱، ۴۲) "ان پر کچھ مواخذہ نہیں، مواخذہ تو انھیں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں۔"

اگر اسم اول معرفہ اور اسم دوم نکرہ ہو تو مطلقاً نہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ثانی سے اول ہی مراد ہے اور نہ مطلقاً یہی کہنا صحیح ہوگا کہ ثانی سے اول مراد نہیں بلکہ اس صورت میں قرائن پر انحصار ہوگا۔قرینہ کبھی دونوں کے متغائر ہونے پر قائم ہوگا جیسے:(یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَیْرَسَاعَةٍ ۔الروم/۵۵) "جس دن قیامت قائم ہوگی تو جرم کرنے والے قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ وہ دنیا میں ایک ساعت سے زیادہ نہ رہے۔" اول [الساعة، معرفہ] سے مراد اور ہے اور ثانی [ساعه، نکرہ] سے مراد اور ہے۔

اور کبھی دونوں کے ایک ہونے پر قرینہ قائم ہوگا جیسے:(وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ کُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ ،قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا ۔الزمر/۲۷) "بیشک ہم نے اس قرآن یعنی عربی زبان میں اترنے والے قرآن میں ہر طرح کہاوتیں بیان کردیں تاکہ لوگ نصیحت پذیر ہوں۔" اول [ھذاالقرآن] معرفہ ہے۔ثانی [قرانا عربیا] نکرہ ہے مگر دونوں سے مراد ایک ہے۔

## تنبیہ

شیخ بہاء الدین نے اپنی کتاب "عروس الافراح" اور ان کے علاوہ دوسرے علما نے بھی فرمایا کہ ظاہر یہ ہے کہ یہ قاعدہ منضبط اور صحیح نہیں ہے کیوں کہ بہت سی قرآنی آیات سے ٹوٹ جاتا ہے۔

[۱] بیشک دشواری کے ساتھ آسانی ہے، بیشک دشواری کے ساتھ ایک اور آسانی ہے۔

## قسم اول میں وارد چند آیات جن سے قاعدہ ٹوٹ جاتا ہے۔

(هَلُ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّاالْاِحْسَانُ ۔ الرحمن/ ٦٠) "احسان کا بدلہ احسان ہی ہے۔"
اس آیت کریمہ میں دونوں اسم معرفہ ہیں مگر اسم دوم سے اول مراد نہیں ۔ (وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ والسِّنَّ بِالسِّنِّ ۔ المائدة /٤٥) "اور ہم نے توریت میں ان پر واجب کیا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت [ ہے ]" (كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ ،وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ، وَالْاُنْثَىٰ بِالْاُنْثَىٰ ۔ البقرة / ٧٨) "تم پر فرض ہے کہ جو ناحق مارے جائیں ان کے خون کا بدلہ لو آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔"

ان دونوں آیات کریمہ میں بھی "ثانی" سے "اول" مراد نہیں۔ (هَلُ اَتَىٰ عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ۔ الانسان /١) "بیشک آدمی پر ایک وقت وہ گذرا کہ کہیں اس کا نام بھی نہ تھا۔"

اس کے بعد فرمایا: (اِنَّاخَلَقْنَا الْاِ نْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۔ الانسان/٢) "بیشک ہم نے آدمی کو پیدا کیا ملی ہوئی منی سے۔" یہاں "انسان اول" سے مراد حضرت آدم ہیں جب کہ "انسان ثانی" سے مراد ان کی اولاد ہے۔ (وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۔ العنكبوت/٤٧) "اور اے محبوب یوں ہی تمھاری طرف کتاب اتاری تو وہ جنھیں ہم نے کتاب عطا فرمائی اس پر ایمان لاتے ہیں۔"

اس میں اسم اول "الکتاب" سے مراد قرآن کریم ہے جب کہ "کتاب ثانی" سے مراد توریت وانجیل ہیں۔

## قسم ثانی میں وارد چند آیات جن سے قاعدۂ مذکورہ ٹوٹ جاتا ہے۔

(هُوَ الَّذِىْ فِى السَّمَاءِ اِلٰهٌ وَفِى الْاَرْضِ اِلٰهٌ ۔ الزخرف/٨٤) "اور وہی ہے آسمان والوں کا معبود اور زمین والوں کا معبود۔" (يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ،قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۔ البقرة/٢١٧) "تم سے پوچھتے ہیں ماہ حرام میں لڑنے کا حکم تم فرماؤ اس میں لڑنا بڑا گناہ ہے۔"

ان دونوں آیات کریمہ میں الٰہ اول اور الٰہ ثانی اور قتال اول اور قتال ثانی سے ایک ہی معبود اور ایک ہی لڑائی مراد ہے حالاں کہ دونوں نکرہ ہیں۔

## قسم ثالث میں وارد چند آیات جو قاعدۂ مذکورہ کی ناقض ہیں۔

(فَلاجُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَاصُلْحًا،وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۰ النساء/ ۱۲۸) "تو ان پر گناہ نہیں کہ آپس میں صلح کرلیں اور صلح خوب ہے۔" (وَيُؤْتِ كُلَّ ذِىْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ۰ هود/۳) "اور ہر فضیلت والے کو اس کا فضل پہنچائے گا۔"

(وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ ۰ هود/ ۵۲) "اور تم میں جتنی قوت ہے اس سے اور زیادہ [قوت] دے گا۔" (لِيَزْدَادُوْآ اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ۰ الفتح/٤) "تاکہ انھیں یقین پر یقین بڑھے۔" (زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ۰ النحل/۸۸) "ہم نے عذاب پر عذاب بڑھایا بدلہ ان کے فساد کا۔" (وَ مَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِىْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۰ يونس /۳٦) "اور ان میں اکثر تو نہیں چلتے مگر گمان پر، بیشک گمان حق کا کچھ کام نہیں دیتا۔"

ان تمام آیات میں ثانی سے اول مراد نہیں۔

امام سیوطی نے کہا: تأمل سے کام لینے پر مذکورہ بالا کسی بھی آیت سے قاعدہ نہیں ٹوٹتا کیوں کہ ظاہر یہی ہے کہ احسان میں لام جنس کا ہے تو اس وقت وہ معنیٰ نکرہ کی منزل میں ہوگا۔ اسی طرح آیت "النفس "اور آیت" الحر "بھی ہے۔ اس کے برخلاف آیت" العسر "میں ال یا تو عہد کے لیے ہے یا استغراق کے لیے جیسا کہ حدیث بھی اسی کا افادہ کررہی ہے۔ اسی طرح آیت ظن میں ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اس میں ثانی اول نہیں بلکہ وہ قطعی اور یقینی طور پر عین اول ہے کیوں کہ ہر ظن مذموم اور برا نہیں ہوتا اور ایسا کیوں کر ہو بھی سکتا ہے جب کہ شریعت کے احکام ظنی ہیں۔ اسی طرح آیت صلح میں کوئی مانع نہیں کہ ثانی سے اول یعنی زن وشو کے درمیان طے پانے والی صلح مراد ہو۔ رہا باقی امور میں صلح کا مستحب ہونا تو یہ سنت سے اور بطریق قیاس آیت صلح سے ماخوذ ومستنبط ہے۔ ہاں اس آیت کے عام ہونے اور ہر صلح کے خیر ہونے کا قول کرنا جائز نہیں کیوں کہ ایسی صلح شرعاً ممنوع ہے جو کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام کردے۔ اسی طرح آیت قتال میں بیشک ثانی سے مراد عین اول نہیں کیوں کہ قتال اول جس کے متعلق سوال ہوا اس سے مراد وہ قتال ہے جو ۲ھ میں ابن حضرمی کے سریے میں پیش آیا کیوں کہ یہی واقعہ اس آیت کے نزول کا سبب ہوا جب کہ قتال ثانی سے مراد جنس قتال ہے نہ کہ بعینہ وہی قتال جس کا سریۂ ابن حضرمی سے تعلق ہے۔

آیت "وَهُوَ الَّذِىْ فِى السَّمَاءِ اِلٰهٌ" کا علامہ طیبی نے یہ جواب دیا کہ یہ باب تکرار سے ہے جس کا سبب ایک امر زائد کا افادہ ہے۔ اس پر دلیل اس سے پہلے مذکور آیت کریمہ (سُبْحٰنَ رَبِّ

السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ،رَبِّ الۡعَرۡشِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ۔ الزخرف/۸۲)(۱) میں رب کا بتکرار ذکر ہے۔ اس تکرار کی وجہ اولاد کی نسبت سے اللہ تعالیٰ کو منزہ و پاک قرار دینے میں مبالغہ ہے جب کہ قاعدۂ مذکورہ میں شرط یہ ہے کہ ایک اسم کا دوبارہ ذکر تکرار کے مقصد سے نہ ہو۔

## افراد وجمع کا قاعدہ

● قرآن میں جہاں بھی ارض کا ذکر ہوا مفرد ہی ہوا جمع نہیں ہوا کیوں کہ اس کی جمع ارضون ثقیل ہے۔اسی لیے جب تمام ''زمینوں'' کا ذکر فرمایا تو (وَمِنَ الۡاَرۡضِ مِثۡلَهُنَّ ۔ الطلاق/۱۲)(۲) فرمایا۔

● لیکن لفظ سماء کا ذکر کبھی صیغۂ جمع اور کبھی صیغۂ مفرد کے ساتھ مناسب مقام نکتوں کی وجہ سے کیا گیا۔حاصل یہ کہ جہاں لفظ سماء سے عدد مراد لیا گیا وہاں صیغۂ جمع لایا گیا جو عظمت و کثرت کی وسعت پر دلالت کرتا ہے جیسے: (سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ ۔ الحدید/۱ ۔ الحشر/۱ ۔ الصف/۱) ''اللہ کی پاکی بیان کی ان سب نے جو آسمانوں میں ہیں، یعنی عظیم آسمانوں کے کثیر و بے شمار ساکنان، خدا کی تسبیح سے رطب اللسان ہیں۔'' (تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ ۔ الاسراء/٤٤) ''آسمان اس کی پاکی بیان کرتے ہیں یعنی ایک ہی آسمان نہیں سبھی آسمان تسبیح کناں ہیں۔''

اور جہاں جہت مراد ہے وہاں لفظ سماء کا ذکر صیغۂ مفرد سے کیا گیا جیسے: ( وَفِی السَّمَاءِ رِزۡقُكُمۡ ۔ الذاریات/۲۲) ''اور آسمان کی طرف سے تمھاری روزی ہے۔'' (ءَ اَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَاءِ اَنۡ یَّخۡسِفَ بِكُمُ الۡاَرۡضَ ۔ الملك/١٦) '' کیا تم اس سے نڈر ہو گئے جو تم سے بلند ہے کہ تمھیں زمین میں دھنسا دے۔''

● ''ریح'' کا ذکر بھی قرآن کریم میں کہیں جمع اور کہیں مفرد ہوا ہے۔ جہاں اس کا ذکر بیان رحمت کے ضمن میں ہوا اسے جمع لایا گیا اور جہاں عذاب کے ضمن میں ذکر ہوا اسے مفرد لایا گیا۔

ابن ابی حاتم وغیرہ نے حضرت ابی بن کعب سے تخریج کی: آپ نے فرمایا: قرآن کریم میں وارد ہر لفظ ریاح رحمت ہے اور ہر لفظ ریح عذاب ہے۔اسی لیے حدیث شریف میں وارد ہے: اَللّٰهُمَّ اجۡعَلۡهَا رِیَاحًا وَّلَا تَجۡعَلۡهَا رِیۡحًا ۔ ''اے اللہ اسے ریاح کر دے اسے ریح نہ کر۔''

اس میں حکمت یہ ہے کہ ریاح رحمت (رحمت کی ہواؤں) کی مختلف صفتیں، ان کے چلنے کی مختلف جہتیں اور ان کے متعدد منافع ہوتے ہیں اور جب ان میں سے کوئی ایک ہوا تیز چلنے لگتی ہے تو اس کی مقابل ایک دوسری ہوا چلا دی جاتی ہے جو اس کے زور کو توڑ دیتی ہے۔

---

[۱] پاکی ہے آسمان وزمین کے رب کو،عرش کے رب کو ان باتوں سے جو یہ بناتے ہیں۔[۲] پوری آیت اس طرح ہے: اَللّٰهُ الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الۡاَرۡضِ مِثۡلَهُنَّ: اللہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور انھیں کے برابر زمینیں (بنائیں)۔

اس طرح دونوں ہواوں کے درمیان سے ایک ایسی لطیف اور نرم خرام ہوا پیدا ہوتی ہے جو جانداروں اور پودوں کے لیے مفید اور نفع بخش ہوتی ہے۔ اس لیے ریاح کا ذکر رحمت میں ہوا۔ لیکن چوں کہ عذاب میں ریح ایک ہی جہت وسمت سے آتی ہے اور اس کی مقابل کوئی دوسری ہوا نہیں ہوتی جو اس کو دفع کرے اس لیے عذاب میں ریح کو واحد لایا گیا لیکن سورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ کا قول :(وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ ۰ يونس /٢٢)[1] اس قاعدے سے دووجہوں سے خارج ہے:

[ا] وجہ لفظی: مقابلہ یعنی مشاکلہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے قول :(رِيحٌ عَاصِفٌ ۰ يونس/٢٢) میں ہے۔ اور بعض اوقات مقابلہ (مشاکلہ) میں وہ بات جائز ہوتی ہے جو مستقل طور پر جائز نہیں ہوتی۔ جیسے: (وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۰ال عمران/ ٥٤ )[2] میں اللہ تعالیٰ کی طرف مکر کی نسبت "مکروا" کے ساتھ مشاکلہ کی وجہ سے جائز ہے اس کے علاوہ کسی اور صورت میں خدا کی طرف مکر کی نسبت جائز نہیں۔

[۲] وجہ معنوی: یہ ہے کہ وہاں یعنی "وجرين بهم بريح طيبة" میں کمال رحمت ریح کے ایک ہونے سے ہی حاصل ہوگا اس کے مختلف ہونے سے نہیں کیوں کہ کشتی ایک سمت سے چلنے والی ایک ہوا سے ہی چلتی ہے اس لیے اگر اس پر مختلف جہتوں سے ہوا چلے تو یہ ہلاکت کا سبب ہوگا۔ اور یہاں یعنی ریح عاصف میں مطلوب ایک ہوا ہے اس لیے ریح کو عاصف سے موصوف کر کے اس معنیٔ مطلوب کی تاکید بھی کر دی گئی۔ اسی قاعدے پر اللہ تعالیٰ کا قول (وَاِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ۰الشوریٰ/٣٣)[3] بھی جاری ہے۔ ابن منیر نے کہا: یہ قول اسی قاعدے پر جاری ہے اس لیے کہ ریح کا رک جانا کشتی کے سواروں کے لیے عذاب اور سخت مرحلہ ہے اور عذاب والی ہوا کا ذکر وحدت کے طور پر ہوتا ہے۔ (یہ قول محل نظر ہے۔ مفاد آیت یہ ہے کہ وہی رحمت والی ہوا جو کشتیوں کو چلاتی ہے خدا چاہے تو اسے روک دے۔ صحیح وجہ وہی ہے جو پہلے مذکور ہے کہ کشتیوں کے لیے رحمت ایک جہت والی ہوا ہے اس لیے اس کا ذکر وحدت کے ساتھ آیا۔ مترجم)
(اس مثال پر قوی اشکال یہ ہے کہ قرآن میں جن مقامات پر "ریاح" بلفظ جمع آیا ہے ان میں متعدد جگہوں پر "ریح" مفرد بھی قراءات متواترہ میں ثابت ہے تو کلیۂ مذکورہ کے تحت وہی لفظ ایک قراءت متواترہ کی رو سے معنیٔ رحمت پر مشتمل ہوگا اور دوسری قراءت متواترہ کی رو سے معنیٔ عذاب پر مشتمل ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ مفرد والی قراءت میں معنیٔ جنس مراد ہے جو کثرت پر بھی دلالت کرتا ہے۔ مترجم)

---

[ا] هُوَ الَّذِىْ يُسَيِّرُكُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ، حَتّٰى اِذَا كُنْتُمْ فِى الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ: وہی ہے کہ تمھیں خشکی اور تری میں چلاتا ہے یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہو اور وہ اچھی ہوا سے انھیں لے کر چلیں اور اس پر خوش ہوئے، ان پر آندھی کا جھونکا آیا۔ [۲] اور کافروں نے مکر کیا اور اللہ نے ان کے ہلاک کی خفیہ تدبیر فرمائی۔ [۳] اگر وہ چاہے تو ہوا کو روک دے جس سے کشتیاں دریا کی پیٹھ پر ٹھہری رہ جائیں۔

● اسی باب جمع وافراد سے "نور" کو مفرد اور "ظلمات" کو جمع ذکر کرنا اور اللہ تعالیٰ کے قول (وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِه ۔ الانعام/۱۵۳[۱]) میں "سبیل الحق" (راہ حق) کو مفرد اور "سبل الباطل" (راہ ہائے باطل) کو جمع لانا بھی ہے۔ کیوں کہ راہ حق ایک ہی ہے جب کہ راہ باطل متعدد اور شاخ در شاخ ہوتی ہے۔ اور "ظلمات" بمنزلۂ طریق باطل اور "نور" بمنزلۂ طریق حق ہے بلکہ درحقیقت نور وظلمات عین حق و باطل ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ کے قول: (اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ،وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَوْلِيَآءُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۔ البقرۃ /۲۵۷[۲]) میں "ولی المؤمنین "واحد اور "اولیاء الکفار "جمع آیا۔ اس لیے کہ مومنین کا ولی ایک اللہ ہے اور کفار کے اولیا بہت سے طاغوت ہیں۔

● اسی باب جمع وافراد سے قرآن کریم میں "نار" کا ہر جگہ مفرد واقع ہونا اور "جنۃ" کا جمع اور مفرد دونوں واقع ہونا ہے۔ اس لیے کہ جنتیں مختلف انواع واقسام پر مشتمل ہیں تو جنت کا بلفظ جمع ہونا اچھا ہے اور نار صرف ایک مادّہ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ''جنت'' رحمت ہے اور ''نار'' عذاب ہے لہذا ''ریاح'' اور ''ریح'' کے طور پر جنت کا جمع ہونا اور نار کا مفرد ہونا مناسب ہے۔

● اسی باب سے اللہ تعالیٰ کے قول: (فَمَالَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ۔ الشعراء/۱۰۰[۳]) میں صدیق (دوست) کا مفرد ہونا اور شافعین (سفارش کرنے والوں) کا جمع ہونا بھی ہے۔

اس میں حکمت یہ ہے کہ عام طور پر سفارش کرنے والے کثیر اور دوست قلیل ہوتے ہیں۔ زمخشری نے کہا: اگر کوئی شخص کسی ظالم کے ظلم وستم میں گرفتار ہوجائے تو اس پر ترس کھا کر اس کی سفارش کے لیے اس کے اہل شہر کی ایک کثیر جماعت اٹھ کھڑی ہوتی ہے اگر چہ اس جماعت کے زیادہ تر افراد سے اس کی کوئی آشنائی نہ ہو۔ رہا سچا دوست تو وہ تو عُقاب کے انڈوں سے بھی زیادہ کمیاب ہے یعنی مخلص اور سچے دوست بہت کم ملتے ہیں۔

● سمع کو مفرد اور بصر کو جمع لانا بھی اسی باب سے ہے۔ سمع کو مفرد لانے کی وجہ اس پر مصدریت کا غلبہ ہے برخلاف بصر کے کہ عضو بصارت (آنکھ) میں اس کا استعمال مشہور ہے۔

ایک اور وجہ یہ ہے کہ سمع کا متعلّق آوازیں ہیں جن کی حقیقت ایک ہے جب کہ بصر کا متعلّق طرح طرح کی اشیا اور عام موجودات ہیں جن کے حقائق ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یوں ہر ایک سے اس کے متعلّق کی طرف اشارہ فرما دیا۔

---

[۱] اور اسلام کے علاوہ دوسری راہیں جیسے یہودیت ،نصرانیت وغیرہ اختیار نہ کرو کہ یہ تمھیں اس کی راہ سے جدا کردیں گی۔ [۲] اللہ والی ہے مسلمانوں کا ، انھیں اندھیریوں سے نور کی طرف نکالتا ہے اور کافروں کے حمایتی شیطان ہیں ،وہ انھیں نور سے اندھیریوں کی طرف نکالتے ہیں۔ [۳] تو اب ہمارا کوئی سفارشی نہیں اور نہ کوئی غم خوار۔

- اسی قبیل سے اللہ تعالیٰ کا قول: (وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ (النحل/۷۸، السجدۃ/۹، الملك/۲۳[۱]) بھی ہے۔
- باب جمع وافراد ہی سے مشرق ومغرب کا مفرد، تثنیہ اور جمع آنا بھی ہے۔ جہاں مفرد مذکور ہیں وہاں جہت کا اعتبار ہے جیسے: (رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ . المزمل/۹[۲]) جہاں بصیغۂ تثنیہ مذکور ہیں وہاں موسم گرما اور موسم سرما کے دو الگ الگ مشرق ومغرب کا اعتبار ہے جیسے: (رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ (الرحمن/۱۷[۳]) اور جہاں بصیغۂ جمع مذکور ہیں وہاں ہر موسم (بلکہ ہر ماہ اور ہر دن) میں الگ الگ مشرق ومغرب کا لحاظ ہے جیسے: (فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَ الْمَغٰرِبِ، اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ . المعارج/۴۰[۴])

## سوال وجواب کا قاعدہ

جب سوال کا رخ کسی کی طرف ہوتو جواب میں اصل یہ ہے کہ سوال کے مطابق ہولیکن کبھی کبھی جواب میں مقتضائے سوال سے عدول ہوتا ہے اس بات پر متنبہ کرنے کے لیے کہ سوال اس طرح ہونا چاہیے نہ کہ جیسا کیا گیا۔ سکا کی اسی کو اسلوب حکیم کہتے ہیں۔

کبھی جواب سوال سے عام ذکر کیا جاتا ہے اس لیے کہ سوال میں عموم کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی تقاضائے حال کے سبب جواب سوال سے کم تر بھی ہوتا ہے۔

عدول کی مثال اللہ تعالیٰ کا قول:(يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ،قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ . البقرۃ/۱۸۹[۵]) ہے۔

بعض صحابۂ کرام نے ماہ نو کے بارے میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یہ کیوں کر ابتدا میں دھاگے کی مانند باریک دکھائی دیتا ہے اور پھر تھوڑا تھوڑا بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ پورا قرص ماہتاب روشنی سے بھر جاتا ہے۔ بعد ازاں پھر مسلسل گھٹتا رہتا ہے یہاں تک کہ ویسا ہی ہوجاتا ہے جیسا ابتدا میں تھا؟ اس کے جواب میں گھٹنے بڑھنے کی حکمت بیان کی گئی تا کہ اس پر تنبیہ ہوجائے کہ زیادہ اہم اس کی حکمت کے متعلق سوال ہے نہ کہ وہ سوال جو ان کی طرف سے ہوا۔

یہ اس وقت ہے جب ہم کہیں کہ ان کا سوال ایسا ہی تھا کیوں کہ یہاں یہ بھی احتمال ہے کہ انھوں نے حکمت ہی کے بارے میں سوال کیا ہوتو اس وقت جواب اور سوال میں مطابقت بالکل ظاہر وعیاں ہے۔

---

[۱] اور (اللہ) نے تمھیں کان اور آنکھ اور دل دیے۔ [۲] پورب اور پچھم کا مالک۔ [۳] دونوں پوربوں اور پچھموں کا مالک۔ [۴] تو مجھے قسم ہے اس کی جو سب پوربوں اور پچھموں کا مالک ہے۔ [۵] تم سے نئے چاند کو پوچھتے ہیں تم فرمادو وہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں اور حج کے لیے۔

جواب میں زیادتی کی مثال اللہ تعالیٰ کا قول: (اَللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ۔ الانعام /٦٤[١]) ہے جو (مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۔ الانعام /٦٣[٢]) کے جواب میں ہے۔اور حضرت موسیٰ کا قول: (هِيَ عَصَايَ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ ۔طه/١٨٠[٣]) ہے جو (وَمَاتِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يَا مُوْسٰى ۔ طه/١٨٧[٤]) کے جواب میں ہے۔حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی میں لذت پانے کی وجہ سے جواب میں زیادتی کردی۔
زیادتی ہی کی ایک مثال قوم ابراہیم کا قول: (نَعْبُدُ اَصْنَامًافَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ۔الشعراء/٧١[٥]) بھی ہے جو (مَا تَعْبُدُوْنَ)[تم کیا پوجتے ہو۔] کے جواب میں ہے۔لوگوں نے بتوں کی عبادت پر اپنی خوشی کا اظہار کرنے اور سوال کرنے والے کے غیظ وغضب میں اضافے کے لیے یہ عبارت بڑھادی کہ ہم ان کی پرستش پر جمے رہتے ہیں۔

## وجوہ ونظائر کی معرفت

**وجوہ:** وہ لفظ مشترک جو چند معانی میں مستعمل ہو جیسے لفظ اُمَّةٌ۔
**نظائر:** جیسے الفاظ متواطئہ ۔یعنی ایسے الفاظ جن کے معانی کثیر پر صدق کی صلاحیت رکھتے ہوں۔
بعض علما نے اسے یعنی وجوہِ قرآن کو ایک نوع کا قرآنی معجزہ قرار دیا ہے کیوں کہ قرآن کا صرف ایک کلمہ کبھی بیس اور کبھی اس سے بھی زیادہ یا کم وجہوں پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ خصوصیت انسانی کلام میں موجود نہیں۔
ابن سعد وغیرہ نے حضرت ابو درداء سے موقوفاً روایت کی کہ "کوئی شخص اس وقت تک پورا عالمِ قرآن نہ ہوگا جب تک وہ قرآن کے وجوہِ کثیرہ کا عالم نہ ہو جائے۔"
بعض علما نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ وجوہ سے مراد ہے باطنی اشارات کو عمل میں لانا اور صرف تفسیر ظاہر پر اکتفا نہ کرنا۔
ابن سعد نے بطریق عکرمہ، حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کی کہ حضرت علی بن ابی طالب نے انھیں خوارج کے پاس بھیجتے ہوئے فرمایا: اُن کے پاس جا کر ان سے بحث کرو۔مگر دلیل میں قرآن کو پیش مت کرنا کیوں کہ قرآن متعدد وجہوں والا ہے۔ہاں ان سے سنت رسول کے حوالے سے بحث کرنا۔

---

[١] اللہ تمھیں نجات دیتا ہے اس سے اور ہر بے چینی سے۔[٢] تم فرماؤ وہ کون ہے جو تمھیں نجات دیتا ہے جنگل اور دریا کی آفتوں سے۔[٣] عرض کی یہ میرا عصا ہے، میں اس پر تکیہ لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں پر پتے جھاڑتا ہوں۔[٤] اے موسیٰ! اور یہ تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے۔[٥] بولے ہم بتوں کو پوجتے ہیں پھر ان کے سامنے آسن مارے رہتے ہیں۔

اس نوع کی چند اہم مثالیں:

ألهدٰی: سترہ وجہوں پر آتا ہے

[۱] **ثبات**: "اِهْدِنَا الصِراطَ المُستقيمَ"(الفاتحة/ ٦)"ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت دے (اس پر ثابت قدمی عطا فرما)۔"

[۲] **بیان**: "أُولٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ "(ألبقرة/٥)"وہی اپنے رب کی طرف سے ہدایت (بیان وانکشاف حق) پر ہیں۔"

[۳] **دِین**:"اِنّ الهُدَىٰ هُدَى اللّٰهِ "(آل عمران/٧٣) "بے شک ہدایت اللہ کی ہدایت ہے۔یعنی دین اللہ کا دین ہے۔"

[۴] **ایمان**: "وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَ واهُدًى (مريم /٧٤) "اللہ ایمان والوں کی ہدایت (قوت ایمانی) بڑھاتا ہے۔"

[۵] **دعوت**: "وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ" (الرعد/٧)"اور ہر قوم کا ہادی (داعی)۔" "وَجَعَلْنٰهُمْ أئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا" (ألانبياء/٧٣) "اور ہم نے انھیں پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں۔"(دعوت حق دیتے ہیں)

[٦] **رُسُل اور کُتُب**: "فَاِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى " (ألبقرة /٣٨، طه/ ١٢٣) "تو اگر تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے۔(رسول اور کتابیں آئیں)"

[۷] **معرفت**: "وَبِالنَّجمِ هُمْ يَهْتَدُوْ نَ (النحل/١٦)"اور وہ ستاروں ہی سے ہدایت پاتے ہیں۔"(یعنی سیدھی راہ کی پہچان کرتے ہیں)

[۸] **نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم**: اِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدَىٰ" (البقرة/١٥٩) "بے شک جو لوگ ہماری اتاری ہوئی روشن آیتوں اور ہدایت (نبی) کو چھپاتے ہیں۔"

[۹] **قرآن**: "وَلَقَدْ جَاءَ هُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدَىٰ"(النجم/٢٣)"بے شک ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آئی" (قرآن آیا)

[۱۰] **توریت**: "وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسَى الهُدَىٰ "غافر/٥٣)"بے شک ہم نے موسی کو ہدایت (توریت) عطا فرمائی۔"

[۱۱] **اِستر جاع**:(اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کہنا) "وأُولٰئِكَ هُمُ المُهتَدُون" (البقرة/١٥٦) "اور وہی ہدایت پانے والے ہیں۔" یہاں مصیبت پر استر جاع کو ہدایت قرار دیا گیا ہے۔

[۱۲] **حجت:** "أَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَاجَّ اِبْرٰهِیْمَ فِیْ رَبِّهٖ "[۱] کے بعد "لَایَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ " (البقرۃ/۲۵۸) "اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا یعنی انھیں حجت کی راہ نہیں دکھاتا۔"

[۱۳] **توحید:** "وَقَالُوااِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰی نُتَخَطَّفْ مِنْ أَرْضِنَا "(القصص/۵۷) "اور کہتے ہیں اگر ہم تمھارے ساتھ ہدایت (توحید) کی پیروی کریں تو لوگ ہمارے ملک سے ہمیں اچک لے جائیں گے۔"

[۱۴] **سنت** (طریقہ) "فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ " (الأ نعام/۹۰) "ان ہی کی ہدایت (سنت) کی پیروی کر۔" "وَاِنَّا عَلٰی اٰثَارِهِم مُّهْتَدُوْنَ "(أ لزخرف/ ۲۲) "بیشک ہم ان کے نشانہائے قدم پر چلنے والے یعنی ان کے طریقے کی پیروی کرنے والے ہیں۔"

[۱۵] **اصلاح:** "أَنَّ اللهَ لَا یَهْدِیْ کَیْدَ الْخَائِنِیْنَ " (یوسف/ ۵۳) "اللہ خیانت کرنے والوں کا مکر ٹھیک نہیں کرتا یعنی اسے کامیاب نہیں ہونے دیتا۔"

[۱۶] **اِلہام:** (دل میں ڈال دینا اور سکھا دینا) "قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْ أَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ فَهَدٰی "(طٰہٰ/ ۵۰) " کہا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے لائق صورت دی، پھر راہ دکھائی یعنی ہر مخلوق کو حصول رزق کا طریقہ سکھا دیا۔"

[۱۷] **توبہ:** "اِنَّاهُدْنَااِلَیْكَ "(الأ عراف/۱۵۶) "بے شک ہم تیری طرف رجوع لائے یعنی ہم نے تیری بارگاہ میں توبہ کی۔" ("هُدْنَا"،هدیً سے نہیں بلکہ "هَوْدٌ" سے ہے۔ اس لیے یہ مثال یہاں درست نہیں، مترجم)

[۱۸] **اِرشاد:** "عَسٰی رَبِّیْ أَنْ یَّهْدِیَنِیْ سَوَاءَ السَّبِیْلِ "(ألقصص/ ۲۲) "کہا قریب ہے کہ میرا رب مجھے سیدھی راہ بتائے۔"

لفظِ " سُوْءٌ "بھی چند وجوہ پر آتا ہے۔

[۱] **شدت:** یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ "(ألبقرۃ/۴۹) "وہ تمھیں سخت عذاب کا مزہ چکھاتے ہیں۔"

[۲] **عَقْر** (کونچیں کاٹنا): " وَ لَا تَمَسُّوْهَابِسُوْءٍ" (ألأعراف/۷۳) "اسے کسی برائی کے ساتھ مس نہ کرنا" (اس کی کونچیں نہ کاٹنا)۔

[۳] **زنا:** "وَمَاجَزَاءُ مَنْ اَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوْءًا " (یوسف/۲۵) "اس کی کیا سزا جو تیری بیوی کے ساتھ برائی (زنا) کا اردہ کرے۔" " مَاکَانَ أَبُوْكِ امْرَءَ سُوْءٍ "(مریم/۲۸) "تیرا باپ

[۱] اے محبوب کیا تم نے نہ دیکھا تھا اسے جو ابراہیم سے جھگڑا اس کے رب کے بارے میں۔

کوئی برا آدمی (زنا کار) تو نہ تھا۔"

[۴] **برص** (سفید کوڑھ) "أُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوْءٍ" (القصص/ ۳۲) "اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال، نکلے گا سفید چمکتا بغیر کسی برائی (برص) کے۔"

[۵] **شرک**: "مَاكُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْءٍ" (النحل/۲۸) "ہم کوئی برائی (شرک) نہیں کرتے تھے۔"

[۶] **قتل اور شکست**: "لَمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْءٌ" (اٰل عمران/ ۱۷۴) "انھیں کوئی برائی نہ پہنچی" (وہ قتل اور شکست سے دوچار نہیں ہوئے)

[۷] **عذاب**: "اِنَّ الخِزْيَ اليَوْمَ وَالسُّوْءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ" (النحل/۲۷) "بے شک آج رسوائی اور برائی (عذاب) کافروں پر ہے۔"

## لفظِ "صلوۃ" کی متعدد وجوہ

[۱] **نماز پنج گانہ**: "يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ" "نماز پنج گانہ قائم رکھتے ہیں۔

[۲] **نماز عصر**: "تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلٰوۃِ" (المائدۃ/ ۱۰۴) "ان دونوں کو نماز (یعنی نماز عصر) کے بعد روکو۔"

[۳] **نماز جمعہ**: "اِذَا نُوْدِىَ لِلصَّلٰوۃِ" (الجمعة/ ۵۲) "جب نماز (یعنی نماز جمعہ) کے لیے اذان کہی جائے۔"

[۴] **نماز جنازہ**: "وَلَا تُصَلِّ عَلٰى أَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ أَبَدًا" (التوبة/۸۴) "اور ان میں سے کسی میت پر کبھی نماز نہ پڑھنا۔"

[۵] **دعا**: "وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ" (التوبة/۱۰۳) "ان کے لیے دعا کرو، بے شک تمھاری دعا ان کے لیے دلوں کا چین ہے۔"

[۶] **دِین**: "أَصَلٰوتُكَ تَأْمُرُكَ" (هود/ ۸۷) "کیا تمھاری نماز (تمھارا دین) تمھیں حکم دیتی ہے۔"

[۷] **قراءت** (قرآن پڑھنا): "وَلَا تَجْهَرْ بِصَلٰوتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا" (الاسراء/۱۱۰) "اور اپنی نماز (قراءت) نہ بہت آواز سے پڑھو نہ بالکل آہستہ۔"

[۸] **رحمت واستغفار**: "اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ" (الأحزاب/ ۵۶) "بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔" (اللہ رحمت نازل فرماتا ہے، اور فرشتے استغفار کرتے ہیں)

## لفظِ "رحمۃ" کی چند وجہیں

[۱] **اسلام**: جیسے "یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَاءُ "(البقرۃ/۱۰۵)،آل عمران/ ۷۴) "وہ اپنی رحمت (اسلام) سے جسے چاہتا ہے خاص فرماتا ہے۔"

[۲] **ایمان**: "وَاٰتٰنِیْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ "(ھود/۲۸)"اور اس نے مجھے اپنے پاس سے رحمت (ایمان) بخشی۔" (تفسیروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں مثالوں میں "رحمت" سے "نبوت ورسالت" مراد ہے۔۱۲،مترجم)

[۳] **جنت**: "فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ "(آل عمران/۱۰۷) "وہ اللہ کی رحمت (جنت) میں ہمیشہ رہیں گے۔"

[۴] **بارش**: "وهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ " (الأعراف/۵۷) "وہی ہے جو اپنی رحمت (بارش) سے پہلے خوش خبری دینے والی ہوائیں بھیجتا ہے۔"

## لفظِ "فتنہ" کی چند وجہیں

[۱] **شرک**: "وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ " (البقرۃ/۱۹۱)"اور ان کا فتنہ (شرک) ان کے قتل سے بھی زیادہ سخت ہے۔"

[۲] **اِضلال** (گمراہ کرنا): "ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ " (آل عمران /۷) "فتنہ (گمراہ گری) کی خواہش میں۔"

[۳] **قتل**:"وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْأَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ أَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا " (النساء/۱۰۰)"اور جب تم زمین میں سفر کرو تو نماز قصر پڑھنے میں تم پر کوئی حرج نہیں اگر تمھیں یہ خوف ہو کہ دشمن تمھیں فتنے (قتل) میں ڈال دیں گے۔"

[۴] **معذرت**:ثُمَّ لَمْ یَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّا أَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِیْنَ" (الأنعام/۲۳) "پھر ان کی بناوٹ (معذرت) نہ رہی مگر یہ کہ بولے ہمیں اپنے رب اللہ کی قسم کہ ہم مشرک نہ تھے۔"

[۵] **قضا**:(فیصلۂ الٰہی)" اِنْ هِیَ اِلَّا فِتْنَتُكَ " (الأعراف/ ۱۵۵) "یہ تیری ہی قضا (فیصلہ) ہے۔"

[۶] **بیماری**: "یُفْتَنُوْنَ فِیْ كُلِّ عَامٍ" "وہ ہر سال فتنے (بیماری) میں مبتلا کیے جاتے ہیں۔" (التوبۃ/۱۲۶)

[۷] **عبرت**: "لَاتَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ " (یونس /۸۵)"ہم کو ظالموں کے لیے فتنہ (عبرت) نہ بنا۔"

## لفظِ "روح" کی چند وجوہ

[۱] **امر**: "اِنَّمَا الۡمَسِیۡحُ عِیۡسَی بۡنُ مَرۡیَمَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ وَکَلِمَتُهٗ اَلۡقَاهَااِلٰی مَرۡیَمَ وَرُوۡحٌ مِّنۡهُ" (النساء/ ۱۷۱) "مریم کے بیٹے عیسیٰ مسیح، اللہ کے رسول اور اس کا وہ کلمہ ہیں جسے اللہ نے مریم کو پہنچایا اور اس کی ایک روح (ایک امر) ہیں۔"

[۲] **وحی**: "یُنَزِّلُ الۡمَلٰئِکَةَ بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِهٖ" (النحل/ ۲) "وہ اپنے حکم سے روح (وحی) کے ساتھ فرشتوں کو اتارتا ہے۔"

[۳] **قرآن**: "أَوۡحَیۡنَا اِلَیۡكَ رُوۡحًا مِّنۡ أَمۡرِنَا" (الشوری/ ۵۲) "ہم نے تمھیں وحی بھیجی ایک جاں فزا چیز (قرآن) اپنے حکم سے۔"

[۴] **جبریل**: "فَأَرۡسَلۡنَا اِلَیۡهَا رُوۡحَنَا" (مریم/ ۱۷) "ہم نے مریم کے پاس اپنی روح (جبریل) کو بھیجا"

[۵] **بدن کی روح**: "وَیَسۡئَلُوۡ نَكَ عَنِ الرُّوۡ حِ" (الِاسراء /۸۵) "اور تم سے لوگ روح بدن کے بارے میں پوچھتے ہیں۔"

## لفظِ "ذکر" کے وجوہ

[۱] **ذکرِ لسانی**: "فَاذۡکُرُوااللّٰهَ کَذِکۡرِکُمۡ اٰ بَاءَ کُمۡ" (البقرۃ /۲۰۰) "اپنے باپ دادوں کے ذکر کی طرح زبان سے اللہ کا ذکر کرو۔"

[۲] **یاد کرلینا**: "وَاذۡ کُرُ وۡامَافِیۡهِ" (البقرۃ/ ۶۳) "اور اس (توریت) کے مضمون یاد کرو۔"

[۳] **طاعت اور جزا**: "فَاذۡ کُرُوۡنِيۡ أَذۡ کُرۡکُمۡ" (البقرۃ /۱۵۲) "تم میرا ذکر کرو میں تمھارا ذکر کروں گا یعنی تم میری اطاعت کرو میں تمھیں جزا دوں گا۔"

[۴] **حدیث (خبر)**: "اذۡ کُرۡ نِيۡ عِنۡدَ رَبِّكَ" (یوسف/ ۴۲) "تم اپنے آقا کے سامنے میرا ذکر کرو یعنی تم میرے حال سے اپنے آقا کو باخبر کردو۔"

[۵] **قرآن**: "وَمَنۡ أَعۡرَضَ عَنۡ ذِکۡرِیۡ" (طٰهٰ/ ۱۲۴) "اور جو میرے ذکر (قرآن) سے اعراض کرے۔"

[۶] **شرف و علوِّ مرتبت**: "وَاِنَّهٗ لَذِکۡرٌ لَّكَ" (الزخرف /۴۴) "اور بے شک وہ ذکر (شرف) ہے تمھارے لیے۔"

[۷] **عیب**: "أَهٰذَا الَّذِیۡ یَذۡکُرُاٰلِهَتَکُمۡ" (الأنبیاء /۳۶) "کیا یہی تمھارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے۔"

[۸] **لوحِ محفوظ**: "مِنۡ بَعۡدِالذِّكۡرِ" (الأنبياء/ ١٠٥) "ذکر (لوح محفوظ) کے بعد۔"

[۹] **ثنا**: "وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيۡرًا" (الأحزاب/ ٢١) "اللہ کا ذکر یعنی اس کی تعریف وثنا خوب کی۔"

[۱۰] **نماز**: "وَلَذِكۡرُ اللّٰهِ أَكۡبَرُ" (العنكبوت/ ٩٥) "اور بے شک اللہ کا ذکر (نماز) عظیم تر ہے۔"

## فَوَائِدُ

ابنِ فارس نے "کتاب الافراد" میں کہا: قرآن میں جہاں بھی لفظِ "أسف" مذکور ہے وہاں وہ "غم" کے معنیٰ میں ہے۔سوائے "فَلَمَّا اٰسَفُوۡنَا" (زخرف/٥٥) کے کہ یہاں اس کا معنیٰ ہے: "جب انھوں نے ہمیں غضبناک کیا۔"

قرآن میں جس جگہ بھی لفظِ "بُرُوۡج" کا ذکر ہے وہاں وہ "کواکِب" (ستاروں) کے معنیٰ میں ہے سوائے "وَلَوۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ بُرُوۡجٍ مُّشَيَّدَةٍ" (النساء/٧٨)[۱] کے کہ یہاں اس سے لمبے اور مضبوط و مستحکم قلعے مراد ہیں۔

قرآن میں جس مقام پر بھی "الۡبَرّ وَالۡبَحۡر" کا ذکر ہوا وہاں "بَحر" سے مراد "پانی" اور "بَر" سے مراد "خشک زمین" ہے سوائے "ظَهَرَ الۡفَسَادُ فِى الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ" (الروم/٤١)[۲] کے کہ یہاں "بر" سے مراد "جنگل اور آبادی" ہے۔

قرآن میں جس جگہ بھی لفظِ "بَعۡل" وارد ہے وہاں وہ "شوہر" کے معنیٰ میں ہے بجز "أَتَدۡعُوۡنَ بَعۡلًا" (الصافات/ ١٢٥)[۳] کے کہ یہاں "بعل" سے مراد ایک "بت" ہے جس کا نام بعل تھا۔

قرآن میں جہاں بھی "الدَّحۡض" وارد ہے وہاں اس کا معنیٰ "باطل" ہے سوائے "فَكَانَ مِنَ الۡمُدۡحَضِيۡنَ" (الصافات/ ١٤١) کے کہ یہاں اس کے معنیٰ ہیں: وہ قرعہ میں مغلوب ہوجانے (ہارجانے) والوں میں ہوگیا۔

قرآن میں جس مقام پر بھی لفظِ "رَجۡم" مذکور ہے وہاں وہ "قتل" کے معنیٰ میں ہے بجز "لَأَرۡجُمَنَّكَ" (مریم/ ٤٦) کے کہ یہاں اس کا معنیٰ ہے "میں ضرور تجھے گالی دوں گا"۔ اور "رَجۡمًا بِالۡغَيۡبِ" (الکهف/٢٢)[٤] کے کہ یہاں "گمان" کے معنیٰ میں ہے۔

قرآن میں جس مقام پر بھی مقتولین کے علاوہ کسی اور کے لیے "شَهِيۡد" کا لفظ آیا ہے وہاں اس

---

[۱] پوری عبارت اس طرح ہے: اَيۡنَمَا تَكُوۡنُوۡا يُدۡرِكۡكُّمُ الۡمَوۡتُ وَلَوۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ بُرُوۡجٍ مُّشَيَّدَةٍ: تم جہاں کہیں ہو موت تمھیں آلے گی اگرچہ مضبوط قلعوں میں ہو۔[۲] خشکی وتری میں خرابی ظاہر ہوئی۔[۳] پوری عبارت یوں ہے۔اتدعون ... وَتَذَرُوۡنَ اَحۡسَنَ الۡخَالِقِيۡنَ: کیا بعل کو پوجتے ہو اور سب سے اچھا پیدا کرنے والے کو چھوڑتے ہو۔[۳] پوری عبارت یوں ہے: سَيَقُوۡلُوۡنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمۡ كَلۡبُهُمۡ وَيَقُوۡلُوۡنَ خَمۡسَةٌ سَادِسُهُمۡ كَلۡبُهُمۡ رَجۡمًا بِالۡغَيۡبِ: اب کہیں گے کہ وہ تین ہیں چوتھا ان کا کتا اور کچھ بے دیکھے اٹکل سے کہیں گے پانچ ہیں چھٹا ان کا کتا۔

کا معنی ''گواہ'' ہے سوائے ''وَادْعُوْا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔''(البقرة/ ۲۳[۱])
کے کہ یہاں ''شرکا'' کے معنی میں ہے، یعنی وہ اصنام جنھیں مشرکین خدا کا شریک ٹھہراتے تھے۔

قرآن میں جہاں بھی ''أَصْحٰبُ النَّارِ'' وارد ہے وہاں اس سے مراد ''اہل نار'' ہیں سوائے ''وَمَا جَعَلْنَا اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰئِكَةً'' (المدثر/۳۱[۲]) کے کہ یہاں اس سے ''جہنم کے داروغے'' مراد ہیں۔

ہر لفظ ''نبأ'' ''خبر'' کے معنی میں ہے سوائے ''فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَاءُ'' القصص/٦٦[۳]'' کے کہ یہاں اس سے مراد ''دلائل و حجج'' ہیں۔

ابنِ خالویہ نے کہا: قرآن میں صرف ایک مقام یعنی ''وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ'' (الانبیاء/۱۰۵[٤]) پر ''بَعْد''، ''قَبْل'' کے معنی میں ہے۔ (یہ ابن خالویہ کا قول ہے۔ لیکن عامۂ مفسرین کے مطابق ذکر بمعنیٰ توریت یا لوح محفوظ ہے۔ اور ''بعد'' اپنی اصل پر ہے۔ ۱۲، مترجم)

مغلطائی نے اپنی کتاب ''المیسر'' میں کہا: ہم نے ایک اور مقام یعنی اللہ تعالیٰ کے ارشاد ''وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا''(النازعات/۳۰) میں ''بعد'' بمعنی ''قبل'' پایا ہے۔ ''اور اس سے پہلے اس نے زمین کو پھیلایا''۔

ابوموسیٰ نے بھی اپنی کتاب ''المغیث'' میں کہا: یہاں ''بعد'' کا معنی ''قبل'' ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو دو دنوں میں پیدا فرمایا، پھر آسمان کا قصد فرمایا۔ اس لیے اس تقدیر پر آسمان کی تخلیق سے پہلے اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا فرمایا۔ (یہ بیان بھی ایک قول کے پیش نظر ہے۔ ورنہ بہت سے مفسرین آسمان کی تخلیق زمین سے پہلے مانتے ہیں۔ ۱۲، مترجم)

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی اس نوع سے کسی قدر تعرض فرمایا ہے۔ چناں چہ امامِ احمد اپنی ''مسند'' میں اور ابن ابی حاتم وغیرہما بطریق دراج، ابوالہیثم سے اور یہ حضرت ابوسعید خدری سے، اور یہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، حضور نے فرمایا: قرآن میں جہاں بھی لفظ ''قُنُوْت'' مذکور ہے اُس سے مراد ''طاعت'' ہے۔

اس حدیث کی سند جیّد ہے۔ اور ابن حبان اسے صحیح قرار دیتے ہیں۔

ابن ابی حاتم نے بطریق عکرمہ، حضرت ابن عباس سے روایت کی، انھوں نے کہا: قرآن میں جہاں بھی ''أَلِيْم'' وارد ہے وہاں ''دردناک والم رساں'' کے معنی میں ہے۔

---

[۱] اور اللہ کے سوا اپنے ان معبودوں کو بلا لو جنھیں اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو۔ اگر تم سچے ہو۔ [۲] اور ہم نے جہنم کے داروغے، فرشتوں کو ہی مقرر کیا۔
[۳] تو (قیامت کے دن) ان پر خبریں یعنی دلیلیں مخفی رہ جائیں گی۔ [۴] اور بیشک ہم نے ذکر یعنی قرآن سے پہلے زبور میں لکھا۔

ابن ابی حاتم نے ہی بطریق علی بن ابی طلحہ، حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: قرآن میں "قُتِلَ" "لُعِنَ" کے معنی میں ہے یعنی جس پر لعنت کی گئی۔

انھوں نے ہی بطریق ضحاک، حضرت ابن عباس سے روایت کی۔ آپ نے فرمایا: کتاب اللہ میں ہر جگہ "رِجز" "عذاب" کے معنی میں ہے۔

فریابی نے کہا: ہم سے قیس نے حدیث بیان کی، وہ عمّار دُہنی سے، وہ سعید بن جبیر سے، وہ حضرت ابن عباس سے راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا: قرآن میں ہر جگہ لفظِ "تَسبِیح" "نماز" کے معنی میں اور لفظِ "سُلطَان" "حجت و دلیل" کے معنی میں ہے۔

ابن ابی حاتم نے بطریق عکرمہ، حضرت ابن عباس سے تخریج کی کہ آپ نے فرمایا: قرآن میں ہر جگہ لفظ "دِین" "حساب" کے معنی میں ہے۔

ابن ابی حاتم وغیرہ نے حضرت اُبی بن کعب سے تخریج کی۔ آپ نے فرمایا: قرآن میں ہر جگہ کلمۂ "رِیَاح" سے مراد "رحمت" اور "رِیح" سے مراد "عذاب" ہے۔

ابن ابی حاتم نے ہی ابو مالک سے تخریج کی۔ انھوں نے کہا: قرآن میں وارد ہر کلمۂ "وراء" "آگے" کے معنی میں ہے سوائے "فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ" (المؤمنون/۷[۱]) اور "أُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ" (النساء/۲۴[۲]) کے کہ یہاں "سوا اور علاوہ" کے معنی میں ہے۔

انھوں نے ہی ابو بکر بن عیّاش سے تخریج کی۔ انھوں نے کہا: قرآن میں "کِسْف" (بسکونِ سین) "عذاب" اور "کِسَفا" (بفتح سین) "بادل کے ٹکڑوں" کے معنی میں ہے۔

ابن جریر نے ابو رَوْق سے تخریج کی۔ انھوں نے کہا: قرآن میں ہر جگہ کلمۂ "جَعَلَ"، "خَلَقَ" (اس نے پیدا کیا) کے معنی میں ہے۔

صحیح بخاری میں ہے، سفیان بن عُیَیْنَہ نے کہا: قرآن میں صرف عذاب کی بارش کے لیے "مطر" آیا ہے اور عرب رحمت کی بارش "غیث" کو بھی "مطر" کہتے ہیں۔

امام سیوطی نے کہا: "اِنْ كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّنْ مَّطَرٍ" (النساء/۱۰۲[۳]) اس سے مستثنیٰ ہے کیوں کہ اس سے مراد قطعی طور پر "غیث" (مفید بارش) ہے۔

ابو عبیدہ نے کہا: جب لفظ "مطر" "عذاب" میں وارد ہو تو "اُمْطِرَتْ" اور "رحمت" میں وارد

---

[۱] تو جوان دو یعنی بیویوں اور باندیوں کے سوا کچھ اور چاہے، وہی حد سے بڑھنے والا ہے۔ [۲] تمھارے لیے ان کے سوا عورتیں حلال کی گئیں۔

[۳] پوری عبارت یوں ہے: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ: اور تم پر مضایقہ نہیں اگر تمھیں مینہ کے سبب تکلیف ہو یا بیمار ہو کہ اپنے ہتھیار کھول رکھو۔

ہو تو "مَطَرَتْ" آتا ہے۔

ابوعبیدہ نے ہی سفیان بن عیینہ سے تخریج کی۔انھوں نے کہا: جب قرآن میں "وَمَا يُدْرِيكَ" آئے تو مطلب ہوگا "حضور کو باخبر نہیں کیا گیا" اور جب "وَمَا أَدْرَاكَ" آئے تو مطلب ہوگا کہ "حضور کو باخبر کردیا گیا۔"

میں کہتا ہوں ان علما نے اپنے قول "فلاں فلاں لفظ قرآن میں جہاں بھی وارد ہے فلاں فلاں معنی میں ہے" سے جن مسائل کا ذکر کیا ہے اُن میں سے اکثر وہ ہیں جو کلی نہیں بلکہ اکثری ہیں۔ اس لیے کہ اس مقام میں کچھ امور وہ بھی ہیں جو قابل استثنا ہیں۔

## اِعرابِ قرآن کی معرفت

ابوعبید نے اپنے "فضائل" میں حضرت عمر بن خطّاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تخریج کی۔آپ نے فرمایا: تم جس طرح قرآن سیکھتے ہو اُسی طرح عربی زبان اور فرائض وسنن کا علم بھی حاصل کرو۔

ابوعبید نے ہی یحییٰ بن عتیق سے تخریج کی۔انھوں نے کہا: میں نے حسن بصری سے پوچھا، ابوسعید! ایک شخص عربی زبان اس لیے سیکھتا ہے کہ اسے خوش گفتاری آجائے اور اس کی قراءت درست ہوجائے؟ انھوں نے جواب دیا: جانِ برادر! یہ اچھی بات ہے اور تم اس مقصد کے حصول کے لیے عربی زبان سیکھو کیوں کہ ایک شخص ایک آیت پڑھتا ہے لیکن اُسے صحیح طور پر ادا کرنے سے عاجز رہتا ہے اور اسی میں ہلاک ہوجاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی کتاب میں فکر وتدبُّر اور اس کے رُموز واَسرار سے نقاب کشائی کے لیے ضروری ہے کہ کلمہ، اس کے صیغہ اور اس کے محل مثلاً مبتدا یا خبر یا فاعل یا مفعول ہونے، یا مَبَادِی کلام یا جواب وغیرہ میں غور کیا جائے۔اسی کے ساتھ مندرجہ ذیل امور کی رعایت بھی لازم ہے۔

[۱] پہلی لازمی بات یہ ہے کہ آدمی کسی لفظ کا اعراب بتانے یعنی نحوی ترکیب کرنے سے پہلے اس لفظ کے معنی سمجھ لے خواہ وہ لفظ مفرد ہو یا مُرکَّب۔کیوں کہ اعراب معنی کی فرع ہے اِسی لیے جب ہم یہ کہیں کہ فَوَاتِحِ سُوَر (کچھ سورتوں کے شروع میں مذکور حروف مقطّعات) اُس مُتَشَابِہ کی قبیل سے ہیں جس کا علم صرف اللہ کو ہے تو ان کا اعراب ذکر کرنا جائز نہ ہوگا۔

ابن ہشام نے کہا: قرآن کا اعراب (نحوی ترکیب) بیان کرنے والے بہت سے لوگوں کے قدم اس لیے پھسل گئے کہ انھوں نے بیانِ اعراب میں، ظاہر لفظ کی تو رعایت کی مگر معنی کے تقاضے پر غور نہ کیا۔اس کی مثال یہ ارشاد ہے: " أَصَلٰوتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا أَوْ أَنْ نَفْعَلَ فِيْ أَمْوَالِنَا مَا نَشَاۗءُ " (ھود/ ۸۷) "(بظاہر اس کے معنی ہیں) کیا تمھاری نماز تمھیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہم

اپنے باپ داداؤں کے معبودوں سے دست بردار ہو جائیں یا یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے مالوں میں جو چاہیں تصرف کریں۔"

کیوں کہ فوری طور پر ذہن میں یہی بات آتی ہے کہ "أنْ نَفْعَلَ" ، "أنْ نَتْرُكَ" پر معطوف ہے، حالاں کہ یہ باطل ونادرست ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ حکم نہیں دیا تھا کہ وہ اپنے مال میں جو چاہیں تصرف کریں۔ بلکہ "أن نفعل" ، "ما يعبُد "میں آئے ہوئے لفظ "ما" پر معطوف ہے اِس طرح "ان نفعل" ، "نترك" فعل کا معمول ہے۔ اب معنی ہوں گے: کیا تمھاری نماز تمھیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہم انھیں چھوڑ دیں جن کو ہمارے باپ دادے پوجتے تھے یا اپنی منشا کے مطابق اپنے مالوں میں تصرف کرنا چھوڑ دیں۔

وہم مذکور کا سبب یہ ہے کہ اعراب بیان کرنے والا دوبار "أن "اور "فعل" کو اور دونوں کے درمیان حرفِ عطف کو دیکھتا ہے تو خیال کر بیٹھتا ہے کہ دوسرا پہلے پر عطف ہے۔

[۲] ایسے امور کی رعایت کرے جن کا علمِ نحو متقاضی ہو۔ چناں چہ کبھی اعراب بیان کرنے والا کسی "وجہِ صحیح" کا لحاظ کر کے ترکیب کرتا ہے مگر علم نحو کے اعتبار سے اس کی صحت پر غور نہ کرنے کے سبب غلطی کر بیٹھتا ہے۔

اسی سے ہے " وَثَمُوْدَ فَمَا أَبْقَىٰ " (النجم / ۵۱[۱]) میں بعض علما کا یہ کہنا کہ "ثمود"، "أبقى" کا مفعولِ مُقَدَّم ہے جب کہ نحو کی رو سے یہ نا جائز ہے کیوں کہ "ف" کے بعد "ما" نافیہ صدرِ کلام میں ہے اس لیے "ما" کا مابعد اس کے ماقبل میں عمل نہ کرے گا، لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ کے قول "وَأَهْلَكَ عَادًا الْأُولَىٰ "(النجم /۵۰[۲]) میں مذکور "عادًا" پر معطوف ہے یا "وَأَهْلَكَ ثَمُوْدَ" کی تقدیر پر ہے۔

اسی طرح بعض دوسرے علما "مَلْعُوْنِيْنَ أَيْنَمَا ثُقِفُوْا اُخِذُوْا" (الأحزاب / ۶۱[۳]) میں کہتے ہیں کہ "ملعونين" ، "ثُقِفُوا اور أُخِذُوا" کے معمول سے حال ہے۔ لیکن ان کا یہ قول درست نہیں ہے کیوں کہ 'أينما "شرط کے لیے صدر کلام ضروری ہے بلکہ یہ "منصوب بر ذم" ہے۔

[۳] بعید امور، کمزور وجوہ اور شاذ لغات پر تخریجِ اعراب سے پرہیز کرے اور امرِ قریب، وجہ قوی اور لغت فصیحہ پر تخریج کرے۔ لیکن اگر کہیں وجہ بعید کے سوا کوئی اور صورت نہ بنتی ہو تو وہ معذور ہے۔ اور اگر نادر وغریب باتیں لانے اور زیادہ وجہیں پیدا کرنے کے مقصد سے سب کا ذکر کرے تو ایسا کرنا سخت دشواری سے خالی نہیں اور اگر احتمالی وجہیں بتانے اور طالب علم کو مشق کرانے کے لیے ایسا

[۱] اور ثمود کو (ہلاک فرمایا) تو کسی کو باقی نہ چھوڑا۔ [۲] اسی نے پہلی عاد کو ہلاک فرمایا۔ [۳] پھٹکارے ہوئے جہاں کہیں ملیں پکڑے جائیں۔

کرے تو قرآن کے علاوہ کسی اور کلام میں یہ اچھا طریقہ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے کلام میں ایسی ہی وجہ پر تخریج کا جواز ہے جس کے مراد ہونے کا ظنِ غالب ہو۔ اور اگر کسی وجہ کا غلبۂ ظن نہ ہو تو تمام محتمل وجوہ کا ذکر کرے، لیکن کسی ایسی وجہ پر حمل نہ کرے جس پر دلالت ظاہر نہ ہو۔ اسی لیے "فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا" (البقرة / ١٥٨ [١]) میں "جناح" پر وقف اور "عليه" کے اغرا (برانگیختہ کرنے) کے لیے ہونے کے قائل کو خطاوار قرار دیا گیا کیوں کہ غائب کا اغرا ضعیف ہے۔

اسی طرح اس قائل کی بھی تغلیط ہوئی جس نے "تَمَامًا عَلَى الذِیْ أَحْسَنَ" [٢] (ألأنعام/١٥٤) میں قراءت شاذّہ "أَحْسَنُ" مرفوع کے بارے میں کہا کہ اس کی اصل "أَحْسَنُوْا" ہے۔ ضمہ پر اکتفا کے سبب واو کو حذف کر دیا گیا۔ یہ غلط اس لیے ہے کہ اس طرح کا اکتفا اشعار میں ہوا کرتا ہے نثر میں نہیں۔

درست یہ ہے کہ "أَحْسَنُ" مبتدائے مقدر "هو" کی خبر ہے۔ یعنی "هو أحسنُ"۔

یوں ہی "يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ" (الأحزاب / ٣٣)[٣] میں لفظ "أهل" کے اختصاص کی بنا پر منصوب ہونے کے قائل کو غلطی پر قرار دیا گیا ہے۔ کیوں کہ ضمیر مخاطب کے بعد اختصاص کا آنا ضعیف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ "أهل البيت" منادیٰ ہونے کے سبب منصوب ہے۔

[۴] ان تمام وجوہ ظاہرہ کو بے کم و کاست ذکر کرے جن کا لفظ احتمال رکھتا ہو۔ چناں چہ "وَسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَىٰ" (أعلیٰ/١[٤]) جیسی ترکیب میں تم کہہ سکتے ہو کہ "ألأعلیٰ" "الرَّبّ" کی بھی صفت ہو سکتا ہے اور "اسم" کی بھی صفت ہو سکتا ہے۔ اور "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ" (البقرة/٢[٥]) میں جائز ہے کہ "الذين"، "المتقين" کا تابع اور صفت ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ صفتِ مقطوعہ ہو۔ یعنی "أَعْنِیْ" یا "امدح" مقدر کا منصوب ہو یا "هم" مبتدائے مقدر کی خبر مرفوع ہو۔

[۵] رسم قرآن کی رعایت کرے۔ یہی وجہ ہے کہ "سَلْسَبِيْلًا" (الانسان/١٨[٦]) کو جملۂ امر یعنی "سَلْ سَبِيْلًا" (جنت میں لے جانے والی راہ کا سوال کر) قرار دینے والے کو خاطی کہا گیا۔ کیوں کہ اگر ایسا ہوتا جیسا اس قائل نے کہا تو "سل" اور "سبيلا" کو الگ الگ لکھا گیا ہوتا۔

کسی کا یہ کہنا بھی غلط اور باطل ہے کہ "قَالُوْا اِنَّ هٰذَانِ لَسَاحِرَانِ" (طٰهٰ/٦٣[٧]) بتشدید "اِنَّ"

---

[۱] تو اس پر کچھ گناہ نہیں کہ ان دونوں یعنی صفا و مروہ کے پھیرے کرے۔ [۲] آیت یوں شروع ہوتی ہے: ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْ اَحْسَنَ: پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا فرمائی پورا احسان کرنے کو اس پر جو نکوکار ہے۔ [۳] اے اہل بیت! اللہ چاہتا ہے کہ تم سے گندگی کو دور کر دے۔ [۴] اپنے رب کی پاکی بولو جو سب سے بلند ہے۔ [۵] (یہ کتاب) ان پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے جو بے دیکھے ایمان لاتے ہیں۔ [۶] پوری آیت اس طرح ہے: عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا : جنت میں ایک چشمہ ہے جسے سلسبیل کہتے ہیں۔ [۷] یہ دونوں ضرور جادوگر ہیں۔

امام نافع ،حمزہ، کسائی، ابن عامر اور ابوبکر شعبہ کی قراءت۔ یہ بھی قراءت متواترہ ہے) اصل میں "انها ذان لساحران" ہے۔ "ان" حرف مشبہ بالفعل اور "ذان" سے پہلے "ھا" ضمیر قصہ اس کا اسم ہے۔ پھر "ذان" مبتدا اور "لساحران" اس کی خبر ہے۔اور جملہ یعنی مبتدا اپنی خبر سے مل کر "ان" کی خبر ہے۔ وجہ بطلان یہ ہے کہ رسم قرآنی میں "ھا" "ان" سے جدا اور "ذان" سے متصل یعنی "ان هذان" لکھا ہے۔

اسی طرح " أَيُّهُمْ أَشَدُّ " (مریم / ۶۹[۱]) میں "هم" کو مبتدا، "أَشَدُّ" کو خبر اور "أَيُّ" کو مقطوع عن الاضافت کہنا بھی غلط اور باطل ہے۔کیوں کہ رسم قرآنی "أَيُّهُمْ" میں "أی" اور "هم" ایک ساتھ ملے ہوئے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ "أي" "هم" کی طرف مضاف ہے نہ کہ مقطوع عن الاضافت۔ یوں ہی وہ بھی غلطی پر ہے جس نے "وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ" (المطففین / ۳)[۲] میں کہا کہ "هم" ضمیر مرفوع منفصل، واو ضمیر بارز مرفوع متصل کی تاکید کے لیے ہے۔ یہ صحیح اس لیے نہیں ہے کہ رسم قرآن میں ان دونوں یعنی "کالوهم" اور "وزنوهم" میں واو جمع کے بعد الف نہیں ہے۔صحیح یہ ہے کہ "هم" مفعول بہ ہے۔

[۶] اللہ تعالیٰ کے کلام میں وارد کسی لفظ پر "زائد" ہونے کا اطلاق کرنے سے پرہیز کرے۔ کیوں کہ لفظ زائد بولنے سے کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کا کوئی معنی نہیں جب کہ کتاب اللہ مہمل اور بے معنی لفظ کے عیب سے پاک ہے۔اسی لیے بعض علما نے زائد کہنے کی جگہ تاکید، صلہ اور مقحم جیسے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔

ابن الخشّاب نے کہا: قرآن میں وارد کسی لفظ پر زائد کے اطلاق کے بارے میں علما کے درمیان اختلاف واقع ہوا۔اکثر حضرات اس بات کے پیش نظر جواز کے قائل ہیں کہ قرآن، عرب کی زبان میں، ان کے عرف کے مطابق نازل ہوا اور ان کی زبان وعرف میں کچھ الفاظ کو زائد کہا جاتا ہے۔ اس لیے زائد کا اطلاق صحیح و درست ہوگا۔اور اس لیے بھی یہ اطلاق درست ہوگا کہ لفظ زیادت، حذف کے مقابل ہے۔حذف، اختصار و تخفیف کے لیے ہوتا ہے۔اور زیادت تاکید وتمہید کے لیے۔ دونوں اپنے اپنے مقام پر صحیح اور فصیح ہیں۔

بعض علما زائد کا اطلاق صحیح نہیں مانتے۔وہ کہتے ہیں کہ جن الفاظ کو زائد کہا جاتا ہے وہ کچھ خاص فوائد ومعانی کے لیے آتے ہیں اس لیے ان کے زائد ہونے کا حکم نہیں کیا جا سکتا۔

ابن الخشاب نے مزید کہا: تحقیق یہ ہے کہ اگر "زیادت" سے مراد ایسے معنی کا اثبات ہو جس

---

[۱] پوری آیت یہ ہے: ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا: پھر ہم ہر گروہ سے نکالیں گے جو ان میں رحمٰن پر سب سے زیادہ بے باک ہوگا۔[۲] اور جب انھیں ناپ کر یا تول کر دیں تو کم کر دیں۔

کی کوئی حاجت نہیں تو یہ باطل ہے کیوں کہ یہ عبث ہے اور کلام الٰہی عبث سے منزہ و پاک ہے۔ لہٰذا متعین ہو گیا کہ قرآن میں جو بھی لفظ ، زائد آیا ہے ہمیں اس کی حاجت ہے۔ لیکن اشیا کی حاجت ، مقاصد کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے اس لیے عرب جس لفظ کو زائد مانتے ہیں اس کی حاجت ایسی نہیں ہے جیسی ''مزید علیہ'' کی ہے۔

امام سیوطی نے کہا: بلکہ مقتضائے فصاحت و بلاغت کے پیش نظر زائد اور مزید علیہ دونوں کی حاجت یکساں ہے۔

## تنبیہ

ابو عبید نے کہا: ہم سے حجاج نے اور ان سے ہارون بن موسی نے بیان کیا کہ مجھے زُبیر بن خُریث نے حضرت عکرمہ کے حوالے سے خبر دی کہ حضرت عکرمہ نے فرمایا: مصاحف کی کتابت مکمل ہو جانے کے بعد جب انھیں حضرت عثمان کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ کو ان میں کچھ ایسے الفاظ ملے جن میں اعرابی غلطی تھی۔ فرمایا: انھیں مت بدلو کیوں کہ عرب انھیں خود اپنی زبانوں سے بدل دیں گے یا فرمایا کہ عرب انھیں خود صحیح صحیح ادا کر لیں گے۔

ابن الانباری نے اپنی کتاب ''اَلردُّ علی مَن خَالَفَ مُصحَفَ عثمان '' اور ابن اشتہ نے اپنی کتاب ''کتاب المصاحف '' میں اس کی تخریج کی۔

پھر ابن الانباری نے عبد الاعلیٰ بن عبد اللہ بن عامر کے طریق سے بھی اسی کے مثل اور ابن اشتہ نے یحییٰ بن یعمر کے طریق سے بھی اسی کے مثل تخریج کی۔

ابن الانباری نے ہی بطریق ابی البشر، حضرت سعید بن جُبیر سے تخریج کی کہ وہ ''وَالۡمُقِيۡمِيۡنَ الصَّلٰوةَ '' پڑھتے اور کہتے کہ یہ کاتبوں کی غلطی ہے۔

یہ آثار بہت مشکل ہیں۔ اولاً صحابۂ کرام کے بارے میں کیسے یہ گمان کر لیا جائے کہ وہ کلام میں اعرابی غلطیاں کر سکتے ہیں چہ جائے کہ قرآن میں وہ ایسا کریں۔ حالاں کہ وہ فصحائے عرب ہیں۔ دوسرے ان کے متعلق کیسے یہ ظن قائم کر لیا جائے کہ وہ اس قرآن میں غلطی کریں گے جسے انھوں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ویسا ہی سیکھا جیسا وہ نازل ہوا۔ پھر انھوں نے اسے پورے حزم و احتیاط کے ساتھ اچھی طرح حفظ بھی کر لیا۔ تیسرے یہ گمان کیسے کر لیا جائے کہ انھوں نے غلط پر اور غلط کی کتابت پر اتفاق کر لیا۔ چوتھے یہ گمان کیسے کر لیا جائے کہ وہ اس غلطی پر متنبہ ہی نہ ہوئے تو اس سے رجوع کیسے کرتے۔ پھر یہ گمان کیسے کر لیا جائے کہ حضرت عثمان اس غلطی کو بدلنے اور درست کرنے سے منع کر دیں گے۔ پھر کیسے یہ خیال کر لیا جائے کہ قراءت قرآن اسی غلط طریقے پر ہمیشہ ہوتی رہی

حالاں کہ قرآن سَلَف سے خَلَف تک تواتر کے ساتھ مروی ہے۔ یہ عقل، شرع اور عادت تینوں اعتبار سے محال وناممکن ہے۔

علما نے اس کے چند جوابات دیے ہیں:

[۱] حضرت عثمان سے یہ ثابت نہیں۔ اس لیے کہ اس کی اِسناد، ضعیف، مضطرب اور منقطع ہے۔ اور اس لیے بھی کہ حضرت عثمان نے قرآن کریم کا ''امام'' نامی نسخہ اسی لیے مرتب کرایا تھا کہ لوگ اس کی اقتدا کریں۔ بنابریں وہ کیسے اس میں اعرابی غلطی دیکھنے کے باوجود اسے ویسے ہی چھوڑ دیں گے تاکہ عرب اس غلطی کو اپنی زبانوں سے درست کرلیں۔ پھر اس کے بعد یہ سوال اٹھے کہ جب قرآن کے جمع وکتابت کا اہتمام کرنے والوں نے اصلاح نہ کی حالاں کہ وہ ''خیار امت'' تھے تو دوسرے لوگ کیسے اس کی اصلاح کریں۔

یہ بھی خیال رہے کہ حضرت عثمان نے صرف ایک مصحف نہیں لکھوایا تھا بلکہ ''متعدد مصاحف'' لکھوائے تھے۔ اب اگر کہا جائے کہ غلطی تمام مصاحف میں واقع ہوئی تو اس پر سب کا اتفاق ناممکن ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ غلطی صرف بعض مصاحف میں ہوئی تو یہ بعض دوسرے مصاحف کی صحت کا اعتراف ہوا۔ لیکن کسی نے بھی یہ ذکر نہیں کیا ہے کہ غلطی بعض میں تھی بعض میں نہیں تھی۔ اگر مصاحف میں اختلاف تھا تو صرف وجوہ قراءت میں تھا۔ مگر یہ لَحن (اعرابی غلطی) نہیں۔

سب سے اچھا جواب یہ ہے کہ حضرت عثمان کے تعلق سے واردان آثار میں تحریف واقع ہوگئی ہے جس کا بیان سوار بن شبیب سے ابن اشتہ کے تخریج کردہ اس اثر سے ہوتا ہے جس میں سوار کے کہنے کے مطابق حضرت ابن زبیر نے فرمایا: ایک شخص نے حضرت عمر کے سامنے کھڑے ہوکر کہا: امیر المؤمنین! لوگوں نے قرآن میں اختلاف برپا کررکھا ہے۔ حضرت عمر نے اس شخص کی یہ بات سن کر ایک قراءت پر قرآن کو مُدوَّن وجمع کرنے کا ارادہ فرمالیا تھا لیکن اسی اثنا میں نیزہ کے وار سے زخمی ہوجانے کے سبب آپ کی وفات ہوگئی۔ پھر جب حضرت عثمان کی خلافت کا زمانہ آیا تو اسی شخص نے پھر آپ سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ حضرت عثمان نے مصاحف کو جمع کیا پھر مجھے حضرت عائشہ کے پاس بھیجا، میں مصحف لے کر آیا اور ہم نے مصاحف انھیں دکھا کر ان کی تصحیح کرلی۔ پھر حضرت عثمان کے حکم سے باقی مصاحف کو چاک کردیا گیا۔

ابن اشتہ نے اپنی سند سے حضرت عثمان سے تخریج کی کہ جب مصحف کی تدوین سے فراغت ہوگئی تو اسے حضرت عثمان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے اس کو نگاہ غور سے دیکھنے کے بعد فرمایا ''تم لوگوں نے اچھا اور خوب کام کیا'' میں اس میں کچھ دیکھ رہا ہوں جسے ہم اپنی زبانوں سے درست

کردیں گے۔

اس سے وہ کلمات مراد ہو سکتے ہیں جن میں رسم، خلاف تلفظ ہے۔ جیسے: الکتٰب، الصٰبرین، یا، لاْاوضعو ا، لاْا ذبحنّه وغیرہ۔ مگر ان سب کو اس لیے برقرار رکھا گیا کہ رسم قرآن توقیفی ہے۔ سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے عہد میں جس طرح کتابت کرائی تھی اس کی پیروی ضروری قرار پائی۔

## فائدہ

اس میں ان کلمات کا بیان ہوگا جو تین وجہوں سے اعراب یا بنا یا ایسی ہی کسی اور وجہ سے پڑھے گئے ہوں۔

حضرت علامہ احمد بن یوسف بن مالک رُعَینی کی اس موضوع پر ایک عمدہ تالیف ہے جس کا نام انھوں نے "تحفۃالأقران فیما قُرِئَ بالتثلیث من حروف القراٰن" رکھا ہے۔

ذیل میں اس کی چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں۔

[۱] "الحمد لله" قراءت متواترہ میں اِسے مبتدا ہونے کی تقدیر پر رفع کے ساتھ پڑھا گیا۔ شواذ میں مفعول مطلق ہونے کی بنا پر نصب اور دال کی حرکت کو "لله" کے لام مکسور کے تابع کردینے کی تقدیر پر کسرہ کے ساتھ پڑھا گیا۔

[۲] "رب العٰلَمین" قراءت متواترہ میں "رب" کو اسم جلالت کی صفت ہونے کی تقدیر پر جر کے ساتھ پڑھا گیا۔ شواذ میں صفت مقطوعہ کی تقدیر پر مبتدا مقدر مان کر رفع کے ساتھ، یا فعل "أَمْدَحُ" یا حرف ندا مقدر مان کر نصب کے ساتھ پڑھا گیا۔

[۳] "الرحمٰن الرحیم" کو تینوں وجہوں رفع، نصب اور جر کے ساتھ پڑھا گیا۔

[۴] "اثنتا عشرۃ عینا" میں "عشرۃ" لغت تمیم کے مطابق شین کے سکون، لغت حجاز کی رو سے کسرہ اور لغت بلی کے مطابق فتحے کے ساتھ پڑھا گیا۔

[۵] "بین المرء" قراءت متواترہ میں میم کے فتحہ کے ساتھ اور شواذ میں کسرہ اور ضمہ کے ساتھ پڑھا گیا۔ اس لفظ میں تینوں لغات ہیں۔

[۶] "ذُرِّيَّةٌ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ" (اٰل عمران/۳۴[۱]) میں "ذریة" کی ذال کو تینوں حرکتوں کے ساتھ پڑھا گیا۔ متواترہ میں ضمہ ہے۔ شواذ میں کسرہ وفتحہ بھی آیا ہے۔

[۷] "وَاتَّقُوااللهَ الذِیْ تَسَاءَ لُوْنَ بِه وَالْأَرْحَامَ" النساء/۱[۲]) متواترہ میں "الارحام" کو اسم جلالت پر معطوف ہونے کے سبب نصب پڑھا گیا۔ شواذ میں ضمیر "به" پر معطوف

---

[۱] یہ ایک نسل ہے ایک دوسرے سے۔ [۲] اور اللہ سے ڈرو جس کے نام پر مانگتے ہو اور رشتوں کا لحاظ رکھو۔

ہونے کے سبب جر اور مبتدا ہونے اور اس کی خبر کے محذوف ہونے کی بنا پر رفع کے ساتھ پڑھا گیا۔
تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: " وَالْأَرْحَامُ مِمَّا يَجِبُ أَنْ تَتَّقُوْهُ ،وَأَنْ تَحْتَاطُوْا لِأَنْفُسِكُمْ فِيْهِ "
'' قرابت داری اس قسم سے ہے جس سے ڈرنا اور جس کے متعلق احتیاط برتنا ضروری ہے۔''

[۸] "لَايَسْتَوِى الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ أُولِى الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَ أَنْفُسِهِمْ (النساء/۹۵[۱]) میں "غیر"، "قاعدون" کی صفت ہونے کی وجہ سے رفع کے ساتھ، "المؤمنین" کی صفت ہونے کی وجہ سے جر کے ساتھ اور استثنا کی بنا پر نصب کے ساتھ پڑھا گیا۔

[۹]" وَامْسَحُوْا بِرُؤُسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ "(المائدة /۶[۲]) میں "أرجلكم"، "الأيدى" پر معطوف ہونے کی وجہ سے منصوب ، "رؤسكم" سے قرب ومجاورت کی وجہ سے مجرور اور مبتدا ہونے کی تقدیر پر مرفوع پڑھا گیا ہے۔ مگر اِس صورت میں خبر محذوف ہوگی جس پر دلیل اس کا ماقبل ہے۔

## محکم، متشابہ

ارشاد باری تعالیٰ ہے:" هُوَ الَّذِىْ أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتٰبِ وَأُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ "( اٰل عمران/۷)"وہی ہے جس نے تم پر کتاب اتاری، اس کی کچھ آیتیں صاف معنیٰ رکھتی ہیں، وہ کتاب کی اصل ہیں۔ دوسری وہ ہیں جن کے معنیٰ میں اشتباہ ہے۔''

ابن حبیب نیشاپوری نے اس مسئلہ میں تین اقوال نقل کیے ہیں۔

[۱] پورا قرآن محکم ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: " كِتٰبٌ أُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ"(هود /۱ )"یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں محکم ہیں۔''

[۲] پورا قرآن متشابہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:"أَللّٰهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشٰبِهًا مَّثَانِىَ" (الزمر/۲۳)"اللہ نے اتاری سب سے اچھی کتاب کہ اول سے آخر تک متشابہ ہے، دوہرے بیان والی۔''

[۳] شروع میں مذکور آیت کریمہ کی رو سے صحیح یہ ہے کہ قرآن کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) محکم (۲) متشابہ اور پہلی دو آیتوں کا جواب یہ ہے کہ "اِحْكَام" سے مراد ہے'' قرآن کا ہر طرح کے نقص و عیب سے پاک اور درجۂ کمال پر فائز ہونا اور اس میں کسی طرح کی کمی یا اختلاف کا راہ نہ پانا'' اور "تَشَابُه" کا مطلب ہے:'' حقانیت، راست گوئی اور اعجاز میں پورے قرآن کا باہم یکساں ہونا''

---

[۱] برابر نہیں وہ مسلمان کہ بے عذر جہاد سے بیٹھ رہیں اور وہ کہ راہ خدا میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں۔
[۲] اور اپنے سروں اور پیروں کو دھوؤ۔

## محکم اور متشابہ کی تعیین وتعریف میں بھی مختلف اقوال ہیں:

[۱] **محکم**: وہ ہے جس کی مراد معلوم ہو، خواہ اس طرح کہ وہ خود ظاہر ہے یا تاویل کے بعد اس کی مراد ظاہر ہو چکی ہے۔

**متشابہ**: وہ ہے جس کے علم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے یعنی جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ جیسے: قیامت کا قائم ہونا، دجال کا نکلنا اور اوائل سور میں حروف مقطعات۔

[۲] **محکم**: وہ ہے جس کا معنی واضح و غیر مبہم ہو۔

**متشابہ**: وہ ہے جو اس کے برعکس ہو۔

[۳] **محکم**: وہ ہے جس میں صرف ایک وجہ تاویل ہو۔

**متشابہ**: وہ ہے جو کئی وجوہ تاویل کا احتمال رکھتا ہو۔

[۴] **محکم**: وہ ہے جس کا معنی سمجھ میں آئے۔

**متشابہ**: وہ ہے جس کا معنی سمجھ میں نہ آئے۔ جیسے نمازوں کی تعداد، فرض روزے کا رمضان کے ساتھ خاص ہونا شعبان میں نہ ہونا۔

اس کے قائل قاضی ماوردی ہیں۔

[۵] **محکم**: وہ ہے جو مستقل بنفسہ ہو۔ یعنی جس کا معنی خود لفظ سے سمجھ میں آجائے۔ اُسے سمجھنے کے لیے کسی اور لفظ کی ضرورت نہ رہے۔

**متشابہ**: وہ ہے جو کسی دوسری چیز کی طرف راجع کیے بغیر مستقل بنفسہ نہ ہو۔

[۶] **محکم**: وہ ہے جس کی تاویل خود اس کی تنزیل ہو۔ یعنی نزول کے ساتھ ہی اس کا معنی واضح ہو۔

**متشابہ**: وہ ہے جو بغیر تاویل کے نہ معلوم ہو سکے۔

[۷] **محکم**: وہ ہے جس کے الفاظ مکرر نہ ہوں۔

**متشابہ**: وہ ہے جس کے الفاظ مکرر ہوں۔

[۸] **محکم**: فرائض اور وعد و وعید ہیں۔ جب کہ متشابہ: قصص و امثال ہیں۔

[۹] ابن ابی حاتم نے، علی بن طلحہ کے طریق سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے تخریج کی۔ آپ نے فرمایا: محکمات قرآن میں وارد ناسخ، حلال وحرام، حدود و فرائض اور وہ تمام امور ہیں جن پر ایمان لایا جاتا اور عمل کیا جاتا ہے۔ جب کہ متشابہات: قرآن میں موجود منسوخ، مقدم و مؤخر، امثال و اقسام (قَسم) اور وہ تمام امور ہیں جن پر ایمان تو لایا جاتا ہے مگر ان پر عمل نہیں کیا جاتا۔

[۱۰] عبد بن حمید نے بسند صحیح، ضحاک سے نقل کیا۔ انھوں نے کہا: قرآن کے وہ حصے جو

منسوخ نہیں، محکمات ہیں اور متشابہات وہ ہیں جو منسوخ ہیں۔

[۱۱] ابن ابی حاتم نے مقاتل بن حیان سے تخریج کی۔ انھوں نے کہا: ہمیں اگلوں سے یہ معلوم ہوا ہے کہ متشابہات "الم ، المص ، المر اور الر" ہیں۔

ابن ابی حاتم نے کہا: عکرمہ وقتادہ وغیرہما سے مروی ہے کہ :

[۱۲] محکم: وہ ہے جو قابل عمل ہو۔ اور متشابہ: وہ ہے جس پر ایمان رکھنا تو ضروری ہو مگر وہ قابل عمل نہ ہو۔

## فصل

متشابہات کے بارے میں علما کے دو قول ہیں:

[۱] متشابہات کی مراد بندوں کو معلوم ہو سکتی ہے۔ [۲] ان کا علم صرف اللہ کو ہے۔

قرآن کریم میں ہے: "هُوَ الَّذِیْ أَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتٰبِ وَأُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَأَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَاوِیْلِه وَمَا یَعْلَمُ تَاوِیْلَه اِلَّااللّٰهُ ۔ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِه كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّآ أُولُوا لْاَلْبَابِ "(اٰل عمران /۷) "وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری، اس کی کچھ آیتیں صاف معنی رکھتی ہیں، وہ کتاب کی اصل ہیں۔ اور دوسری وہ ہیں جن کے معنی میں اشتباہ ہے۔ وہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اشتباہ والی کے پیچھے پڑتے ہیں، گمراہی چاہنے اور اس کا پہلو ڈھونڈنے کو۔ اور اس کا ٹھیک پہلو اللہ ہی کو معلوم ہے۔ اور پختہ علم والے کہتے ہیں ہم سب پر ایمان لائے، سب ہمارے رب کے پاس سے ہے اور نصیحت نہیں مانتے مگر عقل والے۔"

اصل اختلاف یہاں ہے کہ "وما یعلم تاویله "پر وقف لازم ہے اور "الرٰسخون فی العلم " الگ جملہ ہے جس میں "الرٰسخون "مبتدا ہے، "یقولون " اس کی خبر۔ تو مطلب یہ ہوا کہ متشابہ کی مراد صرف اللہ کو معلوم ہے، علمائے راسخین کو نہیں۔ ہاں وہ اس کی حقانیت پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے من جانب اللہ ہونے کے قائل ہیں ـــــ دوسرا قول یہ ہے کہ "و الرٰسخون فی العلم" اسم جلالت (اللہ) پر معطوف ہے اور "یقولون " حال ہے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ متشابہ کی مراد اللہ بھی جانتا ہے اور وہ بھی جو علم میں پختہ کار ہیں۔

"متشابہ کی مراد راسخین کو معلوم ہے" اس قول کو اہل علم کی ایک مختصر جماعت نے اختیار کیا جن میں مجاہد بھی ہیں اور حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی ایک روایت یہی آئی ہے۔ چناں چہ ابن منذر نے بطریق مجاہد حضرت عبداللہ بن عباس سے اللہ تعالیٰ کے قول "وما یعلم تاویله الا الله والرٰسخون فی العلم " کے متعلق تخریج کی کہ آپ نے فرمایا: میں ان لوگوں کے زمرے میں ہوں

جنھیں اس کی تاویل معلوم ہے۔

لیکن اکثر صحابہ، تابعین، تبع تابعین اوران کے بعد کے علما خاص طور سے اہل سنت نے اسی کو اختیار کیا کہ متشابہ کی مراد خدا ہی کو معلوم ہے، راسخین کو معلوم نہیں۔

تمام روایتوں میں صحیح ترین روایت یہی ہے۔

امام سیوطی نے فرمایا: اکثر اہل علم کے مذہب کی صحت کی دلیل وہ اثر ہے جسے عبدالرزاق نے اپنی ''تفسیر'' میں اور حاکم نے اپنی کتاب ''متدرک'' میں حضرت عبداللہ بن عباس سے تخریج کیا کہ وہ "وما یعلم تاویله الا الله ،ویقول الرٰسخون فی العلم آمنا به " پڑھتے تھے جو اس بات کی دلیل ہے کہ "الرٰسخون" میں واو استیناف کے لیے ہے عطف کے لیے نہیں۔ کیوں کہ اس روایت سے اگر چہ قراءت ثابت نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس کا کم سے کم اتنا درجہ تو ہے کہ یہ باسناد صحیح ''ترجمان قرآن'' سے ثابت شدہ خبر ہے۔ اِس لیے اس ضمن میں ان کی بات دوسروں پر ترجیح یافتہ ہوگی۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ آیت کریمہ جہاں ''متشابہ'' کے درپے ہونے والوں کی مذمت اور انھیں کج روی اور فتنہ انگیزی کا خواہاں قرار دینے پر دلالت کررہی ہے وہیں متشابہ کی مراد کا علم خدا کو سپرد کرنے والوں کی مدح وستائش پر بھی دلالت کررہی ہے اور یہ مدح وثنا بھی ایسی ہے جیسی اللہ نے ''غیب'' پر ایمان لانے والوں کی فرمائی ہے۔

فرا نے نقل کیا کہ حضرت ابی بن کعب کی قراءت میں بھی "ویقول الرٰسخون " ہے۔

ابن ابی داؤد نے "المصاحف " میں بطریق اعمش تخریج کی کہ اعمش نے کہا: حضرت عبداللہ بن مسعود کی قراءت میں "وَاِنْ تاویلُه اِلَّا عِندَالله ،والرٰسخون فی العلم یَقُولُون اٰمنا به" ہے۔ ''اس کی تاویل اللہ کے پاس ہی ہے اور جنھیں علم میں رسوخ حاصل ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے''۔

شیخین وغیرہما نے حضرت عائشہ سے تخریج کی۔ انھوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آیت کریمہ " هُوَ الذِی اَنْزَلَ عَلَيْكَ الكِتٰبَ " (اٰل عمران/۷) اللہ تعالیٰ کے قول "اُولُوا الْاَلْبَابِ " تک تلاوت کرنے کے بعد فرمایا: اے عائشہ! جب تم قرآن میں وارد متشابہات کے درپے ہونے والوں کو دیکھو تو سمجھ لو کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے ''گمراہ'' اور ''فتنے کا خواہاں'' قرار دیا ہے۔ لہٰذا ان سے بچتی رہو۔

طبرانی نے ''معجم کبیر'' میں حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تخریج کی کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: مجھے اپنی امت کے متعلق صرف تین باتوں کا

اندیشہ ہے۔ پہلی یہ کہ مال کی فراوانی کے سبب ان کے درمیان ''حسد'' پیدا ہو جس کے نتیجے میں وہ باہم برسرِ پیکار ہو جائیں۔ دوسری یہ کہ ان کے سامنے کتاب اللہ کھول دی جائے تو مومن اسے لے کر اس کی تاویل کی کوشش کرے حالاں کہ اس کی تاویل صرف اللہ کو معلوم ہے۔ الحدیث....

ابن ابی حاتم نے بھی حضرت عائشہ سے تخریج کی کہ حضرت عائشہ نے کہا: ان کا یعنی صحابۂ کرام کا علمی رسوخ یہی تھا کہ متشابہ قرآن پر ان کا ایمان تھا اور وہ اس کی مراد کا علم نہ رکھتے تھے۔

دارمی نے اپنی ''مسند'' میں سلیمان بن یسار سے تخریج کی کہ ابن صَبِیغ نامی ایک شخص ''مدینہ'' آکر ''متشابہ قرآن'' کے بارے میں دریافت کرنے لگا، اس کی اطلاع حضرت عمر کو ہوئی تو آپ نے اسے بلالانے کے لیے ایک شخص کو بھیجا۔ اِدھر آپ نے کھجور کی پرانی شاخیں تیار کرلیں۔ جب وہ شخص آگیا تو آپ نے اس سے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے جواب دیا میں ''عبداللہ بن صبیغ'' ہوں۔ اتنا کہتے ہی آپ نے ایک شاخ اٹھا کر اسے اتنا مارا کہ اس کے سر سے خون جاری ہوگیا۔

دارمی ہی کی دوسری روایت میں ہے۔ حضرت عمر نے پتیوں سے صاف کی ہوئی کھجور کی ٹہنی سے اس کو اتنا مارا کہ اس کی پشت کو زخمی کردیا، پھر اسے چھوڑ دیا یہاں تک کہ جب اس کا زخم ٹھیک ہوگیا تو پھر یہی سزا دی اور شفایاب ہونے تک اسے پھر چھوڑ دیا۔ لیکن اب کی بار جب سزا دینے کے لیے اسے طلب فرمایا تو اس نے کہا ''اگر مجھے قتل ہی کردینا چاہتے ہیں تو اچھے انداز سے قتل کردیجیے''۔ یہ سن کر حضرت عمر نے اسے اپنی سرزمین میں چلے جانے کی اجازت دے دی اور حضرت ابوموسی اشعری کے پاس یہ تحریر بھیج دی کہ کوئی مسلمان اس کے پاس نشست و برخاست نہ کرے۔

یہ احادیث وآثار اس بات کی دلیل ہیں کہ متشابہ کا تعلق اسی قسم سے ہے جس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں اور اس میں خوض و دل چسپی قابل مذمت ہے۔ [۱]

## حکمتِ متشابہ

بعض علما نے معرفت متشابہ سے بندہ کے عاجز ہونے کے باوجود قرآن میں اس کے موجود ہونے کی حکمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: جس طرح بدن کو عبادت کی آزمائش میں ڈالا گیا اسی طرح عقل کو ''متشابہ'' کی مراد نہ جانتے ہوئے بھی اس کی حقانیت کا اعتقاد رکھنے کی آزمائش میں مبتلا کیا گیا۔ جیسے ایک دانشور جب کوئی کتاب تصنیف کرتا ہے تو کبھی کبھار اس میں کچھ باتیں اس لیے

---

[۱] حضرت ملاجیون رحمہ اللہ نور الانوار اور تفسیرات احمدیہ میں لکھتے ہیں: جو حضرات اس کے قائل ہیں کہ راسخین فی العلم متشابہ کی مراد جانتے ہیں، ان کا مطلب یہ ہے کہ ظنی طور پر اس کی تاویل جانتے ہیں۔ اور جو حضرات اس کے قائل ہیں کہ راسخین کو متشابہ کی مراد معلوم نہیں، ان کا مطلب یہ ہے کہ انھیں متشابہ کا قطعی و یقینی معنی معلوم نہیں جس کے بارے میں کہا جاسکے کہ یہی مراد الٰہی ہے اور اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو یہ کوئی حقیقی اختلاف نہیں بلکہ نزاع لفظی ہے۔ ۱۲۔ مترجم۔

اجمالی طور پر ذکر کرتا ہے کہ شاگرد کے دل میں اپنے استاذ کے لیے فروتنی و خاکساری کا جذبہ پیدا ہو۔ اور جیسے بادشاہ کوئی ایسی علامت اختیار کرتا ہے جس سے وہ شخص ممتاز ہو جائے جسے اس نے اپنا ''رازدار'' بنایا ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر بدن کے اندر سب سے بلند و بالا مقام کی حامل اس عقل کو امتحان میں نہ ڈالا گیا ہوتا تو ''عالم'' اپنے علم کے غرور و نخوت میں مست ہو کر ہمیشہ تمرد و سرکشی پر قائم رہتا۔ لیکن اس ابتلا و آزمائش کے باعث اسے بارگاہ خداوندی میں اظہار عجز و فروتنی کے ساتھ ''عزت بندگی'' سے انس ملتا ہے۔

لیکن سوال اٹھتا ہے کہ اس کے لیے متشابہ ہی کو کیوں منتخب کیا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسی سے عقلیں اپنے خالق و موجد حقیقی کے حضور اپنی کمی اور قصور کا اقرار و اعتراف کرتے ہوئے جھک جاتی ہیں۔

آیت کو اللہ تعالیٰ کے قول "وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوالْاَ لْبَابِ"[۱] پر ختم کرنے میں ''راہ حق سے انحراف کرنے والوں'' پر تعریض اور ''علم میں رسوخ و پختگی رکھنے والوں'' کی مدح ہے۔ یعنی جو قرآنی پند و موعظت کو قبول نہ کریں اور اپنی خواہشات نفسانی کی مخالفت نہ کریں وہ اہل حق کے زمرے میں داخل نہیں۔

اسی لیے راسخین فی العلم نے کہا: "رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَامِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ "(آل عمران/۸)"اے رب ہمارے! ہمارے دل ٹیڑھے نہ کر بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت دی اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا کر۔ بے شک تو ہے بڑا دینے والا۔''

یہ لوگ نفسانی کج روی سے پناہ خداوندی طلب کرنے کے بعد علم لدنی عطا کیے جانے کی طلب میں اپنے ''موجد حقیقی'' کے حضور سر فگندہ ہو گئے۔

جب تمھیں معلوم ہو گیا کہ ''متشابہ'' میں انہماک و مشغولیت قابل مذمت ہے تو اب ''متشابہ'' کی تحدید و تعیین ضروری ہو گئی۔ اور یہی بہتر ہے کیوں کہ ''مذموم'' کا علم ہو جانے کے بعد ہی اس سے اجتناب کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے علامہ خطّابی نے کہا: متشابہ کی دو قسمیں ہیں:

[۱] جسے محکم کی طرف پھیرا جائے اور محکم پر اس کا قیاس کیا جائے تو اس کا معنی معلوم ہو جائے۔

[۲] جس کی حقیقت سے آگہی کی کوئی راہ ہی نہ ہو۔

''کج نہاد لوگ'' اسی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اور اس کی تاویل جاننے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ مگر اس کی حقیقی مراد و منشا تک ان کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ اس لیے اس کے تعلق سے شک و ارتیاب میں گرفتار ہو کر فتنے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

---

[۱] اور نصیحت عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔

## فصل

آیات صفات کا تعلق بھی متشابہات سے ہے۔ابن اللبّان نے ان کے بیان میں ایک مستقل کتاب تصنیف فرمائی ہے۔

یہاں چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں۔

" الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى " (طٰهٰ/۵)"وہ بڑی مہر والا، اس نے عرش پر استوا فرمایا۔"(جیسا اس کی شان کے لائق ہے۔)

"كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ" (القصص/۸۸) "ہر چیز فانی ہے سوا اس کی ذات کے"۔

"وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ" (الرحمن/۲۷)"اور باقی ہے تمھارے رب کی ذات"۔

"وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِىْ" (طٰهٰ/۳۹)"اور اس لیے کہ تو میری نگاہ کے سامنے تیار ہو"۔

"يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ " (الفتح/۱۰)"ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے"۔

"وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهٖ" (الزُمَر/۶۷)"اور اس کی قدرت سے سب آسمان لپیٹ دیے جائیں گے۔"

جمہور اہل سنت بشمول سلَف و محدثین اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ ''متشابہات'' پر ایمان رکھا جائے اور ان سے کیا معنی مراد ہے اسے اللہ تعالیٰ کو تفویض کر دیا جائے اور ان کی تفسیر و توضیح نہ کی جائے۔لیکن اللہ تعالیٰ کو ان کے اس معنی سے منزہ و پاک قرار دیا جائے جو فوری طور پر ذہن میں آتا اور ظاہرِ لفظ سے معلوم ہوتا ہے۔کیوں کہ جسم و جسمانیات سے اس کا پاک ہونا دلیل قطعی سے ثابت ہے۔

اہل سنت کے گروہ خلَف کا مذہب یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت قدر کے شایان شان معانی کے ساتھ ''متشابہات'' کی تاویل کریں گے۔

امام الحرمین کا بھی یہی مذہب تھا۔لیکن انھوں نے بعد میں اس سے رجوع فرمالیا۔اپنے ''رسالۂ نظامیہ'' میں فرماتے ہیں: ہم دینی پہلو سے جس چیز کو پسند کرتے اور جس چیز کے سبب ''عہد'' میں اللہ کی فرماں برداری کرتے ہیں وہ ''سلف امت'' کا اتباع ہے جو متشابہات کے معانی سے تعرض نہ کرنے پر ہمیشہ قائم رہے۔

علامہ ابن الصلاح نے فرمایا: اسی طریقے پر امت کے پیش رو اور ''سرداران گروہ سلف صالحین'' مضبوطی سے قائم رہے، اسی کو گروہ فقہا کے ائمہ و قائدین نے اختیار کیا، اسی کی ائمۂ حدیث اور اس کے سرخیل محدثین نے دعوت دی اور ہمارے اصحاب متکلمین میں کوئی بھی اس سے روگردانی یا اس کا انکار نہیں کرتا۔

علامہ ابن دقیق العید نے راہ اعتدال اختیار کرتے ہوئے فرمایا: اگر تاویل "لسان عرب" سے قریب ہو تو ممنوع و معیوب نہیں۔ اور اگر اس سے بعید ہو تو ہم تاویل سے باز رہیں گے اور خدا کی تنزیہ کرتے ہوئے اس بات کے قائل رہیں گے کہ اس سے رب تعالیٰ کی جو بھی مراد ہے اس پر ہمارا ایمان ہے۔

مزید فرمایا: جس لفظ کے معنی ظاہر ہوں اور محاورات عرب سے وہ معنی سمجھے بھی جاتے ہوں تو ہم بغیر کسی توقف و تردد کے اس کے قائل ہوں گے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد " أَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يَاحَسْرَتَىٰ عَلَى مَافَرَّطتُّ فِيْ جَنْبِ اللّٰهِ " (الزمر/٥٦) میں ہم لفظ "جنب" کو "حق" کے معنی میں لیں گے۔ اب معنی ہوں گے۔ "کہ کہیں کوئی جان یہ نہ کہے کہ ہائے افسوس اس کوتاہی پر جو میں نے "اللہ کے حق میں کی"یعنی اللہ کے لیے جو ایمان وطاعت میرے اوپر واجب تھی میں نے اس میں کمی کی۔

اوائل سور بھی متشابہات میں داخل ہیں اور ان میں بھی مختار و پسندیدہ قول یہی ہے کہ "یہ اللہ تعالیٰ کے وہ راز ہائے سربستہ ہیں جنھیں اللہ ہی جانتا ہے"۔

ابن منذر وغیرہ نے امام شعبی سے تخریج کی کہ ان سے بعض سورتوں کے آغاز میں مذکور حروف کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا "ہر کتاب کا ایک راز ہوتا ہے۔ اور اس قرآن کا راز "فواتح سور" ہیں"۔

مگر کچھ دوسرے علما نے ان کے معنی میں غور وخوض بھی کیا ہے۔ چناں چہ ابن ابی حاتم وغیرہ نے بطریق ابی الضحیٰ، حضرت عبداللہ بن عباس سے تخریج کی کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے قول "الم" کے بارے میں فرمایا کہ اس کا معنی ہے: "أَنَا اللّٰهُ أَعْلَمُ "۔ میں اللہ ہی جانتا ہوں ۔ "ألمص" کے بارے میں فرمایا کہ اس کا مطلب ہے: "أَنَا اللّٰهُ أَفْصِلُ "۔ میں اللہ ہی فیصلہ کرتا ہوں اور "ألرٰ" کے متعلق فرمایا کہ اس کا معنی ہے "أَنَا الَّذِيْ أَرَىٰ " میں ہی دیکھتا ہوں۔

## تنبیہ

اکثر اہل سنت خصوصاً حنفیہ اسی کے قائل ہیں کہ متشابہات وہ قرآنی اسرار ہیں جن کا معنی مراد، راسخین فی العلم کو معلوم نہیں۔ لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ رسول کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کو متشابہات کی مراد معلوم ہے۔ اس لیے کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام قرآن کے اصل مخاطب اور مہبط وحی ہیں۔ اگر انھیں متشابہ کے معنی معلوم نہ ہوں تو اس کی تنزیل کا عبث ہونا لازم آئے گا اور یہ ایسا ہوگا جیسے عربی سے ترکی میں بات کرنا جسے وہ کچھ نہیں سمجھتا۔ اور رب تبارک وتعالیٰ عبث سے منزہ ہے۔ اس لیے رسول کو اس کے معنی معلوم ہیں۔ اور متشابہات خدا اور رسول کے درمیان وہ اسرار ورموز ہیں جن کی مراد خدا اور رسول ہی جانتے ہیں۔ (نور الانوار-۱۲ مترجم)

# قرآن کے مقدم ومؤخر کا بیان

اس کی دو قسمیں ہیں:

**قسم اول:** جس کے معنی بظاہر مشکل اور غیر واضح ہوں۔ لیکن جب یہ معلوم ہو جائے کہ یہ باب تقدیم و تاخیر سے ہے تو معنی واضح ہو جائے۔ یہ قسم اس لائق ہے کہ اس پر ایک مستقل کتاب لکھی جائے۔

سلف نے صرف چند آیتوں میں ہی اس سے تعرض کیا ہے۔ چناں چہ ابن ابی حاتم نے ارشاد باری "فَلَا تُعۡجِبۡكَ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ ۚ اِنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمۡ بِهَا فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا" (التوبۃ/۵۵) کے بارے میں حضرت قتادہ سے تخریج کی کہ انھوں فرمایا: یہاں کلام کی تقدیم ہے۔ مراد یہ ہے کہ "لا تُعۡجِبۡكَ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا اِنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمۡ بِهَا" "تمھیں دنیاوی زندگی میں ان کے مال واولاد کا تعجب نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے سبب آخرت میں انھیں عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔"

ابن ابی حاتم نے ہی انھیں سے فرمان خداوندی" وَلَوۡلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّكَ لَـكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى" (طٰہٰ/۱۲۹) کے بارے میں تخریج کی کہ انھوں نے فرمایا: یہ تقدیم کلام سے ہے۔ مراد ہے: "ولولا كلمة وأجل مسمى لكان لزاما" "اگر تمھارے رب کی ایک بات اور معین وعدہ نہ گذر چکا ہوتا تو ضرور عذاب انھیں لپٹ جاتا۔"

انھیں ابن ابی حاتم نے ارشاد خداوندی " أَنۡزَلَ عَلٰى عَبۡدِهِ الۡكِتٰبَ وَلَمۡ يَجۡعَلۡ لَّهٗ عِوَجًا قَيِّمًا " (ألکھف/۱) کے متعلق حضرت مجاہد سے تخریج کی۔ انھوں نے فرمایا: اس جگہ تقدیم و تاخیر ہے۔ مراد ہے: "اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰى عَبۡدِهِ الۡكِتٰبَ قَيِّمًا وَلَمۡ يَجۡعَلۡ لَّهٗ عِوَجًا" "سب خوبیاں اللہ کو جس نے اپنے بندے پر عدل والی کتاب اتاری اور اس میں اصلاً کجی نہ رکھی۔"

انھوں نے ہی اللہ تعالیٰ کے قول " لَهُمۡ عَذَابٌ شَدِيۡدٌ ۢ بِمَا نَسُوۡا يَوۡمَ الۡحِسَابِ" (ص/۲۶) کے بارے میں حضرت عکرمہ سے تخریج کی۔ انھوں نے فرمایا: اس مقام پر تقدیم و تاخیر ہے۔ مراد ہے۔ "لهم يَوۡمَ الحساب عذاب شديد بما نَسُوا "۔ "ان کے بھلا دینے کے سبب، حساب کے دن ان کے لیے سخت عذاب ہوگا۔"

ابن جریر نے اللہ تعالیٰ کے قول "وَاِذَا جَآءَهُمۡ اَمۡرٌ مِّنَ الۡاَمۡنِ اَوِ الۡخَـوۡفِ اَذَاعُوۡا بِهٖ ؕ وَلَوۡ رَدُّوۡهُ اِلَى الرَّسُوۡلِ وَاِلٰٓى اُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡهُمۡ لَعَلِمَهُ الَّذِيۡنَ يَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ مِنۡهُمۡ ؕ وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ لَاتَّبَعۡتُمُ الشَّيۡطٰنَ اِلَّا قَلِيۡلًا " (النساء/۸۳) کے بارے میں ابن زید سے تخریج کی۔ ابن زید نے فرمایا: اس آیت میں تقدیم و تاخیر ہے۔ مراد ہے۔ "وَاِذَا جَآءَهُمۡ اَمۡرٌ مِّنَ

الامْنِ أوِالْخَوْفِ اَذَاعُوْابِهٖ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَمْ يَنْجُ قَلِيلٌ وَّلَاكَثِيْرٌ " ''اور جب ان کے پاس کوئی بات اطمینان یا ڈر کی آتی ہے تو اس کا چرچا کر بیٹھتے ہیں۔مگر تھوڑے لوگ ایسا نہیں کرتے ۔حالاں کہ اگر یہ چرچا کرنے والے اس معاملہ میں رسول اور اپنے ذی اختیار لوگوں کی طرف رجوع لاتے تو ضرور بات میں کاوش کرنے والے یہ لوگ ان سے اس کی حقیقت جان لیتے اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو کوئی جماعت نجات نہ پاتی خواہ قلیل ہوتی یا کثیر۔''

## تقدیم وتاخیر کی چند اور مثالیں

[۱] "أَفَرَ أَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ " (الجاثية/۲۳) یہ اصل میں "هواه الٰهه " ہے۔ کیوں کہ آیت کا ظاہرِ معنی ہے۔''جس نے اپنے معبود کو اپنی پسند اور محبوب بنالیا'' اور ایسا کرنے والا برا نہیں ہوتا۔دراصل یہاں مفعول ثانی سے اعتنا کی وجہ سے مفعول ثانی کو مقدم کردیا گیا ہے۔اصل تقدیر کلام یہ ہے۔ "أفرأيتَ من اتخذ هواه الٰهَهٗ " "کیا تم نے اسے نہ دیکھا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنالیا۔''

[۲]"وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ"(فاطر/۲۷) یہ اصل میں"سود غرابيب "ہے۔کیوں کہ "غِرْبِيْبٌ" کے معنی ہیں:''سخت سیاہ'' تو اس میں "سَوَادٌ" (سیاہی) کے مقابلے میں معنی کی زیادتی ہے۔اور جس لفظ میں معنی کی زیادتی ہو وہ زیادہ بلیغ اور مؤخر ہوتا ہے۔اس لیے دراصل "سُود" مقدم اور "غرابيب "مؤخر ہے۔دوسرا قول یہ ہے کہ "غرابيب" کے بعد "سود"توضیح وتفسیر کے لیے ہے۔

[۳]"وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ، وَهَمَّ بِهَا لَوْلَاأَنْ رَاٰى بُرْهَانَ رَبِّهٖ" (يوسف/۲٤) اس کی ترکیب نحوی یوں ہے: "لولا أن راى برهان ربه لَهَمَّ بها " "اور بے شک عورت (زلیخا) نے اس (یوسف) کا ارادہ کیا اور وہ بھی عورت کا ارادہ کرتا اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتا۔معنی یہ ہوئے کہ یوسف نے اپنے رب کی برہان دیکھی اس لیے عورت کا قصد نہ کیا۔اس تقدیر پر'' قصدِ گناہ'' حضرت یوسف سے منفی ہے۔

قسم ثانی: جو ایسی نہ ہو۔یعنی جو مشکل اور غیر واضح نہ ہو بلکہ کسی حکمت اور نکتے کے تحت کسی لفظ کی تقدیم ہوئی ہو۔

اس موضوع پر علامہ شمس الدین بن الصائغ نے ایک کتاب "اَلْمُقَدِّمَهُ فِيْ سِرِّ الْأَلْفَاظِ الْمُقَدَّمَه" تالیف فرمائی ہے۔اس میں آپ تحریر فرماتے ہیں: اس سلسلے میں عام اور کھلی ہوئی حکمت ''اہتمام'' ہے۔جیسا کہ سیبویہ نے اپنی تصنیف "الکتاب" میں کہا:"كَأَنَّهُمْ يُقَدِّمُوْنَ الَّذِي بَيَانُهٗ

أَهَمُّ ، وَهُمْ بِبَيَانِهِ أَعْنَىٰ" "گویا عرب اسے مقدم کر دیتے ہیں جس کا بیان اہم ہو اور جس کے ذکر کا انھیں زیادہ اہتمام ہو۔"

مزید فرمایا: یہ "حکمت" تو ایک اجمالی چیز ہے۔ لیکن جہاں تک تقدیم کے تفصیلی اسباب واسرار کا تعلق ہے تو میرے ذہن میں کتاب عزیز میں موجود ان اسباب واسرار کی دس نوعیں آئی ہیں۔

[۱] تبرک: جیسے اہم اور ذی شان امور میں اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی کو مقدم کرنا۔ ارشاد ہے: "شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰئِكَةُ وَأُولُوالْعِلْمِ "(ال عمران/۱۸) "اللہ نے اپنی مخلوق کے لیے بیان فرمادیا کہ اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور فرشتوں اور اہل علم نے بھی اللہ ہی کے معبود برحق ہونے کی گواہی دی۔"

ایک اور مقام پر فرماتا ہے:" وَاعْلَمُوْا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ" (الانفال/۴۱) "اور جان لو کہ جو کچھ غنیمت لو تو اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول کے لیے ہے۔"

[۲] تعظیم: جیسے ارشاد باری ہے: "وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَأُولٰئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ "(النساء/۶۹) "جو اللہ ورسول کی اطاعت کریں وہ ان لوگوں کے ساتھ رہیں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا۔" " اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ " (الاحزاب/۵۶) "بے شک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں۔" "وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَحَقُّ أَنْ يُّرْضُوْهُ "(التوبة/۶۲) "اور اللہ ورسول کا حق زائد تھا کہ اسے راضی کرتے۔"

[۳] اظہار عز و شرف: مثلاً مذکر کو مؤنث پر مقدم کرنا۔ جیسے :"اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ"( الاحزاب/۳۵[۱]) میں "مسلمین" (مذکر) کا "مسلمات" (مؤنث) پر ــــ "أَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَىٰ بِالْاُنْثَىٰ "(البقرة/۱۷۸[۲]) میں "حر" (آزاد) کا "عبد" (غلام) اور "أنثى" (مؤنث) پر ــــ " يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ"(الانعام/۹۵[۳]) اور "وَمَا يَسْتَوِى الْأَحْيَاءُ وَالْأَمْوَاتُ" (فاطر/۲۲[۴]) میں "حی" کا "میت" پر اور "أحياء" کا "أموات" پر ــــ "وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا" (النحل/۸[۵]) میں "خیل" (گھوڑوں) کا "بغال" (خچروں) اور "حمیر" (گدھوں) پر ــــ "وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ" (البقرة /۷[۶]) اور "اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا"[۷]

---

[۱] بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں۔ [۲] پہلے اس طرح ہے: يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى ۔۔۔۔ اے ایمان والو تم پر فرض ہے کہ جو ناحق مارے جائیں ان کے خون کا بدلہ لو۔ آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔ [۳] زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے۔ [۴] اور زندے اور مردے برابر نہیں۔ [۵] اور اس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کیے کہ ان پر سوار ہو۔ [۶] اور ان کے کانوں پر مہر کردی اور ان کی آنکھوں پر گھٹا ٹوپ ہے۔ [۷] بیشک کان اور آنکھ اور دل ان سب سے سوال ہونا ہے۔

(ألاسراء/۳٦) اور ”اِنۡ اَخَذَ اللّٰهُ سَمۡعَكُمۡ وَاَبۡصَارَكُمۡ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوۡبِكُمۡ مَّنۡ اِلٰهٌ غَيۡرُ اللّٰهِ يَاۡتِيۡكُمۡ بِهٖ“ (ألأنعام/٤٦[۱]) میں ”سمع“ کا ”بصر“ پر مقدم ہونا اظہار عزو شرف کے لیے ہے۔

ابن عطیہ نے نقّاش سے نقل کیا کہ نقاش نے ان آیات سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ ”سمع“ کو ”بصر“ پر فضیلت حاصل ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کے وصف کے بیان میں ”سمیع“ کی تقدیم کے ساتھ ”سمیع بصیر“ واقع ہوا ہے۔

## مندرجہ ذیل مثالوں کا تعلق بھی اسی قسم سے ہے۔

[۱] ”وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيۡثَاقَهُمۡ وَمِنۡكَ وَمِنۡ نُّوۡحٍ وَّاِبۡرٰهِيۡمَ وَمُوۡسٰى وَعِيۡسَى ابۡنِ مَرۡيَمَ “(الاحزاب/۷[۲]) میں حضرت نوح اور ان کے ساتھ مذکور انبیاے کرام علیہم السلام پر حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تقدیم۔

[۲] ”مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِىٍّ “(الحج/۵۲[۳]) میں ”رسول“ کی ”نبی“ پر تقدیم۔

[۳] ”وَالسّٰبِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ مِنَ الۡمُهٰجِرِيۡنَ وَالۡاَنۡصَارِ“ (التوبة/۱۰۰[٤]) میں ”مهاجرين“ کی ” أنصار“ پر تقدیم۔

[۴] قرآن میں جن وانس کا ذکر ہونے کی صورت میں ”انس“ کی ”جن“ پر تقدیم۔

[۵] آیت نساء میں پہلے نبیوں، پھر صدیقوں، پھر شہدا، پھر صالحین کا ذکر۔

[٦] حضرت اسمٰعیل کی حضرت اسحٰق پر تقدیم۔ اس لیے کہ حضرت اسمٰعیل، حضرت اسحٰق سے زیادہ شرف رکھتے ہیں۔ کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کی اولاد میں ہیں اور وہ حضرت اسحٰق سے عمر میں بڑے بھی ہیں۔

[۷] آیت بقرہ میں حضرت جبریل کی حضرت میکائیل پر تقدیم۔ کیوں کہ حضرت جبریل ان سے افضل ہیں۔

[۸] ”مَتَاعًا لَّكُمۡ وَلِاَنۡعَامِكُمۡ“ ’النازعات/۳۳[۵]) اور ”يُسَبِّحُ لَهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ

---

[۱] اگر اللہ تمھارے کان اور آنکھ لے لے اور تمھارے دلوں پر مہر کردے تو اللہ کے سوا کون خدا ہے کہ تمھیں یہ چیزیں لادے۔ [۲] اور اے محبوب یاد کرو جب ہم نے نبیوں سے عہد لیا اور تم سے اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے۔ [۳] پوری عبارت یوں ہے: وَمَا اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِىٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلۡقَى الشَّيۡطٰنُ فِىۡۤ اُمۡنِيَّتِهٖ: اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول یا نبی بھیجے سب پر یہ واقعہ گزرا ہے کہ جب انھوں نے پڑھا تو شیطان نے ان کے پڑھنے میں لوگوں پر کچھ اپنی طرف سے ملا دیا۔ [۴] پوری عبارت یوں ہے: وَالسّٰبِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ مِنَ الۡمُهٰجِرِيۡنَ وَالۡاَنۡصَارِ وَالَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُمۡ بِاِحۡسَانٍ رَّضِىَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ : اور سب میں اگلے پہلے مہاجر اور انصار اور جو بھلائی کے ساتھ ان کے پیرو ہوئے، اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی۔ [۱] اس سے پہلے اس طرح ہے: اَخۡرَجَ مِنۡهَا مَآءَهَا وَمَرۡعٰىهَا، وَالۡجِبَالَ اَرۡسٰىهَا مَتَاعًا لَّكُمۡ وَلِاَنۡعَامِكُمۡ : زمین میں سے اس کا پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑوں کو جمایا، تمھارے اور تمھارے چوپایوں کے فائدہ کو۔

وَالْاَرْضِ، وَالطَّيْرُ صَافَّاتٍ" (النور/۴۱[۱]) میں "عاقل" کی "غیر عاقل" پر تقدیم۔

[۴] مناسبت: یعنی متقدم کا سیاق کلام کے مناسب ہونا۔ جیسے: "وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ" (النحل/۶) "اور تمھارا ان میں تجمل (زینت) ہے جب انھیں شام کو واپس لاتے ہو اور جب چرنے کو چھوڑتے ہو۔"

چرنے کے لیے چھوڑنا پہلے ہوتا ہے اور واپس لانا بعد میں۔ لیکن واپس لانے کا ذکر پہلے ہے۔ اس لیے کہ واپسی کی حالت، تجمل سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ وہ اس طرح کہ اونٹوں سے زینت اگرچہ صبح کو چرنے کے لیے چھوڑنے کی حالت میں بھی ہوتی ہے اور شام کو چراگاہ سے واپس ہونے کی حالت میں بھی ہوتی ہے۔ مگر شام کو شکم سیر ہو کر ان کی واپسی صبح خالی پیٹ جانے کی بہ نسبت زیادہ زینت رکھتی ہے۔

مندرجہ ذیل قرآنی آیتیں بھی اس کی مثالیں ہیں:

- "وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا" (الفرقان/۶۷) "اور وہ کہ جب خرچ کرتے ہیں (تو) نہ حد سے بڑھیں اور نہ تنگی کریں۔" یہاں "نفی اسراف" کو مقدم کیا گیا۔ اس لیے کہ شرف، انفاق میں ہے۔
- "هُوَ الَّذِىْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا" (ألرعد/۱۲) "وہی ہے کہ تمھیں بجلی دکھاتا ہے ڈر کو اور امید کو۔" اس آیت میں "خوف" کو "طمع" پر اس لیے مقدم کیا گیا ہے کہ "صَاعِقَہ" (بجلی) پہلی ہی چمک کے ساتھ گر پڑتا ہے جب کہ بارش چمک کے بار بار رونما ہونے کے بعد ہی ہوتی ہے۔

[۵] کسی امر کی ترغیب وتشویق اور اس میں بے پروائی سے اجتناب کی تاکید کے لیے اس کا ذکر پہلے لانا۔ جیسے ارشاد خداوندی "مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَا اَوْ دَيْنٍ" (النساء/۱۱[۲]) میں "دَین" پر "وصیۃ" کی تقدیم۔ حالاں کہ شرعاً دَین، وصیت پر مقدم ہے۔

[۶] کسی امر کے سابق ومتقدم ہونے کے باعث اس کا ذکر پہلے لانا۔ سبقت وتقدم کی کئی صورتیں ہیں۔ (۱) مرتبۂ ایجاد میں پہلے ہو۔ (۲) نازل کرنے میں پہلے ہو۔ (۳) وجوب اور بجا آوری میں پہلے ہو۔ (۴) ذات کے اعتبار سے پہلے ہو۔

**اول کی مثال:** رات کا دن پر، ظلمت کا نور پر، نوح کا ابراہیم پر، ابراہیم کا عیسیٰ پر، ہود کا عیسی

---

[۱] اللہ کی تسبیح کرتے ہیں جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرندے پر پھیلائے۔

[۲] پوری عبارت اس طرح ہے: فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ: تو اگر میت کے دو یا دو سے زیادہ بھائی بہنیں ہوں تو اس کی وصیت کو نافذ کرنے اور اس پر آنے والے دَین کی ادئیگی کے بعد اس کی ماں کے لیے چھٹا حصہ ہے۔

پر اور داؤد کا سلیمان پر مقدم ہونا۔ علیہم الصلوٰۃ والسلام۔ ملائکہ کا بشر پر مقدم ہونا۔ جیسے: "اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ" (الحج/۷۵) "اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے رسول اور آدمیوں میں سے۔ ازواج کا اولاد پر مقدم ہونا۔" جیسے: "قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ" (الأحزاب/۵۹) "اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے کہہ دیجیے۔" ـــــ اور سِنَة (اونگھ) کا نوم (نیند) پر مقدم ہونا۔ جیسے "لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ" (البقرة/۲۵۵) "اسے اونگھ آئے نہ نیند۔"

**دوم کی مثال:** "اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى" (الاعلیٰ/۱۸، ۱۹)[۱] میں صحف موسیٰ پر صحف ابراہیم کی تقدیم اس لیے ہے کہ صحف ابراہیم کو اللہ تعالیٰ نے صحف موسیٰ سے پہلے نازل فرمایا۔ یوں ہی "وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ" (ال عمران/ ۴[۲]) میں توریت پھر انجیل پھر فرقان (قرآن) کا ذکر ان کے زمانۂ نزول کی ترتیب کے اعتبار سے ہے۔

**سوم کی مثال:** "ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا (الحج/۷۷[۳])رکوع کو سجدہ سے پہلے اس لیے ذکر کیا گیا کہ رکوع، سجدہ سے پہلے ہوتا ہے۔ اسی طرح "اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ "(المائدة/۶[۴])اور " اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ " (البقرة / ۱۵۸[۵]) میں بھی سمجھا جائے۔

آخری آیت کریمہ میں چوں کہ صفا کا ذکر مروہ سے پہلے ہے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: "نَبْدَاُ بِمَا بَدَاَ اللّٰهُ بِهٖ"۔ "ہم اسی سے اپنی سعی کی ابتدا کریں گے جس کے ذکر سے خدا نے ابتدا فرمائی۔"

**چہارم کی مثال :**"فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ " (النساء/۳[۶])اور "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۔ فاطر/۱[۷])چوں کہ دو، تین سے پہلے اور تین، چار سے پہلے ہوتا ہے اس لیے پہلے مثنیٰ، پھر ثلاث، پھر رباع کا ذکر کیا گیا۔

[۸] سببیت: جیسے: "عَزِیْزٌ" (غالب) کی "حکیم" (حاکم) پر تقدیم۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ غالب ہونے کی وجہ سے ہی حاکم ہے۔ اور "عَلِیم" (بہت جاننے والا) کی "حکیم" (کسی کام کو

---

[۱] بیشک یہ اگلے صحیفوں میں ہے، ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔ [۲] اس نے اس سے پہلے توریت اور انجیل اتاری، لوگوں کو راہ دکھاتی اور فیصلہ (قرآن) اتارا۔ [۳] رکوع اور سجدہ کرو۔ [۴] جب تم نماز کے لیے کھڑے ہونے کا ارادہ کرو تو اپنے چہروں اور ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھوؤ، اور اپنے سروں کا مسح کرو اور دونوں ٹخنوں سمیت اپنے پیروں کو دھوؤ۔ [۵] بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ [۶] تو نکاح میں لاؤ جو عورتیں تمہیں خوش آئیں، دو دو اور تین تین اور چار چار۔ [۷] سب خوبیاں اللہ کو جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا، فرشتوں کو رسول کرنے والا (ہے) جن کے دو دو، تین تین، چار چار پر ہیں۔

کامل طریقے پر اور بخوبی انجام دینے والا) پر تقدیم اس لیے ہے کہ کسی کام کو بخوبی انجام دینا علم ہی سے ہوسکتا ہے۔ لیکن سورۂ انعام میں "حکیم" کے "علیم" پر مقدم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اجراے احکام کا مقام ہے۔

مندرجہ ذیل آیات بھی اسی قبیل سے ہیں:

● سورۂ فاتحہ میں آیت کریمہ "اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡن" (الفاتحۃ/۵[۱]) میں ''عبادت'' کی ''استعانت'' پر تقدیم اس لیے ہے کہ عبادت، حصول اعانت کا سبب ہے۔ "اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيۡنَ وَيُحِبُّ الۡمُتَطَهِّرِيۡنَ" (البقرۃ/۲۲۲[۲]) میں ''توبہ'' کی ''طہارت'' پر تقدیم اس لیے ہے کہ توبہ گناہوں سے طہارت اور پاکی کا سبب ہے۔ "وَيۡلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيۡمٍ" (الجاثیۃ/۷[۳]) میں "افك" (دروغ گوئی وافترا) کی "اثم" (گناہ) پر تقدیم اس لیے ہے کہ دروغ گوئی وافترا پردازی گناہ کا سبب ہے۔ اسی طرح "قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ يَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِهِمۡ وَيَحۡفَظُوۡا فُرُوۡجَهُمۡ" (النور/۳۰[۴]) میں "بصر" (آنکھ) کی "فرج" (شرم گاہ) پر تقدیم اس لیے ہے کہ بصر، فرج تک رسائی کا سبب ہے۔

[۹] کثرت: ارشاد خداوندی "فَمِنۡكُمۡ كَافِرٌ وَّمِنۡكُمۡ مُّؤۡمِنٌ" (التغابن/۲[۵]) میں کافر کا مومن سے پہلے ذکر اس لیے ہے کہ مومن کے مقابلے میں کافر زیادہ ہیں۔ "فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ وَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ وَّ مِنۡهُمۡ سَابِقٌ بِالۡخَيۡرٰتِ بِاِذۡنِ اللّٰهِ" (فاطر/۳۲[۶]) میں سب سے پہلے "ظالم" کا ذکر اس کی کثرت کی وجہ سے کیا گیا۔ بعدازاں "مقتصد" (میانہ روی اختیار کرنے والا) اور پھر "سابق" (سبقت لے جانے والا) کا ذکر کیا گیا۔ "وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقۡطَعُوۡۤا اَيۡدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا" (المائدۃ/۳۸[۷]) میں "سارق" (چوری کرنے والا مرد) کو "سارقۃ" (چوری کرنے والی عورت) پر اس لیے مقدم کیا گیا کہ مردوں میں عورتوں کی بہ نسبت چوری کا ارتکاب زیادہ ہے۔

● اسی قبیل سے قرآن کریم میں بطریق غالب ''عذاب'' پر ''رحمت'' کی تقدیم ہے۔ خواہ یہ کہیں بھی ہو۔ اسی لیے وارد ہے: "اِنَّ رَحۡمَتِيۡ غَلَبَتۡ غَضَبِيۡ"۔ "بے شک میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔"

[۱۰] ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی: جیسے ارشاد باری تعالیٰ "اَلَهُمۡ اَرۡجُلٌ يَّمۡشُوۡنَ بِهَاۤ اَمۡ لَهُمۡ

---

[۱] ہم تیری ہی عبادت کرتے اور تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں۔ [۲] بیشک اللہ پسند رکھتا ہے بہت توبہ کرنے والوں کو اور پسند رکھتا ہے ستھروں کو۔ [۳] خرابی ہے ہر بڑے بہتان والے گنہ گار کے لیے۔ [۴] مسلمان مردوں کو حکم دو اپنی نگاہیں کچھ نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ [۵] تو تم میں کوئی کافر (ہے) اور تم میں کوئی مسلمان (ہے) [۶] تو ان میں کوئی اپنی جان پر ظلم کرتا ہے اور ان میں کوئی میانہ چال پر ہے اور ان میں کوئی وہ ہے جو اللہ کے حکم سے بھلائیوں میں سبقت لے گیا۔ [۷] اور جو مرد یا عورت چور ہو تو ان کا ہاتھ کاٹو ان کے کیے کا بدلہ۔

أَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَا أَمْ لَهُمْ أَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَا أَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا"(الأعراف/۱۹۵[۱]) میں ترقی کے لیے ادنیٰ کا ذکر سب سے پہلے فرمایا۔اس لیے کہ "ید"(ہاتھ) "رِجل" (پیر) سے، آنکھ، ہاتھ سے اور کان، آنکھ سے اشرف واعلیٰ ہے۔

زیادہ مبالغہ والے لفظ کو مؤخر کرنا اور مبالغۃً محض والے لفظ کو مقدم کرنا بھی اسی قبیل سے ہے۔لیکن "رحیم" پر "رحمٰن"، "رحیم" پر "رؤف" اور اللہ تعالیٰ کے قول "وَكَانَ رَسُوْلاً نَّبِيًّا" (مریم/ ۵۱، ۵۴ [۲]) میں "نبی" پر "رسول" کی تقدیم اِس ضابطے سے خارج ہے۔علما نے اس کے کئی نکتے ذکر کیے ہیں جن میں مشہور ترین نکتہ "مراعات فاصلہ" ہے۔یعنی فاصلے کا لحاظ کرنے کی وجہ سے اَبلَغ کو بلیغ پر مقدم کیا گیا۔

[۱۱] اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف آنا۔لیکن "لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ" [۳] اور "مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّا أَحْصٰهَا" (الکہف/۴۹[۴]) اس سے خارج ہیں۔

## قرآن کے عام اور خاص کا بیان

عام: ایسا لفظ ہے جو بغیر کسی حصر کے ان تمام افراد کو شامل ہو جو اس کے لائق ہوں۔

اس کے مندرجہ ذیل صیغے آتے ہیں:

كُلٌّ ،اَلَّذِیْ ،اللَّذان ،اللَّذَيْنِ ،اَلَّذِيْنَ اَلَّتِیْ، اَللَّتَانِ، اَللَّتَيْنِ، اَللَّاتِیْ، اَللَّائِیْ، اَیٌّ، مَا، مَنْ شرطیہ، استفہامیہ، موصولہ، جمع مضاف، جمع معرف باللام، اسم جنس مضاف، اسم جنس معرف باللام، نکرہ جو سیاق نفی یا سیاق نہی میں واقع ہو یا سیاق شرط یا سیاق امتنان میں واقع ہو۔

"کل" جو شروع میں اور غیر تابع ہو۔جیسے: (كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۰ الرحمن/ ۲۶[۵]) یا تابع ہو۔جیسے: (فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۰ الحجر/ ۳۰، ص/ ۷۳[۶])

الذی: جیسے: (وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَا ۰ الاحقاف/ ۱۷[۷]) اس آیت کریمہ میں الذی سے مراد ہر وہ شخص ہے جس سے اس قول کا صدور رہوا۔اس کی دلیل اس کے بعد کا یہ ارشاد ہے: (اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ ۰ الاحقاف /۱۸) "یہ وہ ہیں جن پر (عذاب کی) بات ثابت ہو چکی۔"

الذین: جیسے (وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ،اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۰ البقرۃ/۸۲)" اور

---

[۱] کیا ان کے پاوں ہیں جن سے چلیں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے گرفت کریں یا ان کے آنکھیں ہیں جن سے دیکھیں یا ان کے کان ہیں جن سے سنیں۔[۲] پوری آیت یوں ہے: وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ مُوْسٰی اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا : موسیٰ کو یاد کرو بیشک وہ چنا ہوا اور رسول تھا غیب کی خبریں بتانے والا۔[۳] اسے نہ اونگھ آئے نہ نیند۔[۴] وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَا لِ الخ اور کہیں گے ہائے خرابی ہماری! اس نوشتے کو کیا ہوا (کہ) نہ اس نے کوئی چھوٹا گناہ چھوڑا نہ بڑا جسے گھیر نہ لیا ہو۔[۵] زمین کی ہر چیز فانی ہے۔[۶] تو تمام فرشتوں نے اجتماعی طور پر سجدہ کیا۔[۷] اور وہ تمام لوگ جنھوں نے اپنے ماں باپ سے کہا: اف تم سے دل پک گیا ہے۔

جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ جنت والے ہیں۔" (لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ • یونس/۲٦) "(تمام) بھلائی والوں کے لیے بھلائی ہے اور اس سے بھی زائد۔" (لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ • ال عمران/۱۵) "(تمام) پرہیزگاروں کے لیے ان کے رب کے پاس جنتیں ہیں۔"

اللائی: جیسے: (وَالّٰئِىْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَاءِ كُمْ • الطلاق /٤) "اور تمھاری عورتوں میں جنھیں حیض کی امید نہ رہی۔"

اللاتی: جیسے (وَالّٰتِىْ يَاْتِيْنَ الفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَاءِ كُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ • النساء/ ۱۵) "اور تمھاری عورتوں میں جو بدکاری کریں ان پر خاص اپنے میں کے چار مردوں کی گواہی لو۔"

الذان: جیسے (وَالَّذَانِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا • النساء/۱٦) "اور تم میں جو مرد عورت ایسا کام (بدکاری) کریں ان کو ایذا دو۔"

ای: جیسے (اَيًّا مَّا تَدْعُوْفَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى • الاسراء/ ۱۱۰) "جو کہہ کر پکارو سب اس کے اچھے نام ہیں۔"

ما: جیسے (اِنَّكُمْ وَمَاتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ •الانبیاء/۹۸) "(اے مشرکو) بیشک تم اور جو کچھ اللہ کے سوا پوجتے ہو، سب جہنم کے ایندھن ہو۔"

من: جیسے (مَنْ يَّعْمَلْ سُوْءً يُّجْزَ بِهٖ (النساء/۱۲۳) "جو برائی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا"۔

جمع مضاف: جیسے (يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِىْ اَوْلَادِكُمْ • النساء /۱۱) "اللہ تمھیں حکم دیتا ہے تمھاری اولاد کے بارے میں"۔

جمع معرف باللام: جیسے (قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ • المؤمنون/۱) "بیشک مراد کو پہنچے ایمان والے"۔ (فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ • التوبة/۵) "پھر جب حرمت والے مہینے نکل جائیں تو مشرکوں کو مارو جہاں پاؤ"۔

اسم جنس مضاف: جیسے (فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖ • النور /٦٣) "تو ڈریں وہ جو اس کے حکم کے خلاف کرتے ہیں۔"

اسم جنس معرف باللام: جیسے: (وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ • البقرة / ۲۷۵) "اللہ نے ہر بیع کو حلال کیا۔" (اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِىْ خُسْرٍ • العصر/ ۲) "بیشک ہر انسان ضرور گھاٹے میں ہے"۔ اس پر دلیل (اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا • العصر/ ۳) ہے۔ "مگر ایمان والے گھاٹے میں نہیں"۔

نکرہ جو سیاق نہی یا سیاق نفی میں واقع ہو: جیسے (فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ • الاسراء/ ۲۳)

(وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَ نَاخَزَائِنُہٗ ۔ الحجر / ۲۱) ''اور کوئی ایسی چیز نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں''۔ (ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ ۔ /البقرۃ /۲) (فَمَنْ فَرَضَ فِیْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدالَ فِی الْحَجِّ ۔ البقرۃ / ۱۹۷) ''تو جوان (مہینوں) میں حج کی نیت کرے تو نہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ ہو، نہ کوئی گناہ، نہ کسی سے جھگڑا''۔

نکرہ جو سیاق شرط میں ہو: جیسے (وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ اسْتَجارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى یَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ۔ التوبۃ/ ۶) ''اور اے محبوب اگر کوئی مشرک تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دو تا کہ وہ اللہ کا کلام سنے''۔

نکرہ جو سیاق امتنان میں ہو: جیسے (وَاَنْزَلْنَامِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُوْرًا ۔ الفرقان/ ۴۸) ''اور ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا پانی اتارا''۔

## عام کی تین قسمیں ہیں:

اول: وہ عام جو اپنے عموم پر باقی ہو، قاضی جلال الدین بُلقینی نے اس کی مثال نادر الوجود بتائی۔ برہان الدین زرکشی نے فرمایا: ایسا عام قرآن میں بکثرت ہے۔ جیسے: (اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٍ) ''بیشک اللہ ہر چیز سے باخبر ہے'' (اِنَّ اللّٰهَ لَایَظْلِمُ النَّاسَ شَیْئًا) ''بیشک اللہ لوگوں پر کچھ ظلم نہیں کرتا''۔ (وَلَا یَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا / الکھف ۴۹) ''اور تمھارا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا''۔

امام سیوطی نے فرمایا: یہ آیات غیر احکام فرعیہ سے متعلق ہیں۔ ظاہراً امام بلقینی کی مراد یہ ہے کہ احکام فرعیہ میں اس کی مثال نادر الوجود ہے، پھر فرماتے ہیں: میں نے غور وخوض کے بعد اس کی مثال میں ایک آیت تلاش کی ہے۔ ارشاد ربانی ہے (حُرِّمَتْ عَلَیْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ ۔۔۔ الآیۃ) یہاں جو حکم عموم ہے اس میں کوئی تخصیص نہیں۔

دوم: وہ عام جس سے کوئی فرد خاص مراد ہو جیسے (اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ ۔ ال عمران /۱۷۳) ''وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ لوگوں (مشرکوں) نے تمھارے لیے جتھا جوڑا تو ان سے ڈرو''۔

قائل صرف ایک شخص ہے: نعیم بن مسعود اشجعی یا بنی خزاعہ کا ایک اعرابی جیسا کہ ابن مردویہ نے حضرت ابو رافع سے روایت کی ہے۔ اور جیسے (فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ ال عمران /۳۹) ''تو فرشتوں نے اسے (زکریا کو) آواز دی اور وہ اپنی نماز کی جگہ کھڑا نماز پڑھ رہا تھا''۔

ملائکہ سے مراد حضرت جبریل ہیں جیسا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قراءت میں ہے۔

**سوم:** وہ عام جس سے کچھ افراد خاص کر دیے گئے ہوں، اس کی مثالیں بہت ہیں۔ بعض افراد کی تخصیص قرآن سے ہوگی یا حدیث سے یا اجماع سے یا قیاس سے۔ ان سب کی مثالیں یہاں ذکر کی جا رہی ہیں:

**عام مخصوص بالقرآن کی مثالیں:** (وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ ۰ /۲۲۸[۱]) یہ اللہ تعالیٰ کے قول: (اِذَانَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ ۰ الاحزاب/۴۹[۲]) اور اللہ تعالیٰ کے قول: (وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۰ الطلاق/ ۶[۳]) سے مخصوص ہے۔ مطلقہ عورتوں کی عدت تین حیض ہے۔ مگر غیر مدخولہ کے لیے کوئی عدت نہیں۔ اور مدخولہ حاملہ کی عدت وضع حمل تک ہے۔

**اللہ تعالیٰ کے قول:** (حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ ۰ المائدۃ/۳[۴]) میں مذکور "المیتة" (مردار) سے "سمك" (مچھلی) کو اللہ تعالیٰ کے قول: (وَاُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِلسَّيَّارَةِ ۰ المائدۃ/ ۹۶[۵]) سے اور دمِ جامد (نہ بہنے والے خون) کو "الدم" سے اللہ تعالیٰ کے قول: (اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا ۰ الانعام/ ۱۴۵[۶]) سے خاص کر دیا گیا۔

**اللہ تعالیٰ کے قول:** (وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا ۰ النساء/ ۲۰[۷]) کو اللہ تعالیٰ کے قول: (فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَاافْتَدَتْ بِهٖ ۰ البقرۃ/ ۲۲۹[۸]) سے خاص کر دیا گیا۔

**ارشاد خداوندی:** (اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۰ النور/۲[۹]) کو ارشاد باری تعالیٰ: (فَاِذَا اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ۰ النساء/ ۲۵[۱۰]) سے خاص کر دیا گیا۔

**اللہ تعالیٰ کے قول:** فَانْكِحُوْامَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۰ النساء/۳[۱۱]) کو اللہ تعالیٰ کے قول: (حرمت عليكم امهٰتكم، الخ) میں مذکور محرمات سے خاص کر دیا گیا۔

---

[۱] اور طلاق والیاں اپنی جانوں کو روکے رکھیں تین حیض تک۔ [۲] اے ایمان والو! جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو پھر انھیں بے ہاتھ لگائے چھوڑ دو تو تمھارے لیے ان پر کچھ عدت نہیں۔ [۳] حمل والیوں کی میعاد (عدت) یہ ہے کہ وہ اپنا حمل جن لیں۔ [۴] تم پر مردار اور خون حرام کیے گئے۔ [۵] حلال ہے تمھارے لیے دریا کا شکار اور اس کا کھانا تمھارے لیے اور مسافروں کے فائدے کو۔ [۶] پوری عبارت اس طرح ہے: قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْمَا اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا : تم فرماؤ میں نہیں پاتا اس میں جو میری طرف وحی ہوئی کسی کھانے والے پر کوئی کھانا حرام مگر یہ کہ مردار ہو یا رگوں کا بہتا خون۔ [۷] اگر تم ایک بیوی کے بدلے دوسری بدلنا چاہو اور اسے ڈھیروں مال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔ [۸] تو ان پر یعنی میاں بیوی پر اس میں کچھ گناہ نہیں کہ بدلہ دے کر عورت چھٹی لے۔ [۹] جو عورت اور مرد بدکار ہوں تو ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔ [۱۰] جب وہ یعنی باندیاں قید میں آجائیں (شوہر دار ہو جائیں) پھر برا کام کریں تو ان پر اس سزا کی آدھی ہے جو غیر شادی شدہ آزاد عورتوں پر ہے۔ [۱۱] تو نکاح میں لاؤ وہ عورتیں جو تمھیں خوش آئیں، خواہ وہ دو ہوں یا تین ہوں یا چار۔

## عام مخصوص بالحدیث کی چند مثالیں:

اللہ تعالیٰ کے قول: (واحل الله البیع) سے لوگوں کے درمیان رائج بے شمار بیوع فاسدہ کو حدیث کے ذریعہ خاص کر دیا گیا اور (حرم الربوا۔ البقرۃ/ ۲۷۵) سے "عرایا" [۱] کو حدیث سے خاص کر دیا گیا۔

آیات مواریث سے قاتل اور مخالفِ دین شخص کو، آیاتِ تحریم میں مردار سے ٹڈی کو اور آیت (ثلثة قروء ۔ البقرۃ / ۲۲۸) سے باندی کو حدیث کی وجہ سے خاص کر دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ کے قول: (ماء طهورا۔ الفرقان/ ۴۸) سے حدیث رسول کے سبب وہ پانی خارج ہے جو قلیل ہو اور اس میں نجاست پڑ گئی ہو۔

اللہ تعالیٰ کے قول: (وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا ۔ المائدۃ/ ۳۸[۲]) سے سنت کے سبب وہ چور خارج ہے جس نے چوتھائی دینار سے کم کی چوری کی ہو۔

عام مخصوص بالاجماع کی ایک مثال علامہ مکی کے بیان کے مطابق آیت مواریث (وہ مال جو وراثت میں ملیں) ہے جس سے غلام خارج ہے کہ باجماع مجتہدینِ امت وہ وارث نہ ہوگا۔

عام مخصوص بالقیاس کی ایک مثال علامہ مکی ہی کے بیان کے مطابق آیت زنا (فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة ۔ النور/ ۲) ہے جس سے غلام کو اس باندی پر قیاس کرنے کے سبب خارج کر دیا گیا جو آیتِ فاجلدوا الخ کے عموم کی تخصیص کرنے والے ارشاد خداوندی: (فعليهن نصف ما على المحصنٰت من العذاب ۔ النساء/ ۲۵) میں صراحتاً تعیین کے ساتھ مذکور ہے۔

قرآن کریم میں عام مخصوص کی بکثرت مثالیں ہیں اور یہ قسم منسوخ سے بھی کہیں زیادہ ہے کیوں کہ قرآن میں کوئی ایسا عام نہیں جسے خاص نہ کر دیا گیا ہو ماسوائے قلیل آیات کے جو اپنے عموم پر باقی ہیں ان میں کوئی تخصیص نہیں ہوئی۔ جیسے: (وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۔ النساء/ ۱۷۶[۳]) (هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۔ الاعراف/ ۱۸۹[۴]) (حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ ۔ النساء/ ۲۳[۵])

## فصل

خاص القرآن کی ایک نوع وہ بھی ہے جو سنت کے عموم کی تخصیص کرتی ہے گو یہ نوع بہت کم یاب ہے۔ چند مثالیں ذیل میں ذکر کی جاتی ہیں:

---

[۱] عَرَایَا، عریہ کی جمع ہے، عریہ یہ ہے کہ مالکِ نخلستان اپنے ایک یا دو درختوں کا پھل کسی شخص کو اس طور پر دے دے کہ وہ اسے اپنے عیال کے لیے چن لے گا پھر باغ میں اس شخص کے آنے جانے سے مالک کو دشواری ہو تو مالک اس سے درخواست کرے کہ وہ اس پھل سے اس کے حق میں اس شرط پر دستبردار ہو جائے کہ پھل توڑنے کا وقت آنے پر اسے پھل کے عوض اتنی ہی خشک کھجوریں ناپ کر دے دے گا۔ (بدائع الصنائع، جزء رابع، کتاب البیوع/ حکم المزابنة/ ص ۴۴۰) [۲] اور جو مرد یا عورت چور ہو تو ان کے ہاتھ کاٹو۔ [۳] اور اللہ ہر چیز سے خوب آگاہ ہے۔ [۴] وہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا فرمایا۔ [۵] تم پر تمھاری مائیں حرام کی گئیں۔

اللہ تعالیٰ کے قول: (حَتّٰی یُعۡطُوا الۡجِزۡیَةَ عَنۡ یَّدٍ وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ ۰ التوبة / ۲۹[۱]) نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول: "اُمِرۡتُ اَنۡ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَقُوۡلُوۡا : لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ "[۲] کے عموم کی تخصیص کر دی۔

اللہ تعالیٰ کے قول: ( وَمِنۡ اَصۡوَافِهَا وَاَوۡبَارِهَا وَاَشۡعَارِهَا اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰی حِیۡنٍ النحل / ۸۰[۳]) نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول: مَا اُبِیۡنَ مِنۡ حَیٍّ فَهُوَ مَیِّتٌ "[۴] کے عموم کو خاص کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کے قول: (وَالۡعٰمِلِیۡنَ عَلَیۡهَا، وَالۡمُؤَلَّفَةِ قُلُوۡبُهُمۡ ۰ التوبة / ٦[۵]) نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول: " لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِیٍّ وَلَا لِذِیۡ مِرَّةٍ سَوِیٍّ "[٦] کے عموم کو خاص کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کے قول: ( فَقٰتِلُوا الَّتِیۡ تَبۡغِیۡ ۰ الحجرات/ ۹[۷]) نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد: " اِذَا الۡتَقَی الۡمُسۡلِمَانِ بِسَیۡفَیۡهِما فَالۡقَاتِلُ وَالۡمَقۡتُوۡلُ فِی النَّارِ" کے عموم کو خاص کر دیا۔ "جب دو مسلمان اپنی تلواروں کے ساتھ آمنے سامنے آجائیں تو قاتل و مقتول دونوں جہنمی ہیں۔"

## عموم و خصوص سے متعلق کچھ متفرق فرعیں

فرع اول: جب عام، مدح یا ذم کے لیے ذکر کیا جائے تو وہ اپنے عموم پر باقی رہتا ہے یا نہیں۔ اس بابت چند مذاہب ہیں:

مذہب اول: ہاں! اپنے عموم پر باقی رہتا ہے کیوں کہ اس عموم سے پھیرنے والا کوئی قرینہ موجود نہیں اور عموم و مدح یا عموم و ذم کے درمیان کوئی تنافی نہیں۔

مذہب دوم: نہیں! اپنے عموم پر باقی نہیں رہتا کیوں کہ اسے عموم پر دلالت کرنے کے لیے نہیں بلکہ مدح یا ذم کے لیے ذکر کیا گیا ہے۔

مذہب سوم: اس میں تفصیل ہے اور یہی صحیح تر ہے۔ اگر مدح یا ذم کے لیے آئے ہوئے اس عام کا معارض کوئی ایسا دوسرا عام مذکور نہ ہو جو مدح یا ذم کے لیے نہ ہو تو یہ عام اپنے عموم پر باقی رہے گا۔

---

[۱] پوری آیت یوں ہے: قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ لا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ ولا بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوۡنَ ما حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ وَلَا یَدِیۡنُوۡنَ دِیۡنَ الۡحَقِّ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ حَتّٰی... لڑو ان سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور قیامت پر اور حرام نہیں مانتے اس چیز کو جس کو حرام کیا اللہ اور اس کے رسول نے اور سچے دین کے تابع نہیں ہوتے یعنی وہ جو کتاب دیے گئے جب تک اپنے ہاتھ سے جزیہ نہ دیں ذلیل ہو کر۔ [۲] مجھے لوگوں سے اس وقت تک لڑنے کا حکم دیا گیا جب تک وہ لا الہ الا اللہ نہ کہہ لیں۔ [۳] اور تمھارے لیے اون والے چوپایوں کے اون اور اونٹ اور بکری کے بالوں سے ایک وقت تک کے لیے گرہستی کا کچھ سامان اور برتنے کی چیزیں بنائیں۔ [۴] زندہ جانور کا جو حصہ بھی اس سے الگ کر دیا جائے وہ مردار ہے۔ [۵] اور (زکوۃ ان کے لیے ہے) جو اسے تحصیل کر کے لائیں اور ان کے لیے ہے جن کے دلوں کو اسلام سے الفت دی جائے [٦] صدقہ نہ تو غنی کے لیے حلال ہے نہ تندرست و توانا مرد کے لیے۔ [۷] پوری عبارت یوں ہے: فَقَاتِلُوا التی تَبۡغِیۡ حَتّٰی تَفِیۡءَ اِلٰی اَمۡرِ اللّٰهِ: تو اس زیادتی والے گروہ سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔

اور اگر کوئی دوسرا ''عامِ معارض'' مذکور ہو تو دونوں کے درمیان تطبیق کی غرض سے مدح یا ذم کے لیے آیا ہوا عام اپنے عموم پر نہ رہے گا۔

عام بلا معارض کی مثال اللہ تعالیٰ کا قول: (اِنَّ الْاَ بْرَارَ لَفِی نَعِیْمٍ ، وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِی جَحِیْمٍ ۔ الانفطار/ ١٤ [١]) ہے۔ اور عام مع المعارض کی مثال اللہ تعالیٰ کا قول: (وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حٰفِظُوْنَ ، اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِھِمْ اَوْمَامَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ فَاِنَّھُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ۔ المؤمنون/٦ ،المعارج/ ٣٠[٢]) ہے۔

چوں کہ یہ قول مدح کے لیے لایا گیا جس کا ظاہرِ مفہوم ان دو بہنوں کو بھی عام ہے جو ایک ساتھ کسی کی ملکیت میں ہوں اور اس ''عموم'' میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول: ( وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ ۔ النساء / ٢٣[٣]) قول بالا کا معارض ہے کیوں کہ یہ مِلک یمین کے ذریعے دو بہنوں کو جمع کرنے کی حرمت کو بھی شامل ہے اور مدح کے لیے لایا بھی نہیں گیا ہے اس لیے یہ مانا جائے گا کہ مَا مَلَکَتْ اَیْمٰنُھُمْ میں ملک یمن والی دو بہنوں کا شمول مقصود نہیں یعنی مومنین کی مدح میں جو فرمایا گیا کہ وہ اپنی زوجات اور باندیوں کے ماسوا سے اپنی شرم گاہیں محفوظ رکھتے ہیں ،اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسی دو باندیوں سے قربت کرتے ہیں جو آپس میں بہنیں ہیں۔

فرع دوم: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص خطاب مثلاً (یَآ یُّھَا النَّبِیُّ) اور (یٰاَیُّھَاالرَّسُوْلُ) میں علما کے درمیان اختلاف ہوا کہ اس میں آپ کی امت بھی شامل ہے یا نہیں؟

ایک قول یہ ہے کہ ہاں !اس میں امت بھی شامل ہے۔ اس لیے کہ جو حکم مقتدا کے لیے ہوتا ہے وہ عرف میں اس کے پیروکاروں کے لیے بھی ہوتا ہے۔

لیکن چوں کہ صیغہ حضور کے ساتھ خاص ہے اس لیے اس میں زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ اس خطاب کے تحت امت شامل نہیں۔

فرع سوم: (یٰاَیُّھَا النَّاسُ ) سے ہونے والے خطاب میں رسول کے شامل ہونے یا نہ ہونے کے سوال پر اختلاف کے نتیجے میں علما کے چند مذاہب ہیں:

صحیح ترین اور اکثر کا مذہب یہ ہے کہ چوں کہ یہ صیغہ عام ہے اس لیے اس میں حضور بھی شامل ہوں گے۔

ابن ابی حاتم نے زہری سے تخریج کی کہ انھوں نے کہا: جب اللہ تعالیٰ ( یٰاَیھا الذین اٰمنوا افعلوا ) کہے تو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی ایمان والوں میں شامل ہوں گے۔

---

[١] بیشک نیکوکار ضرور چین میں ہیں۔ اور بیشک بدکار ضرور دوزخ میں ہیں۔ [٢] اور وہ جو اپنی بیویوں اور شرعی باندیوں کے علاوہ دوسری عورتوں سے اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں تو ان پر کوئی ملامت نہیں۔ [٣] اور تمھارے اوپر دو بہنوں کو جمع کرنا حرام کیا گیا۔

مذہب دوم: اس میں حضور شامل نہیں کیوں کہ یہ محض دوسروں کی تبلیغ کے لیے حضور کی زبان پر جاری ہوا ہے اور اس لیے بھی شامل نہیں کہ حضور کو جو امتیازی خصوصیات حاصل ہیں وہ دوسروں کو حاصل نہیں۔

مذہب سوم: اگر یہ "قُلْ" کے ساتھ آیا ہو تو یہ حضور کو شامل نہ ہوگا کیوں کہ اب اس کا تبلیغ میں ہونا ظاہر و آشکار ہے۔ اور یہی اس کے حضور کو شامل نہ ہونے کا قرینہ بھی ہوگا۔ لیکن اگر اس کے ساتھ "قل" نہ آیا ہو تو یہ حضور کو بھی شامل ہوگا۔

مذہب چہارم: اصول میں صحیح ترین قول یہ ہے کہ "یاَیہا الناس" سے خطاب کافر اور غلام کو بھی شامل ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ کافر کو شامل نہ ہوگا کیوں کہ وہ فروع کا مکلّف نہیں اور غلام کو بھی شامل نہ ہوگا کیوں کہ شرعاً اس کے تمام منافع کا مالک اس کا آقا ہوتا ہے خود وہ مالک نہیں ہوتا۔

## قرآن میں وارد مجمل اور مُبَیَّن

مجمل: وہ ہے جس کی دلالت ظاہر نہ ہو۔

یہ قرآن میں واقع ہے، مگر داؤد ظاہری اس کے مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں کہ قرآن میں کوئی لفظ مجمل بھی وارد ہے۔

مجمل کے مجمل باقی رہنے کے جواز میں چند اقوال ہیں جن میں صحیح ترین قول یہ ہے کہ مجمل اپنے مضمون پر عمل کا مکلّف باقی نہیں رہتا۔ بخلاف غیر مجمل کے کہ وہ مکلّف ہوتا ہے۔

چند آیات میں اختلاف ہوا کہ آیا یہ مجمل کی قبیل سے ہیں یا نہیں۔

[۱] ان میں ایک آیت، آیتِ سرقہ ہے۔ اس کے تعلق سے ایک قول یہ ہے کہ یہ "ید" میں مجمل ہے اس لیے کہ لفظ ید ایک ایسے عضو پر بولا جاتا ہے جو گٹے، کہنی، اور مونڈھے کو بھی شامل ہے، یوں پتہ نہیں چلتا کہ ہاتھ کو گٹے تک کاٹا جائے یا کہنی یا مونڈھے تک کاٹا جائے۔ اسی طرح یہ آیت "قطع" میں بھی مجمل ہے کیوں کہ یہ لفظ جس طرح کسی چیز کو کاٹ کر الگ کر دینے پر بولا جاتا ہے اسی طرح زخمی کرنے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور یہاں ان دونوں میں سے کوئی بھی معنی ظاہر نہیں اس لیے شارع علیہ السلام کا گٹے سے ہاتھ کو کاٹنا اس بات کا بیان ہے کہ آیت میں ید سے گٹے تک ہاتھ اور قطع سے "الگ کر دینا" مراد ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس آیت میں قطع کے سلسلے میں کوئی اجمال نہیں ہے اس لیے کہ یہ لفظ "الگ کر دینے" کے معنی میں بالکل ظاہر ہے۔

[۲] ایک آیت (وَامۡسَحُوۡا بِرُءُوۡسِکُمۡ ۔ المائدۃ/ ٦) ہے۔ اس میں ایک قول یہ ہے کہ مجمل ہے کیوں کہ اس میں یہ احتمال ہے کہ اس سے مراد پورے سر کا مسح ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ سر کے کچھ حصے کا مسح

مراد ہو۔ مگر شارع علیہ السلام کے سر کے اگلے حصے پر مسح فرما لینے سے بیان ہو گیا کہ کچھ حصے کا مسح مراد ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آیتِ کریمہ مجمل نہیں مطلق ہے تو جسے بھی مسح کہا جا سکے اس کی بجا آوری کر کے بری الذمہ ہو جائے گا۔

[۳] وہ آیات جن میں اسماے شرعیہ ہیں۔ جیسے (وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۔ البقرۃ/ ۴۳، البقرۃ/ ۸۳، البقرۃ/ ۱۱۰، النساء / ۷۷، النور/ ۵۶، المزمل/ ۲۰ [۱])، (فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۔ البقرۃ/ ۱۸۵ [۲]) اور (وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۔ آل عمران/ ۹۷ [۳]) میں ایک قول یہ ہے کہ یہ آیتیں مجمل ہیں کیوں کہ لفظ صلوۃ ہر دعا، لفظ صوم ہر امساک (باز رہنے) اور لفظ حج ہر قصد کا احتمال رکھتا ہے۔ اور ان الفاظ سے جو بھی مراد ہے اس کی تعیین میں لغت کا کوئی دخل نہیں اس لیے تعیینِ مراد، بیان شارع کی محتاج ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ مجمل نہیں بلکہ یہ الفاظ، سبھی معانی مذکورہ کو شامل ہیں، مگر دلیل جسے خاص کر دے وہ الگ ہو جائے گا۔

## قرآن کے ناسخ و منسوخ کا بیان

اس نوع میں چند مسائل ہیں:

**[۱]** نسخ کئی معنوں میں آتا ہے:

[۱] زائل کرنا، محو کرنا، جیسے ارشاد باری تعالیٰ: (فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ، ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۔ الحج/ ۵۲ [۴])

[۲] تبدیل کرنا، بدل دینا، جیسے (وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۔ النحل/ ۱۰۱ [۵])

[۳] دوسرے کے حوالے کر دینا جیسے "تناسخ مواریث" جس کے معنی ہیں مال وراثت کو ایک شخص سے دوسرے شخص کے حوالے کر دینا۔

[۴] ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا، منتقل کرنا جیسے نَسَخْتُ الْكِتَابَ میں نے کتاب نقل کی۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب ایک کتاب کے لفظ اور خط کی پابندی کرتے ہوئے اسی طرح دوسری جگہ لکھیں۔

---

[۱] اور نماز قائم کرو اور زکاۃ دو [۲] تو تم میں جو رمضان کا یہ مہینہ پائے وہ اس کے روزے رکھے۔ [۳] اور جو اللہ کے گھر تک پہنچنے کی قدرت رکھتے ہوں ان پر اس کا حج فرض ہے۔ [۴] پوری عبارت یوں ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ : اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول یا نبی بھیجے ان سب پر یہ واقعہ گذرا ہے کہ جب انھوں نے پڑھا تو شیطان نے ان کے پڑھنے میں لوگوں پر کچھ اپنی طرف سے ملا دیا تو مٹا دیتا ہے اللہ اس شیطان کے ڈالے ہوئے کو پھر اللہ اپنی آیتیں پکی کر دیتا ہے۔ [۵] پوری عبارت اس طرح ہے: وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ : اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدلتے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے جو اتارتا ہے تو کافر کہتے ہیں تم تو دل سے بنا لاتے ہو۔

[۲] کہا گیا کہ نسخ اس امت کی خصوصیات سے ہے جسے رب تعالیٰ نے کچھ حکمتوں کے تحت اس امت کے لیے رکھا ہے۔ ان حکمتوں میں سے ایک حکمت ہے آسانی پیدا کرنا۔

تمام مسلمانوں کا نسخ کے جواز پر اجماع ہے۔ ہاں یہودیوں نے اس کا انکار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ نسخ ''بدا'' ہے۔ جیسے کسی معاملہ میں کسی شخص کی ایک رائے ہوئی، پھر بدل کر دوسری رائے ہوگئی۔ لیکن ان کا یہ خیال باطل ہے کیوں کہ یہ تو محض مدتِ حکم کا بیان ہے تو جس طرح موت دینے کے بعد زندہ کرنا اور زندہ کرنے کے بعد موت دینا، صحت وتندرستی کے بعد بیماری اور بیماری کے بعد صحت وتندرستی، مالداری کے بعد محتاجی اور محتاجی کے بعد مالداری دینا بدا نہیں اسی طرح امر ونہی بھی بدا نہیں۔

ناسخ میں علما کا اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں: قرآن کا نسخ قرآن ہی سے ہوگا، حدیث سے نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ارشاد باری ہے: (مَانَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا ۔ البقرۃ / ۱۰۶) ''ہم جو آیت بھی منسوخ کریں یا اسے بھلادیں تو اس سے بہتر یا اس کے مثل لے آئیں''۔

ان کے بقول قرآن سے بہتر یا قرآن جیسا صرف قرآن ہوسکتا ہے حدیث نہیں ہوسکتی۔

دوسرا قول یہ ہے کہ قرآن کا نسخ حدیث سے بھی ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ حدیث بھی اللہ ہی کی جانب سے ہے۔ چنانچہ فرمانِ خداوندی ہے: (وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى ۔ النجم / ۳) ۔'' یہ نبی اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے''۔

[۳] نسخ صرف امر اور نہی میں ہوتا ہے اگر چہ وہ امر یا نہی لفظاً خبر ہو۔ ہاں اس خبر میں نسخ جاری نہیں ہوتا جو طلب کے معنی میں نہ ہو جیسے وعدہ اور وعید۔

اس سے ان لوگوں کی خطا واضح ہوجاتی ہے جنھوں نے بیانِ نسخ سے متعلق کتابوں میں خبر اور وعدہ ووعید پر مشتمل آیات بھی داخل کردی ہیں۔

[۴] نسخ کی کئی قسمیں ہیں:

[۱] مامور بہ (جس کا حکم دیا گیا ہو) پر عمل ہونے سے پہلے ہی اس کو منسوخ کردینا جیسے آیت نجویٰ۔ یہی حقیقی نسخ ہے۔

[۲] کسی ایسے امر کو منسوخ کردینا جو ہم سے پہلے کی امتوں کے لیے مشروع رہا ہو جیسے قصاص اور دیت (خوں بہا) کو مشروع قرار دینے والی آیت سے یہود پر صرف قصاص اور نصاریٰ پر صرف دیت کے فرض ہونے کا حکم اسلام میں منسوخ ہوگیا اور ولی مقتول کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ قاتل کو بے عوض معاف کرے یا مال پر صلح کرے یا قصاص لے، یا ایسے امر کو منسوخ کردینا جس کا حکم اجمالی طور پر دیا گیا ہو جیسے بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کو کعبہ کی طرف رخ کرنے سے منسوخ کردینا اور

روزۂ عاشورا کو روزۂ رمضان سے منسوخ کر دینا۔ اسے مجازاً نسخ کہا جاتا ہے۔

[۳] کوئی ایسی بات جس کا حکم کسی سبب کے پائے جانے پر دیا گیا ہو پھر وہ سبب نہ رہا تو وہ حکم بھی نہ رہا۔ جیسے مسلمانوں کے کمزور و ناتواں اور عددی اعتبار سے قلیل ہونے کے وقت انھیں صبر اور عفو و درگذر کا حکم دینا پھر جہاد کو فرض قرار دے کر منسوخ کر دینا۔

یہ بھی حقیقت میں نسخ نہیں بلکہ یہ قسمِ مُنسَأ (مؤخر) سے ہے جیسا کہ ایک سبعی قراءت میں ہے:( اَوْ نَنْسَأْهَا ، البقرة / ١٠٦[1]) یہاں منسأ کا یہ مطلب ہے کہ مسلمانوں کے طاقت ور ہو جانے پر جہاد کا حکم ہوگا اور کمزوری کی حالت میں کافروں کی ایذا رسانی پر صبر کی فرضیت کا حکم ہے۔

ہمارے اس بیان سے بہت سے مفسرین کا یہ قول کمزور ہو جاتا ہے کہ صبر و درگذر والی آیت کریمہ، آیتِ سیف سے منسوخ ہے۔ کیوں کہ ایسا ہے نہیں بلکہ آیت سیف کا حکم مؤخر ہے۔ یعنی جو حکم بھی وارد ہوا اس کی بجا آوری کسی زمانے میں فرض ہے کسی ایسی علت کے تحت جو اس حکم کی مقتضی ہوتی ہے۔ پھر اس علت کے نہ رہنے کی وجہ سے وہ حکم بھی نہیں رہتا بلکہ دوسرا حکم آ جاتا ہے۔

یہ بھی نسخ نہیں۔ اس لیے کہ نسخ حکم کو اس طرح ختم کر دینے کا نام ہے کہ اس کی بجا آوری روا نہ ہو۔ یہاں ایسا نہیں۔

**[۵]** :بعض علما نے کہا: ناسخ و منسوخ کے اعتبار سے قرآن کی سورتوں کی چند قسمیں ہیں:

پہلی قسم: جس میں نہ تو کوئی ناسخ ہو اور نہ کوئی منسوخ۔ ایسی سورتیں ۴۳ ہیں۔

[۱] سورۂ فاتحہ [۲] سورۂ یوسف [۳] سورۂ یٰسین [۴] سورۂ حجرات [۵] سورۂ رحمٰن [۶] سورۂ حدید [۷] سورۂ صف [۸] سورۂ جمعہ [۹] سورۂ تحریم [۱۰] سورۂ ملک [۱۱] سورۂ حاقہ [۱۲] سورۂ نوح [۱۳] سورۂ جن [۱۴] سورۂ مرسلات [۱۵] سورۂ عم [۱۶] سورۂ نازعات [۱۷] سورۂ انفطار [۱۸] سورۂ مطففین [۱۹] سورۂ انشقاق [۲۰] سورۂ بروج [۲۱] سورۂ فجر [۲۲] سورۂ بلد [۲۳] سورۂ شمس [۲۴] سورۂ لیل [۲۵] سورۂ ضحیٰ [۲۶] سورۂ انشراح [۲۷] سورۂ علق [۲۸] سورۂ قدر [۲۹] سورۂ بینہ [۳۰] سورۂ زلزال [۳۱] سورۂ عادیات [۳۲] سورۂ قارعہ [۳۳] سورۂ تکاثر [۳۴] سورۂ ہمزہ [۳۵] سورۂ فیل [۳۶] سورۂ قریش [۳۷] سورۂ ماعون [۳۸] سورۂ کوثر [۳۹] سورۂ نصر [۴۰] سورۂ لہب [۴۱] سورۂ اخلاص [۴۲] سورۂ فلق [۴۳] سورۂ ناس۔

دوسری قسم: جس میں ناسخ و منسوخ دونوں ہوں۔ یہ کل ۲۵/ سورتیں ہیں۔ (اتقان وزبدۃ الاتقان میں یہاں کل ۲۰/ ہی سورتوں کے نام درج ہیں)

---

[1] (ننساها: ایک سبعی قراءت ہے۔) یاں ہم اسے یعنی کسی آیت کو مؤخر کر دیں گے۔

[۱] سورۂ بقرہ [۲] سورۂ آل عمران [۳] سورۂ نساء [۴] سورۂ مائدہ [۵] سورۂ حج [۶] سورۂ نور [۷] سورۂ فرقان [۸] سورۂ شعراء [۹] سورۂ احزاب [۱۰] سورۂ سبأ [۱۱] سورۂ مؤمن [۱۲] سورۂ شوریٰ [۱۳] سورۂ ذاریات [۱۴] سورۂ طور [۱۵] سورۂ واقعہ [۱۶] سورۂ مجادلہ [۱۷] سورۂ مزمل [۱۸] سورۂ مدثر [۱۹] سورۂ کوّرت [۲۰] سورۂ عصر۔

تیسری قسم: جس میں صرف ناسخ ہو۔ یہ کل چھ سورتیں ہیں:

[۱] سورۂ فتح [۲] سورۂ حشر [۳] سورۂ منافقون [۴] سورۂ تغابن [۵] سورۂ طلاق [۶] سورۂ اعلیٰ۔

چوتھی قسم: جس میں صرف منسوخ ہو۔ یہ ان علما کے بقول باقی ماندہ چالیس سورتیں ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے منسأ اور مخصوص کو بھی منسوخ میں شمار کرلیا ہے۔

[٦] قرآن میں آئے ہوئے نسخ کی تین نوعیں ہیں:

نوع اول: جس کی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہوں۔

حضرت عائشہ نے فرمایا: نازل شدہ آیات میں ایک آیت "عَشَرُ رَضَعَاتٍ مَّعْلُوْمَاتٍ يُّحَرِّمْنَ "[۱] تھی۔ پھر اسے "خَمسٌ مَّعْلُوْمَاتٌ " سے منسوخ کر دیا گیا۔ جب رسول اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو "خمس معلومات "[۲] کی تلاوت کی جاتی تھی۔ (رواہ الشیخان)

علما نے حضرت عائشہ کے قول "وَهُنَّ مِمَّا يُقْرَأُ "[۳] پر کلام کیا ہے کہ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تلاوت حضور کی وفات کے بعد بھی باقی تھی حالاں کہ یہ بات صحیح نہیں۔

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ حضرت عائشہ کی مراد یہ ہے کہ قربِ زمانۂ وفاتِ اقدس میں اس کی تلاوت جاری تھی یا اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور کی حیات مبارکہ ہی میں تلاوت بھی منسوخ ہو چکی تھی لیکن اس نسخ کی اطلاع تمام لوگوں تک نہ پہنچ پائی اس لیے وفات کے بعد بھی بعض لوگ اس کی قراءت کرتے رہے۔ سب لوگوں کو نسخ کا علم بعد میں ہو سکا۔

نوع دوم: جس کا حکم منسوخ ہو، تلاوت منسوخ نہ ہو۔

یہی وہ قسم ہے جس میں علما کی تالیف کردہ کتابیں موجود ہیں۔

لوگوں نے اس قسم سے متعلق بہت سی آیتوں کا شمار کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قسم انتہائی قلیل ہے۔ اسی لیے علمائے محققین جیسے قاضی ابوبکر ابن العربی نے اس قسم کو تحقیق سے بیان کیا ہے۔

---

[۱] دودھ پیتے بچے کی دس معلوم چسکیاں حرمت رضاعت کو ثابت کر دیتی ہیں۔ [۲] پانچ معلوم چسکیاں حرمت رضاعت کو ثابت کرتی ہیں۔
[۳] یعنی آیتِ خَمسُ رَضَعَاتٍ مَعْلُوْمَاتٍ يُّحَرِّمْنَ، قرآن کے ایک جز کے طور پر پڑھی جاتی تھی۔

قرآن کریم سے اس کی چند مثالیں:

[۱] آیت (كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ، البقرة / ۱۸۰[۱]) یہ ایک قول کے مطابق آیت مواریث، دوسرے قول پر حدیث أَلَا لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ[۲] اور تیسرے قول کے مطابق اجماع امت سے منسوخ ہے۔ اسے ابن عربی نے نقل کیا۔

[۲] اللہ تعالیٰ کا قول: (وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ ، البقرة / ۱۸۴[۳]) ایک قول پر اللہ تعالیٰ کے قول: (فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ، البقرة / ۱۸۵[۴]) سے منسوخ ہے۔ جب کہ دوسرا قول یہ ہے کہ آیت کریمہ منسوخ نہیں بلکہ محکم ہے اور يطيقونه سے پہلے لا مقدر ہے۔

[۳] آیت (أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلٰى نِسَائِكُمْ ، البقرة / ۱۸۷[۵]) نے آیت (يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ، البقرة / ۱۸۳[۶]) کو منسوخ کر دیا۔ کیوں کہ ابن عربی کے بیان کے مطابق اس کا مقتضیٰ تو یہ ہے کہ نیند کے بعد کھانے اور بیوی سے جماع کرنے کو حرام قرار دینے میں ان گذشتہ امتوں کی موافقت کی جائے جن پر یہ دونوں کام حرام تھے۔ ابن عربی نے ہی ایک دوسرا قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ روزے کی رات میں نیند کے بعد کھانے اور جماع کی حرمت سنت سے ثابت تھی آیت نے اسے منسوخ کر دیا۔

[۴] اللہ تعالیٰ کا قول: (يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ، البقرة / ۲۱۷[۷])، اللہ تعالیٰ کے قول: (وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَافَّةً ، التوبة / ۳۶[۸]) سے منسوخ ہے۔ اسے ابن جریر نے عطاء بن میسرہ سے روایت کیا۔

[۵] آیت کریمہ (وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ أَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ ، البقرة / ۲۴۰[۹]) آیت کریمہ (وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ أَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ، البقره / ۲۳۴[۱۰]) سے اس طرح منسوخ ہے کہ پہلی آیت کریمہ افادہ کر رہی ہے کہ شوہر کی وفات کے بعد اس کی بیوی کو اس کے مال سے ایک سال تک نان و

---

[۱] تم پر فرض ہوا کہ تم میں کوئی موت آنے کے وقت اگر کچھ مال چھوڑے تو موافق دستور اپنے ماں باپ اور قریب کے رشتہ داروں کے لیے وصیت کر جائے۔ [۲] خبردار! کسی وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔ [۳] اور جنھیں روزہ رکھنے کی طاقت ہو ان پر (روزہ نہ رکھنے کی صورت میں) اس کا عوض دینا واجب ہے۔ [اور يطيقونه: سے پہلے لا، مقدر ہونے پر معنی ہوگا: ان لوگوں پر فدیہ واجب ہے جو روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں] [۴] تو تم میں جو یہ مہینہ پائے وہ اس کے روزے رکھے۔ [۵] روزوں کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا تمھارے لیے حلال ہوا۔ [۶] اے ایمان والو تم پر روزے فرض کیے گئے جیسے اگلوں پر ہوئے تھے۔ [۷] تم سے پوچھتے ہیں ماہ حرام میں لڑنے کا حکم تم فرماؤ اس میں لڑنا بڑا گناہ ہے۔ [۸] اور مشرکوں سے ہر وقت لڑو جیسا وہ تم سے ہر وقت لڑتے ہیں۔ [۹] اور تم میں جو مریں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ اپنی عورتوں کے لیے سال بھر تک نان ونفقہ دینے کی وصیت کر جائیں۔ [۱۰] اور تم میں جو مریں اور بیویاں چھوڑیں وہ چار مہینے دس دن اپنے آپ کو روکے رہیں۔

نفقہ ملے گا جب کہ دوسری آیت کریمہ نے اسے منسوخ کرتے ہوئے بتایا کہ اس کی بیوی صرف چار مہینے دس دن تک ہی نان ونفقہ پانے کا حق رکھتی ہے۔ پہلی آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ شوہر کو اپنی وفات سے پہلے اپنی بیوی کے لیے مال کی وصیت کر دینی چاہیے تو یہ آیتِ میراث سے منسوخ ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے شوہر متوفیٰ کے ترکے سے حصہ مقرر کر دیا ہے۔ اب اس کے حق میں وصیت کرنا جائز نہیں۔ رہا ایک سال تک سکنیٰ یعنی رہایش گاہ کی فراہمی کا معاملہ تو کچھ علما کے نزدیک یہ باقی ہے مگر کچھ دوسرے علما کے نزدیک یہ بھی حدیث "لَا سُکْنٰی" سے منسوخ ہے۔

[۶] اللہ تعالیٰ کا قول: (وَاِنْ تُبْدُ وَامَا فِی اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ ۰ البقرۃ / ۲۸۴ [۱]) بعد میں آئے ہوئے اللہ تعالیٰ کے قول: (لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ۰ البقرۃ / ۲۸۶ [۲]) سے منسوخ ہے۔

[۷] اللہ تعالیٰ کا قول: (اِتَّقُوااللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ ۰ اٰل عمران / ۱۰۲ [۳]) ایک قول پر اللہ تعالیٰ کے قول: (فَاتَّقُوا اللّٰہَ مااسْتَطَعْتُمْ ۰ التغابن / ۱۶ [۴]) سے منسوخ ہے۔ جب کہ دوسرے قول کے مطابق منسوخ نہیں بلکہ محکم ہے اور سورۂ آل عمران میں اس آیت کے علاوہ کوئی دوسری ایسی آیت نہیں جس میں دعوائے نسخ درست ہو۔

[۸] اللہ تعالیٰ کا قول: (لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ ۰ الاحزاب / ۵۲ [۵]) اللہ تعالیٰ کے قول: (اِنَّااَحْلَلْنَالَکَ اَزْوَاجَکَ الّٰتِی اٰتَیْتَ اُجُوْرَھُنَّ ۰ الاحزاب/ ۵۰ [۶]) سے منسوخ ہے۔

[۹] اللہ تعالیٰ کا قول: (اِذَانَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰکُمْ صَدَقَۃً المجادلۃ / ۱۲ [۷]) بعد میں مذکور آیت کریمہ سے منسوخ ہے۔

سوال: حکم اٹھا دینے اور تلاوت باقی رہنے میں کیا حکمت ہے؟ اس کا جواب دو وجہوں پر ہے:

ایک وجہ یہ ہے کہ قرآن جس طرح اس لیے پڑھا جاتا ہے کہ اس کا حکم اور اس پر عمل کی معرفت حاصل ہو اسی طرح وہ اس لیے بھی پڑھا جاتا ہے کہ وہ اللہ کا کلام ہے جس کی تلاوت پر ثواب ملے گا۔ لہٰذا اس حکمت کے پیش نظر تلاوت کو باقی رکھا گیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ نسخ اکثر تخفیفِ حکم کے لیے ہوتا ہے اس لیے اس احسان کی یاد دہانی کے لیے تلاوت کو باقی رکھا گیا جو سختی اور دشواری کو دور کرنے کی صورت میں اللہ نے بندوں پر کیا ہے۔ یا نسخ

---

[۱] اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمھارے جی میں ہے یا چھپاؤ، اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ [۲] اللہ کسی جان پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت بھر۔ [۳] اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ [۴] تو اللہ سے ڈرو جہاں تک ہو سکے۔ [۵] ان (نو بیویوں) کے بعد اور عورتیں تمھیں حلال نہیں۔ [۶] ہم نے تمھارے لیے حلال فرمائیں وہ بیویاں جن کو تم مہر دو۔ [۷] جب تم رسول سے کوئی بات آہستہ عرض کرنا چاہو تو اپنی عرض سے پہلے کچھ صدقہ دے لو۔

اس بات کو منسوخ کرنے کے لیے ہوتا ہے جس پر زمانۂ جاہلیت کے لوگ قائم تھے یا جو گذشتہ امتوں کی شریعتوں یا ابتدائے اسلام میں تھی۔ جیسے آیت قبلہ سے نماز میں بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا نسخ اور روزۂ رمضان سے روزۂ عاشورا کا نسخ۔ یہ نسخ بھی بہت کم ہے۔

نوع سوم: جس کی تلاوت منسوخ ہو مگر حکم منسوخ نہ ہو یعنی یہاں نسخ صرف تلاوت کے لحاظ سے ہے اس لیے اس کی قرآنیت ثابت نہ ہونے کے سبب اس کی قراءت پر تلاوت قرآن کا ثواب نہ ملے گا۔ ہاں اس کا حکم باقی رہے گا جس پر عمل کیا جائے گا۔

اس قسم کی مثالیں بہت ہیں۔ یہاں ہم صرف دو مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں:

ابوعبید نے زِر بن حبیش سے روایت کی، زر نے کہا: مجھ سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سوال کیا: تم سورۂ احزاب میں کتنی آیتیں شمار کرتے ہو؟ میں نے جواب دیا: بہتر یا تہتر آیتیں۔ فرمایا: یہ سورۂ بقرہ کے برابر تھی اور اس میں ہم آیت رجم بھی پڑھتے تھے۔ عرض کی آیت رجم کیا ہے؟ فرمایا: (اِذَا زَنَی الشَّیۡخُ وَالشَّیۡخَۃُ فَارۡجِمُوۡھُمَا اَ لۡبَتَّۃَ نَکَالًا مِّنَ اللّٰہِ وَاللّٰہُ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ) "جب شادی شدہ مرد اور عورت زنا کا ارتکاب کریں تو انھیں قطعی طور پر سنگسار کرو، ان کے لیے اللہ کی طرف سے یہی عبرت ناک سزا ہے اور اللہ بڑے غلبے اور حکم والا ہے۔"

حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے آپ نے فرمایا: ایک سورہ، سورۂ براءت کے برابر نازل ہوئی لیکن کچھ عرصہ بعد وہ اٹھالی گئی اور اس کا صرف یہ حصہ لوگوں کو یاد رہ گیا (اِنَّ اللّٰہَ سَیُؤَیِّدُ ھٰذَاالدِّیۡنَ بِاَقۡوَامٍ لَّا خَلَاقَ لَھُمۡ ، وَلَوۡ اَنَّ لِابۡنِ اٰدَمَ وَادِیَیۡنِ مِن مَّالٍ لَتَمَنّٰی وَادِیًا ثَالِثًا ، وَلَا یَمۡلَأُ جَوۡفَ ابۡنِ اٰدَمَ اِلَّا التُّرَابُ ، وَیَتُوبُ اللّٰہُ عَلٰی مَنۡ تَابَ) "اللہ تعالیٰ جلد ہی اس دین کو ایسے لوگوں سے قوت دے گا جن کا آخرت کے ثواب میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ اگر اولاد آدم مال کی دو وادیوں کی مالک ہو جائے تو بھی اس پر قناعت نہ کرے گی بلکہ اب تیسری وادی کی تمنا کرے گی۔ بس مٹی ہی اس کے پیٹ کو بھر سکتی ہے۔ اور اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔

اس قسم میں پنہاں حکمت یہ ہے کہ اس سے امت محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طاعت و فرماں برداری عالم آشکار ہو جائے کہ اس نے تفصیل کا مطالبہ کیے بغیر محض بطور ظن ثابت ہونے والے حکم خداوندی پر لبیک کہتے ہوئے اپنی جان کی بازی لگادی۔ جیسے حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام نے محض ایک خواب کی وجہ سے اپنے بیٹے حضرت اسمعیل کو راہ خدا میں قربان کردینے کے لیے تیزی کی حالاں کہ نبی کا خواب وحی کا ادنیٰ درجہ ہے۔

## کچھ متفرق فوائد

**بعض علما نے کہا:** ترتیب قرآن میں ہر ناسخ ،منسوخ کے بعد مذکور ہے سوائے دو آیتوں کے کہ موجودہ ترتیب کے لحاظ سے ان میں ناسخ پہلے اور منسوخ بعد میں مذکور ہے۔

پہلی سورۂ بقرہ کی آیت عدت [۱] ہے اور دوسری (لا یحل لك النساء ۰ ) ہے جو اللہ تعالیٰ کے قول: ( انا احللنا لك ازواجك ) سے منسوخ ہے لیکن ناسخ ،منسوخ سے پہلے مذکور ہے۔

بعض علما نے ایک تیسری آیت یعنی آیت حشر کا اضافہ کیا ہے جو بغیر جہاد کیے ہاتھ آنے والے مال غنیمت کے متعلق ہے۔[۲]

لیکن یہ محض ان لوگوں کی رائے پر ہے جنھوں نے کہا کہ یہ آیت ،آیت انفال (وَاعۡلَمُوا اَنَّمَا غَنِمۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوۡلِ (الانفال/ ٤١ [۳]) سے منسوخ ہے۔ کچھ لوگوں نے ایک چوتھی آیت یعنی اللہ تعالیٰ کے قول: ( خذ العفو ۰ الاعراف/ ١٩٩ ) کا بھی اضافہ کیا ہے جس کا معنی ہے ''ان کا وہ مال لو جو ان کی ضرورت سے فاضل ہو۔'' مگر یہ ان لوگوں کی رائے پر ہے جن کا قول یہ ہے کہ یہ آیت ،آیت زکاۃ سے منسوخ ہے۔[٤]

ابن عربی نے کہا: کفار سے درگزر، ان سے اعراض و روگردانی اور باز رہنے کے جتنے بھی احکام آئے ہیں وہ آیت سیف سے منسوخ ہیں۔ اُن کے بقول آیت سیف یہ ہے: ( فَاِذَا انۡسَلَخَ الۡاَشۡهُرُ الۡحُرُمُ فَاقۡتُلُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَيۡثُ وَجَدۡتُّمُوۡهُمۡ (التوبة / ٥[٥])

بقول ابن عربی اس آیت نے ایک سو چوبیس آیتوں کو منسوخ کیا ہے۔ پھر جزو آخر نے اس کے جزو اول کو بھی منسوخ کر دیا۔ امام سیوطی فرماتے ہیں: اس قول کا ضعف ہم پہلے بیان کر چکے۔

ابن عربی اپنے قول سابق کی بنیاد پر یہ بھی کہتے ہیں کہ آیت کریمہ (خُذِ الۡعَفۡوَ وَاۡمُرۡ بِالۡعُرۡفِ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡجٰهِلِيۡنَ ۰ الاعراف / ١٩٩[٦]) میں ایک عجیب انداز کا نسخ ہے کہ اس کا

---

[۱] یعنی: وَالَّذِيۡنَ يُتَوَفَّوۡنَ مِنۡكُمۡ وَيَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا وَّصِيَّةً لِّاَزۡوَاجِهِمۡ مَّتَاعًا اِلَى الۡحَوۡلِ غَيۡرَ اِخۡرَاجٍ: اور تم میں جو وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ اپنی بیویوں کے لیے سال بھر کے لیے نفقہ اور لباس کی وصیت کر جائیں جس سے وہ فائدہ اٹھائیں اور انھیں ان کی رہائش گاہوں سے نکالا نہ جائے۔ یہ: ''وَالَّذِيۡنَ يُتَوَفَّوۡنَ مِنۡكُمۡ وَيَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا يَّتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ اَرۡبَعَةَ اَشۡهُرٍ وَّعَشۡرًا '' سے منسوخ ہے۔ لیکن ناسخ، منسوخ سے پہلے مذکور ہے۔ [۲] وہ آیت یہ ہے: مَا اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ فَمَاۤ اَوۡجَفۡتُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ خَيۡلٍ وَّلَا رِكَابٍ : اور یہودیوں کے ہاتھوں سے جو مال اللہ نے اپنے رسول کو لوٹایا، تو اس کے لیے نہ تم نے گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹوں کو تیز رفتاری سے چلایا یعنی اس میں تمھیں کسی سختی کا سامنا نہ کرنا پڑا اس لیے تمھارا اس میں کوئی حق نہیں۔ [۳] آگے یہ الفاظ ہیں••• وَلِذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ : اور جان لو کہ جو کچھ غنیمت لو اس کا پانچواں حصہ خاص اللہ اور رسول اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کا ہے۔ [۴] وہ آیت یہ ہے: خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَتُزَكِّيۡهِمۡ بِهَا: اور ان کے مال سے صدقہ (زکوۃ) وصول کرو جس سے انھیں پاک اور ستھرا کرو۔ [۵] پھر جب حرمت والے مہینے گذر جائیں تو مشرکوں کو جہاں بھی پاؤ قتل کرو۔ [٦] •••اور بھلائی کا حکم دو اور جاہلوں سے منہ پھیر لو۔

اول وآخر منسوخ جب کہ اس کا درمیانی جز یعنی (وامر بالعرف) محکم ہے۔ انھیں کا قول ہے: ایک عجیب نسخ آیت کریمہ (عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۔ المائدة / ۱۰۵ [۱]) میں ہے کہ ارشاد باری: اذا اهتديتم (جب تم درست راہ پر رہو) سے مراد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے تو یہ ارشاد (عليكم انفسكم ۰۰۰) کا ناسخ ہے۔

## تنبیہ

ابن الحصار نے کہا: نسخ میں ایسی نقل پر ہی اعتماد کیا جائے گا جو صراحۃً رسول اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے یا ایسے صحابی سے ثابت ہو جو یوں بتائیں کہ " آيَةٌ كَذَا نَسَخَتْ كَذَا "فلاں آیت نے فلاں آیت کو منسوخ کیا۔

مزید فرمایا: کبھی نسخ کا حکم اس وقت کیا جاتا ہے جب دو آیتوں کے درمیان قطعی تعارض موجود ہو اور اس کے ساتھ دونوں کی تاریخ بھی معلوم ہو تا کہ متقدم کو منسوخ اور متاخر کو ناسخ قرار دیا جاسکے۔

انھوں نے ہی فرمایا: نسخ میں بغیر نقل صحیح اور واضح معارضہ کے نہ عام مفسرین کے قول پر اعتماد کیا جائے گا، نہ مجتہدین کے اجتہاد پر۔ اس لیے کہ نسخ ایک حکم کے ازالے اور ایسے حکم کے اثبات پر مشتمل ہوتا ہے جو عہد رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں پایۂ ثبوت کو پہنچا اور ظاہر ہے کہ اس میں صحیح نقل اور تاریخ ہی معتمد ہوگی نہ کہ رائے اور اجتہاد۔

## مشکل القرآن اور موہم اختلاف وتناقض کا بیان

اللہ تعالیٰ کا کلام اختلاف وتناقض سے پاک ہے جیسا کہ فرمایا: (وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا النساء / ۸۲ [۲]) لیکن کبھی مبتدی کے سامنے کچھ ایسی باتیں آتی ہیں جن سے اس کو قرآن میں اختلاف وتناقض ہونے کا وہم گذرتا ہے حالاں کہ حقیقت میں اختلاف نہیں ہوتا۔ مگر وہم اختلاف کے باعث ازالۂ وہم ضروری ہوا جیسے مختلف الحدیث اور متعارض احادیث کے درمیان تطبیق کے بیان میں کتابیں تصنیف کی گئیں۔

اس موضوع پر حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے گفتگو فرمائی ہے اور ان سے متعلق یہ بھی حکایت کی گئی ہے کہ انھوں نے بعض آیات پر کلام کرنے سے توقف کیا۔

عبد الرزاق نے اپنی تفسیر میں بیان کیا: ہمیں معمر نے خبر دی، انھوں نے کہا ہمیں ایک شخص نے خبر دی، اس شخص نے کہا ہمیں مِنْہال بن عمرو نے، سعید بن جبیر کے حوالے سے خبر دی کہ انھوں نے

---

[۱] (اے ایمان والو) تم اپنی فکر رکھو، تمھارا کچھ نہ بگاڑے گا جو گمراہ ہوا جب کہ تم راہ پر ہو۔ [۲] اگر وہ (قرآن) غیر خدا کے پاس سے ہوتا تو ضرور اس میں بہت اختلاف پاتے۔

فرمایا: ایک شخص حضرت عبداللہ بن عباس کے پاس آ کر عرض گزار ہوا" میں نے قرآن میں کچھ ایسی چیزیں دیکھیں جن میں مجھے باہم اختلاف معلوم ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: وہ کیا ہیں؟ کیا کوئی شک ہے؟ اس نے کہا: نہیں شک نہیں بلکہ اختلاف ہے۔ آپ نے فرمایا: وہ باتیں بیان کرو جن میں تمھارے خیال کے مطابق اختلاف ہے۔ اس نے کہا: میں سنتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّا اَنْ قَالُواوَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۔ الانعام / ۲۳[۱]) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین اللہ سے اپنا شرک چھپائیں گے جب کہ دوسرے مقام پر فرمایا: (وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۔ النساء / ۴۲[۲]) جس سے صراحۃً ثابت ہوتا ہے کہ وہ اللہ سے کوئی بات نہ چھپائیں گے۔

اسی طرح ایک مقام پر رب تعالیٰ فرماتا ہے: (فَلَا اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَائَلُوْنَ ۔ المؤمنون/ ۱۰۱[۳]) پھر دوسرے مقام پر فرماتا ہے: (وَاَقْبَلَ بَعْضُهُم عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَاءَلُوْنَ ۔ الصافات/ ۲۷، الطور/ ۲۵[۴]) پہلی آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ لوگ قیامت کے دن ایک دوسرے سے کوئی سوال نہ کریں گے جب کہ دوسری آیت سے واضح ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے سوال کریں گے۔

اسی طرح ایک جگہ فرمایا: (اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِى خَلَقَ الْاَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ طَائِعِيْنَ ۔ فصلت /۹ـــ ۱۱[۵]) تک پھر دوسری آیت میں فرمایا: (اَمِ السَّمَاءُ بَنٰهَا ۔ النازعات / ۲۷[۶]) بعد ازاں فرمایا: (وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ۔ النازعات / ۳۰[۷]) پہلی آیت سے واضح ہے کہ زمین آسمان سے پہلے پیدا ہوئی اور آسمان زمین کے بعد پیدا کیا گیا مگر سورۂ نازعات کی آیت سے واضح ہے کہ زمین آسمان کے بعد پیدا کی گئی کیوں کہ "بعد ذلك" میں ذلك کا مشار الیہ آسمان ہے اور "دحٰها" میں ھا ضمیر مونث کا مرجع ارض ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے بارے میں بصیغۂ ماضی " وَكَانَ اللّٰهُ "فرما رہا ہے۔ یہ کیسے درست ہوگا؟

ان معروضات کے جواب میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے قول: (ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّا اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ) کا پس منظر یہ ہے کہ جب

[۱] پھر ان (مشرکین) کو کچھ بناوٹ نہ ملی (یعنی وہ کوئی معذرت نہ کر سکے) مگر یہ کہ بولے ہمیں اپنے رب اللہ کی قسم کہ ہم مشرک نہ تھے۔ [۲] اور وہ (مشرکین) اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے۔ [۳] تو اس دن نہ ان میں رشتے رہیں گے اور نہ ایک، دوسرے کی بات پوچھے (گا)۔ [۴] اور ان میں ایک نے دوسرے کی طرف پوچھتے ہوئے رخ کیا۔ [۵] اس کے کچھ آگے ہے: ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَا اَتَيْنَا طَائِعِيْنَ؛ کیا تم لوگ اس کا انکار کرتے ہو جس نے دو دن میں زمین بنائی ••• پھر آسمان کی طرف قصد فرمایا اور وہ دھواں تھا تو اس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں حاضر ہو خوشی سے یا ناخوشی سے، دونوں نے عرض کی کہ ہم رغبت کے ساتھ حاضر ہوئے۔ [۶] اس سے پہلے ہے: ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا ••• کیا تمھاری سمجھ کے مطابق تمھارا بنانا مشکل یا آسمان کا۔ [۷] اور اس کے بعد زمین پھیلائی۔

مشرکین قیامت کا دن دیکھیں گے اور یہ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ اہل اسلام کی مغفرت فرمارہا ہے، گناہوں کو بخش رہا ہے اور کسی گناہ کو بخش دینا اس کے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں ہے مگر کسی شرک کو نہیں بخشتا تو یہ مشرکین اپنی مغفرت کی امید میں شرک کا انکار کر بیٹھیں گے اور کہیں گے ''ہمارے رب اللہ کی قسم ہم لوگ مشرک نہ تھے۔'' اس پر اللہ تعالیٰ ان کے مونہوں پر مہر لگا دے گا اور ان کے ہاتھ پاؤں ان کے شرک اور بداعمالیوں کو بیان کریں گے۔ اس وقت کفر اور نافرمانی کرنے والے لوگ تمنا کریں گے کہ'' کاش! انھیں زمین میں دبا کر زمین برابر کر دی جاتی اور وہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات نہ چھپاتے''

اللہ تعالیٰ کے قول: ( فلا انساب بينهم يومئذ ولا يتساءلون ) کا مطلب یہ ہے کہ جب صور پھونکا جائے گا تو تمام ساکنان آسمان وزمین ہلاک ہو جائیں گے صرف وہی زندہ رہیں گے جنھیں اللہ زندہ رکھنا چاہے گا۔ اس دن ان کے درمیان نہ کوئی نسبی قرابت رہے گی اور نہ وہ ایک دوسرے سے کچھ سوال کریں گے۔ پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو لوگ فوراً کھڑے ہو کر دیکھیں گے اور ایک دوسرے کی طرف رخ کر کے باہم پوچھ گچھ کریں گے۔

اللہ تعالیٰ کے قول: ( خلق الارض في يومين ) سے مراد یہ ہے کہ زمین آسمان سے پہلے پیدا ہوئی جب کہ آسمان تخلیق سے پہلے دھواں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کر دینے کے بعد دو دنوں میں سات آسمان پیدا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ کے قول: ( والارض بعد ذلك دحٰها ) کا مطلب یہ ہے کہ اس نے زمین میں پہاڑوں کو وجود بخشا، ندیاں اور دریا نکالے، درخت اگائے اور سمندروں کو پیدا کیا۔

اللہ تعالیٰ کے قول (كان الله ) کا مطلب ہے: اللہ ہمیشہ اسی طرح رہا اور اسی طرح وہ ہمیشہ عزیز (غالب) حکیم (حکمت والا) علیم (بہت علم والا) اور قدیر (بہت قدرت والا) رہا۔

تمھیں قرآن میں جو بھی اختلاف معلوم ہوا اس کا حال اسی طرح ہوگا جس کی تفصیل میں نے تم سے بیان کی۔ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے جو کلام بھی نازل فرمایا وہ اس کی مراد کے مطابق صائب اور درست ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اس طویل حدیث کی تخریج حاکم نے مستدرک میں کی اور اسے صحیح قرار دیا۔ اس کی اصل صحیح بخاری میں ہے۔ ابن حجر نے اپنی شرح بخاری میں کہا: اس خبر کے مضمون کا حاصل چار مقامات سے متعلق سوال ہے۔

اول: قیامت کے دن سوال کی نفی اور اس کا اثبات۔

دوم: مشرکوں کا اپنے حال کو چھپانا اور اس کو ظاہر کرنا۔

سوم: زمین کی تخلیق پہلے ہوئی یا آسمان کی۔

چہارم؛ حرف "کان" کو ذکر کرنا جو زمانۂ ماضی پر دلالت کرتا ہے حالاں کہ باری تعالیٰ کی صفت، دائمی ولازمی ہے، زمانۂ ماضی کے ساتھ خاص نہیں۔

اس سلسلے میں حضرت عبداللہ بن عباس کے جوابات کا حاصل یہ ہے کہ انھوں نے پہلے سوال کے جواب میں فرمایا کہ: سوال کی نفی دوسری بار صور پھونکے جانے سے ماقبل زمانے سے متعلق اور سوال کا اثبات دوسری بار صور پھونکے جانے کے مابعد زمانے سے متعلق ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ دیا کہ: مشرکین اپنی زبانوں سے اپنا شرک چھپائیں گے لیکن ان کے دیگر اعضا گویا ہو کر ان کا حال ظاہر کر دیں گے۔

تیسرے کا یہ جواب دیا کہ: اللہ تعالیٰ نے زمین کو دو دنوں میں پیدا کر تو دیا تھا مگر اسے پھیلایا نہ تھا، اس کے بعد آسمانوں کو پیدا فرما کر انھیں دو دنوں میں درست اور ٹھیک کیا، پھر تخلیق آسمان کے بعد دو دنوں میں زمین کو پھیلایا اور اس میں مضبوط پہاڑ پیدا کیے یوں زمین کے لیے چار دن ہو گئے۔

چوتھے سوال کا جواب یہ دیا کہ: "کان" اگرچہ ماضی کے لیے ہے لیکن وہ انقطاع کو مستلزم نہیں ہوتا، یہاں وہ معنی انقطاع کے لیے نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ "وہ ہمیشہ ایسا رہا (یعنی وہ ہمیشہ صفت سے متصف رہا)

قرآن میں ایک مقام ایسا بھی ہے جس میں حضرت ابن عباس نے توقف کیا، ابوعبید نے کہا: ہم سے اسمعیل بن ابراہیم نے بیان کیا وہ ایوب سے، وہ ابن ابی مُلَیکہ سے راوی ہیں کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباس سے اللہ تعالیٰ کے قول: (ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ . السجدۃ / ۵[۱]) اور اللہ تعالیٰ کے قول: (تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ . المعارج / ۴[۲]) کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: یہ ایسے دو دن ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کیا ہے، یہ دو دن کون ہیں انھیں خدا ہی جانتا ہے۔

علامہ زرکشی نے "برہان" میں کہا: اختلاف کے چند اسباب ہوتے ہیں:

[۱] جس بات کی خبر دی گئی اس کے مختلف انواع واحوال ہیں، ایک جگہ ایک حال کا ذکر ہے، دوسری جگہ دوسرے حال کا ذکر ہے۔ حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں۔ جیسے: تخلیق آدم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کبھی (من تراب) کبھی (من حمأ مسنون . الحجر/ ۲۶، ۲۸، ۳۳) کبھی (من طين لازب . الصافات/۱۱) اور کبھی (من صلصال كالفخار . الرحمن/ ۱۴) فرمایا۔ یہ تمام

---

[۱] پھر اس کی طرف عروج کرے گا اس دن کہ جس کی مقدار ہزار برس ہے [۲] ملائکہ اور جبریل اس کی بارگاہ کی طرف عروج کرتے ہیں۔ وہ عذاب اس دن ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے۔

الفاظ مختلف ہیں اور ان کے معانی چند مختلف حالات میں پائے جاتے ہیں کیوں کہ صلصال (خشک بجنے والی مٹی)، حمأ (بدبودار گیلی مٹی) نہیں اور حمأ، تراب (مٹی) نہیں۔ مگر ان سب کا مرجع ایک ہی جوہر یعنی مٹی ہے اور مٹی ہی سے درجہ بدرجہ یہ احوال پیدا ہوئے۔

[۲] مختلف مواقع کے لحاظ سے مختلف احوال مذکور ہوں جیسے (وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ ۔ الصافات/ ۲٤[۱]) اور (فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۔ الاعراف /٦[۲]) ان دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مجرموں سے پرسش ہوگی۔ مگر سورۂ رحمٰن میں ہے (فَيَوْمَئِذٍ لَا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْبِهٖ اِنْسٌ وَّلَا جَانٌّ ۔ الرحمن ۳۹[۳]) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دن جن وانس کسی سے اس کے جرم کی پرسش نہ ہوگی۔

حلیمی نے کہا: پہلی آیت اس پر محمول ہے کہ توحید اور رسولوں کی تصدیق کے بارے میں سوال ہوگا اور دوسری اس پر محمول ہے کہ نبوت کا مان لینا جن امور کے مان لینے کو مستلزم ہے مثلاً فروعی احکام ومسائل، ان سے متعلق سوال نہ ہوگا۔

دوسرے علما نے اس اختلاف کو مقامات کے اختلاف پر محمول کیا ہے کیوں کہ قیامت میں مختلف مقامات ہوں گے۔ کسی مقام میں سوال ہوگا، کسی مقام میں سوال نہیں ہوگا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ جس سوال کا اثبات کیا گیا ہے اس سے زجر وتوبیخ کے طور پر سوال کیا جانا مراد ہے اور جس سوال کی نفی کی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مجرموں سے عذر پیش کرنے اور حیلہ وحجت ظاہر کرنے کے لیے سوال نہ ہوگا۔

[۳] کسی فعل میں دو جہتیں ہوں۔ ایک جہت کے لحاظ سے اثبات ہو، دوسری جہت کے اعتبار سے نفی ہو۔ اختلافِ جہت پر غور نہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہاں اختلاف ہے اور حقیقت میں اختلاف نہیں۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ: (فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ، وَمَارَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۔ الانفال/ ١٧[٤]) یہاں ایک طرف یہ ذکر ہے کہ کفار کو صحابۂ کرام نے قتل کیا دوسری طرف یہ ہے کہ انھوں نے نہیں قتل کیا، خدا نے قتل کیا۔ اسی طرح ایک طرف یہ ہے کہ کفار پر رسول نے خاک پھینکی، دوسری طرف یہ ہے کہ رسول نے نہیں بلکہ خدا نے وہ خاک پھینکی۔ نسبتِ اثبات سے صحابہ ورسول کا اپنے ہاتھوں کام انجام دینا مراد ہے اور نسبتِ نفی سے اثر انداز ہونا مراد ہے یعنی فعل تو ان حضرات کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوا مگر تاثیر خدا کی قدرت اور تخلیق سے ہوئی بندہ صرف

---

[۱] اور انھیں ٹھہراؤ ان سے پوچھنا ہے۔ [۲] تو بیشک ضرور ہمیں پوچھنا ہے ان سے جن کے پاس رسول گئے اور بیشک ضرور ہمیں پوچھنا ہے رسولوں سے۔ [۳] تو اس دن کسی انسان اور جن سے اس کے گناہ کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔ [۴] تو (اے رسول کے صحابیو) تم نے انھیں قتل نہ کیا بلکہ اللہ نے انھیں قتل کیا اور اے محبوب وہ خاک جو تم نے پھینکی تم نے نہ پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی۔

کا سبب ہوتا ہے اور مؤثر و خالق صرف ذات باری تعالیٰ ہے۔

[۴] نفی و اثبات میں حقیقت و مجاز کا فرق ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے قول: (وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَاهُمْ بِسُكٰرٰى ۔ الحج / ۲[۱]) میں پہلے سکاری (مدہوش) سے نشہ میں ہونے کا اثبات مجازاً ہے۔ یعنی قیامت کی ہول ناکیوں کے سبب لوگ مدہوش معلوم ہوں گے۔ اور نشہ میں ہونے کی نفی حقیقت کے لحاظ سے ہے۔ یعنی واقع اور حقیقت کے لحاظ سے وہ مست نہ ہوں گے۔

[۵] دو وجہوں اور دو اعتباروں سے اختلاف ہو۔ جیسے ایک جگہ ہے: (اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۔ الرعد / ۲۸[۲]) دوسری جگہ ہے: (اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ ۔ الانفال / ۲[۳]) پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے ذکر سے مومنوں کے دلوں کو اطمینان و قرار ملتا ہے۔ دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے ذکر سے مومنوں کے دلوں پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ توحید کی معرفت سے جو انشراح صدر حاصل ہوتا ہے اس کے باعث دلوں کو قرار و اطمینان ملتا ہے۔ اور اس ہدایت سے بھٹکنے اور منحرف ہونے کا خیال آتا ہے تو خوف پیدا ہوتا ہے جس کے باعث قلوب لرز جاتے ہیں تو ایک وجہ سے اطمینان ہوتا ہے اور دوسری وجہ سے خوف ہوتا ہے۔ یہ دونوں کیفیتیں اللہ تعالیٰ کے اس قول میں جمع کر دی گئی ہیں: (تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَ قُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۔ الزمر / ۲۳) "اس کتاب (قرآن) سے بال کھڑے ہوتے ہیں ان کے بدن پر جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں پھر ان کی کھالیں اور دل نرم پڑتے ہیں یادِ خدا کی طرف رغبت میں۔"

قرآن کریم میں ہے: (فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۔ الانعام/ ۱۴۴[۴])، (فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ ۔ الزمر/ ۳۲[۵])، (وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ۔ الكهف/ ۵۷[۶])، (وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۔ البقرة / ۱۱۴[۷])۔ اس طرح کی اور بھی آیات ہیں۔

وجہِ اشکال یہ ہے کہ ان آیات میں استفہام سے مراد نفی ہے تو معنی ہوگا "لَا اَحَدَ اَظْلَمُ" تو یہ

---

[۱] اور تو لوگوں کو نشے میں دیکھے گا حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے۔ [۲] جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کی یاد سے چین پاتے ہیں۔ [۳] ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جائیں۔ [۴] اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹی تہمت لگائے۔ [۵] تو اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ کے بارے میں جھوٹی بات کہے۔ [۶] اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جسے اس کے رب کی آیتیں یاد دلائی جائیں تو وہ ان سے اعراض کرے اور ان معصیتوں اور گناہوں کو بھول جائے جو اس کے ہاتھوں نے پہلے کیا۔ [۷] اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اس کا نام ذکر کیے جانے سے لوگوں کو روکے۔

اس بات کی خبر ہے کہ فلاں صفت والے سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں، اب یہ حکم کسی ایک ہی صفت والے پر درست ہوگا۔ متعدد صفات والوں میں سے ہر ایک پر سب سے بڑھ کر ظالم ہونے کا اطلاق ہو تو بظاہر تناقض ہوگا۔

اس کا جواب چند طریقوں سے دیا گیا ہے جن میں سے ایک یہ ہے کہ ہر مقام پر معنی صلہ سے تخصیص کا لحاظ ہے یعنی مَنْ استفہامیہ مبتدا کے بعد مذکور مَن موصولہ کے صلہ کے معنی سے ہر آیت میں مبتدا کی تخصیص مراد ہے یعنی "لَا اَحَدَ مِنَ الْمَانِعِيْنَ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ "۔"مانعین میں اس سے بڑا ظالم کوئی نہیں جو اللہ کی مسجدوں میں داخل ہونے سے منع کرے۔" "لَا اَحَدَ مِنَ الْمُفْتَرِيْنَ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا "۔" افترا کرنے والوں میں اس سے بڑا افترا پرداز کوئی نہیں جو اللہ کی طرف جھوٹی بات گڑھ کر منسوب کرے۔"

اور جب ان آیات میں صلات سے تخصیص ہوگئی تو تناقض نہ رہا۔

## قرآن کے مطلق اور مقید کا بیان

**مطلق:** وہ ہے جو بغیر کسی قید کے ماہیت پر دلالت کرے۔

مقید کے ساتھ مطلق کا حال ایسا ہی ہے جیسا عام کا خاص کے ساتھ ہے۔

علما نے فرمایا: مطلق کی تقیید پر کوئی دلیل پالی جائے تو مطلق کی تقیید کر دی جائے گی ورنہ مطلق کی تقیید سے احتراز کیا جائے گا اور مطلق اپنے اطلاق پر اور مقید اپنی تقیید پر باقی رہے گا کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں زبان عرب میں خطاب فرمایا ہے اس لیے اس باب میں انھیں کی زبان کا اعتبار کیا جائے گا۔

اس کا ضابطہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کے بارے میں کوئی حکم کسی صفت یا شرط کے ساتھ ذکر فرمائے پھر ایک اور حکم صفت یا شرط کے بغیر مطلقاً آئے تو دیکھا جائے گا کہ اس حکم مطلق کی کوئی اصل ہے یا نہیں؟ ۱۔اگر حکم مقید کے علاوہ اس کی کوئی ایسی اصل نہ ہو جس سے اس حکم کو متعلق کیا جائے تو اس حکم مطلق کی اس حکم مقید سے تقیید ضروری ہوگی ۲۔اور اگر حکم مقید کے علاوہ اس حکم مطلق کی کوئی اصل موجود ہو تو اس حکم مطلق کو ان دونوں میں سے کسی ایک سے متعلق کرنا دوسرے کی بہ نسبت اولیٰ نہ ہوگا۔

اول: جیسے اللہ تعالیٰ کے قول: ( فَاِذَابَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ ۔ الطلاق / ۲[۱])اور اللہ تعالیٰ کے قول: (يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْاشَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَاحَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَاعَدْلٍ مِّنْكُمْ ۔[۲]

---

[۱] تو جب وہ اپنی میعاد (عدت) تک پہنچنے کو ہوں تو انھیں بھلائی کے ساتھ روک لو یا بھلائی کے ساتھ جدا کر دو اور اپنے میں دو ثقہ کو گواہ کر لو۔

[۲] اے ایمان والو! تمھاری آپس کی گواہی تم میں کے دو معتبر شخص ہیں جب تم میں وصیت کے وقت کسی کی موت قریب آگئی ہو۔

(المائدة/١٠٦) میں رجعت، فرقت اور وصیت کے گواہوں میں عدالت کی شرط لگائی گئی جب کہ بیوع وغیرہ سے متعلق شہادت کو اللہ تعالیٰ کے قول: (وَاَشۡهِدُوۡا اِذَا تَبَايَعۡتُمۡ ۔ البقرة / ٢٨٢[١])اور (فَاِذَا دَفَعۡتُمۡ اِلَيۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ فَاَشۡهِدُوۡا عَلَيۡهِمۡ ۔ النساء / ٦[٢]) میں مطلق ذکر کیا گیا۔ مگر عدالت ان سبھی امور میں شرط ہے (جس سے معلوم ہوا کہ مطلق، مقید پر محمول ہے۔)

اسی طرح کفارۂ قتل کے اندر "رقبہ" (باندی یا غلام) کے ساتھ ایمان کی شرط لگائی گئی اور کفارۂ ظہار و یمین میں "رقبہ" کو مطلق ذکر کیا گیا۔ لہٰذا مذکورہ ضابطہ کے مطابق کفارۂ قتل کی طرح، کفارۂ ظہار و یمین میں بھی رقبہ کا مومن ہونا شرط ہوگا۔ اسی طرح وضو میں "ایدی" اللہ تعالیٰ کے قول: (اِلَى الۡمَرَافِقِ) سے مقید ہے جب کہ تیمّم میں مطلق ہے۔

اللہ تعالیٰ کے قول: (وَمَنۡ يَّرۡتَدِدۡ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِيۡنِهٖ فَيَمُتۡ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ ۔ البقرة / ٢١٧[٣]) میں ارتداد سے عمل کی بربادی کفر پر موت سے مقید ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کے قول: (وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِالۡاِيۡمَانِ فَقَدۡ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۔ المائدة /٥[٤]) میں عمل کی بربادی مطلق کفر سے بیان ہوئی ہے۔ اسی طرح سورۂ انعام میں خون کا حرام قرار دیا جانا " مسفوح " (بہتا ہوا) سے مقید ہے جب کہ اس کے علاوہ دوسری سورہ میں مطلق خون کی حرمت مذکور ہے۔

مذکورہ تمام صورتوں میں امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ مطلق، مقید پر محمول ہوگا یعنی جہاں اطلاق آیا ہے وہاں بھی مقید والی قید لگائی جائے گی۔

بعض علما مطلق کو مقید پر محمول نہیں کرتے اور کفارۂ ظہار و یمین میں "رقبۂ کافرہ" کو آزاد کرنا جائز قرار دیتے ہیں، تیمّم میں دونوں گٹوں تک مسح پر اکتفا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تنہا ارتداد عمل کو باطل کر دیتا ہے۔

دوم: جیسے کفارۂ قتل و ظہار میں روزہ کو اس کے پے در پے ہونے سے مقید کرنا اور حج تمتع کے روزہ میں تفریق کی قید لگانا۔

اور کفارۂ یمین اور قضاے رمضان کے روزوں کو مطلق ذکر کیا گیا ہے اس لیے وہ اپنے اپنے اطلاق پر باقی رہیں گے۔ یعنی الگ الگ رکھنا اور پے در پے رکھنا دونوں جائز ہوگا۔

اضافہ از مترجم:

حنفیہ کے نزدیک ضابطہ یہ ہے کہ بیان حکم کے سلسلے میں جب مطلق اور مقید دونوں ہی وارد

---

[۱] اور جب خرید و فروخت کرو تو گواہ کرلو۔ [۲] پھر جب تم ان کے مال انھیں سپرد کر دو تو ان پر گواہ کرلو۔ [۳] اور تم میں جو لوگ اپنے دین سے پھر جانے کے بعد حالت کفر میں مر جائیں تو ان کے اعمال اکارت ہوئے۔ [۴] اور جو ایمان کا انکار کرے تو اس کا عمل اکارت ہو گیا۔

ہوں تو دیکھا جائے گا کہ حکم ایک ہی ہے یا مختلف ہے ؟

اگر مختلف ہو تو یہ دیکھا جائے گا کہ ایک حکم دوسرے حکم کی تقیید کا مُوجب ہے یا نہیں؟

اگر ایک حکم دوسرے حکم کی تقیید کا موجب نہ ہو تو مطلق کو اطلاق پر اور مقید کو تقیید پر رکھا جائے گا۔ جیسے اَطعِم رَجُلًا۔ اور۔اُکْسُ رَجُلًا عَارِیًا (کسی مرد کو کھانا کھلاؤ۔اور۔کسی ننگے کو کپڑا پہناؤ) کھانا کھلانے کا حکم مطلق رہے گا، کسی بھی مرد کو کھلا سکتا ہے اور کپڑا پہنانے کا حکم برہنہ کے ساتھ مقید رہے گا۔

اور اگر ایک حکم بالذات یا بالواسطہ دوسرے کی تقیید کا موجب ہو تو مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا۔ جیسے اَعْتِقْ عَنِّیْ رَقَبَةً ۔ وَ۔لَا تُعْتِقْ رَقَبَةً کَافِرَةً۔ (میری طرف سے کسی گردن کو آزاد کرو۔اور۔کسی کافر بُردے کو آزاد نہ کرنا) اور جیسے اَعْتِقْ عَنِّیْ رَقَبَةً ۔وَ۔ لَا تُمَلِّکْنِی رَقَبَةً کَافِرَةً (میری طرف سے ایک گردن (غلام یا باندی) آزاد کرو۔اور۔مجھے کسی کافر گردن کا مالک نہ بنانا)

اور اگر حکم ایک ہو تو دیکھا جائے گا کہ مثبت ہے یا منفی؟ اگر منفی ہو تو ایک، دوسرے پر محمول نہ ہوگا۔ جیسے کوئی گردن آزاد نہ کرنا۔اور۔کوئی کافر گردن آزاد نہ کرنا۔ دونوں پر عمل ہو سکتا ہے اس طرح کہ سرے سے کسی کو آزاد نہ کرے۔

اور اگر مثبت ہو تو دیکھا جائے گا کہ معاملہ ایک ہے یا مختلف؟ اگر الگ الگ ہو تو ایک کو دوسرے پر محمول نہ کیا جائے گا۔ جیسے کفارۂ یمین (جس میں مطلق غلام آزاد کرنے کا حکم ہے) اور کفارۂ قتل (جس میں مومن غلام آزاد کرنے کا حکم ہے)

اور اگر معاملہ ایک ہو تو دیکھا جائے گا کہ اطلاق اور تقیید سبب میں ہے یا اور کسی امر میں؟ اگر سبب میں ہو تو ایک کو دوسرے پر محمول نہ کریں گے بلکہ دونوں پر عمل واجب ہوگا۔ اس لیے کہ اسباب میں منافات نہیں، ہو سکتا ہے کہ مطلق بھی سبب ہو اور مقید بھی سبب ہو۔ جیسے صدقۂ فطر سے متعلق ایک حدیث میں آیا: اَدُّوْا عَنْ کُلِّ حُرٍّ وَّعَبْدٍ (ہر آزاد و غلام کی طرف سے ادا کرو) دوسری حدیث میں آیا : اَدُّوْا عَنْ کُلِّ حُرٍّ وَّعَبْدٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ (ہر آزاد اور مسلم غلام کی طرف سے ادا کرو) یہاں دونوں پر عمل ہوگا۔

اور اگر اطلاق و تقیید حکم میں ہو تو بالاتفاق ایک کو دوسرے پر محمول کیا جائے گا اس لیے کہ یہاں دونوں پر عمل ممکن نہیں۔ جیسے کفارۂ صوم سے متعلق ایک حدیث میں آیا: صُمْ شَهْرَیْنِ (دو ماہ روزے رکھو) دوسری میں آیا: صُمْ شَهْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ (لگاتار دو ماہ روزے رکھو) یہاں مطلق، مقید پر محمول ہوگا۔ یعنی کفارے میں دو ماہ لگاتار روزے رکھنا فرض ہوگا۔ ناغہ دے کر ساٹھ دن پورے کرنے سے کفارہ ادا نہ ہوگا۔ (توضیح وتلویح)]

## منطوق ومفہوم قرآن

منطوق: وہ معنی ہے جس پر لفظ دلالت کرے اور وہ معنی محل نطق میں بھی ہو تو اگر لفظ ایسے معنی کا افادہ کرے جو دوسرے کسی معنی کا احتمال نہ رکھے تو وہ نص ہے۔ جیسے: (فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۔ البقرۃ/ ۱۹۶ [۱])

اور اگر لفظ ایسے معنی پر دلالت کرے جس کے ساتھ دوسرے معنی کا بھی احتمال ہو اگر چہ وہ احتمال مرجوح ہو تو وہ ظاہر ہے۔ جیسے: (فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ ۔ البقرۃ/۱۷۳[۲]) کیوں کہ باغی کا اطلاق اگر چہ جاہل اور ظالم دونوں پر ہوتا ہے لیکن وہ ظالم کے معنی میں جاہل کے معنی کی بہ نسبت زیادہ ظاہر اور بہت کثیر الاستعمال ہے۔ اور جیسے: (وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۔ البقرۃ / ۲۲۲[۳]) کیوں کہ جس طرح ماہواری خون بند ہونے کو طہر کہا جاتا ہے اسی طرح وضو اور غسل کو بھی طہر کہا جاتا ہے لیکن یہ لفظ معنیٔ ثانی میں زیادہ ظاہر ہے۔

پھر اگر لفظ کو کسی دلیل کی وجہ سے معنیٔ مرجوح پر محمول کیا جائے تو اسے تاویل کہا جاتا ہے اور لفظ جس معنیٔ مرجوح پر محمول کیا جائے اس معنیٔ مرجوح کو مؤول کہا جاتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ ۔ الحدید/ ۴[۴]) کیوں کہ معیت (ساتھ ہونا) کو قرب ذاتی پر محمول کرنا محال ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسم اور تمام جسمانی تعلقات سے مبرا اور پاک ہے۔ لہٰذا معیت سے قرب ذاتی مراد نہ ہونا اور اس کا اللہ تعالیٰ کی قدرت وعلم یا اس کی نگہبانی و پاسبانی پر محمول ہونا متعین ہو گیا۔ اور جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ ۔ بنی اسرائیل/۲۴[۵]) اس لیے کہ آیت کریمہ میں لفظ جناح کو معنیٔ ظاہر پر محمول کرنا محال ہے کیوں کہ انسان کے پنکھ ہونا ممکن ہی نہیں لہٰذا اسے والدین کے ساتھ خاکساری وانکساری اور حسن اخلاق پر محمول کیا جائے گا۔

مفہوم: وہ ہے جس پر لفظ دلالت کرے لیکن وہ مفہوم، محل نطق میں نہ ہو۔

اس کی دو قسمیں ہیں [۱] مفہوم موافق [۲] مفہوم مخالف

مفہوم موافق: وہ ہے جس کا حکم منطوق کے موافق ہو۔ اب اگر مفہوم موافق، منطوق سے اولیٰ ہو تو اس مفہوم موافق کو فحوی الخطاب کہا جاتا ہے جیسے: (فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ ۔ بنی اسرائیل / ۲۳) "انھیں اف نہ کہنا۔" اس سے والدین کو اف کہنے کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ یہ آیت کا منطوق ہے۔

---

[۱] پھر جسے (قربانی) مقدور نہ ہو تو تین روزے حج کے دنوں میں رکھے اور سات جب اپنے گھر پلٹ کر جاؤ۔ یہ پورے دس ہوئے۔ [۲] تو جو (حرام چیز کے کھانے پر) مجبور ہو نہ یوں کہ خواہش سے کھائے اور نہ یوں کہ ضرورت سے آگے بڑھے تو اس پر گناہ نہیں۔ [۳] اور ان سے قربت نہ کرو جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں۔ [۴] اور وہ (اللہ) تمھارے ساتھ ہے تم کہیں رہو۔ [۵] اور ان کے لیے عاجزی کا بازو بچھا نرم دلی سے۔

اف کہنے کی حرمت اذیت کی وجہ سے ہے تو زدوکوب کی حرمت بھی اس سے مفہوم ہوتی ہے۔ یہ مفہوم، منطوق کے موافق اور اس سے اولیٰ ہے اس لیے کہ اس میں اف کہنے سے بھی زیادہ سخت اذیت رسانی ہے۔ اور اگر مفہوم موافق، منطوق کے مساوی ہو تو اس مفہوم موافق یعنی اس کے معنیٰ مراد کو لحن الخطاب کہا جاتا ہے۔ جیسے: (اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا۔ [۱] النساء / ۱۰) اس آیت کے منطوق سے یتیموں کا مال ناحق کھانے کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ اس کے موافق مفہوم سے یتیموں کا مال جلانے کی حرمت بھی ثابت ہوتی ہے اور یہ دونوں حرمتیں برابر ہیں اس لیے کہ ان کا مال نذر آتش کر دینا، جلا دینا، اِتلاف اور بربادی میں ناحق اور ناجائز طور پر کھانے کے مساوی ہے۔

مفہوم مخالف: وہ ہے جس کا حکم، منطوق کے مخالف ہو۔

اس کی چند نوعیں ہیں:

[۱] مفہوم صفت: خواہ وہ صفت نعت ہو یا حال، ظرف ہو یا عدد۔ جیسے: (اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا۔ الحجرات /۶[۲]) کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ غیر فاسق کی خبر کی تحقیق و تفتیش ضروری نہیں لہٰذا تنہا ایک عادل شخص کی خبر قبول کر لینا واجب ہے۔

[۲] مفہوم شرط: جیسے: (وَاِنْ كُنَّ اُولٰتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ۔ [۳] الطلاق / ۶) اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ اگر طلاق یافتہ عورتیں حمل والی نہ ہوں تو ان کا نان ونفقہ واجب نہیں۔

مفہوم غایت: جیسے: (فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ۔ البقرة/ ۲۳۰[۴]) اس کا منطوق تو یہ ہے کہ تین طلاق والی عورت اپنے طلاق دہندہ شوہر اول کے لیے حلال نہیں۔ لیکن غایت یعنی حتی تنکح زوجا غیرہ سے یہ مفہوم مخالف پیدا ہوا کہ اگر یہ عورت دوسرے مرد سے نکاح کر لے تو شوہر اول کے لیے حلال ہو جائے گی بشرائط۔

[۴] مفہوم حصر: جیسے: (لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۔ محمد / ۱۹[۵])، (اِنَّمَا اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۔ طه / ۹۸[۶]) ان کا منطوق تو یہ ہے کہ الٰہ صرف اللہ ہے۔ لیکن ان کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ غیر اللہ، الٰہ نہیں۔ (فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ ۔ الشوریٰ/ ۹[۷]) کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ غیر اللہ ولی نہیں۔

---

[۱] وہ جو یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ تو اپنے پیٹ میں نری آگ بھرتے ہیں۔ [۲] اگر تمھارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لو [۳] اور اگر وہ حمل والیاں ہوں تو ان پر خرچ کرو یہاں تک کہ وہ اپنا حمل جن دیں۔ [۴] تو تیسری طلاق کے بعد وہ شوہر اول کے لیے حلال نہ ہوگی جب تک دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے۔ [۵] اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ [۶] تمھارا معبود تو وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ [۷] تو اللہ ہی والی ہے۔

(وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ۔ ال عمران / ۱۵۸ [۱]) کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ تم اپنی قبروں سے غیر اللہ کی طرف نہیں اٹھائے جاؤ گے۔ اور (اِيَّاكَ نَعْبُدُ ۔ الفاتحة / ٥) کا مفہوم مخالف ہے۔ ہم دوسرے کی عبادت نہیں کرتے۔

ان مفاہیم سے استدلال میں اختلاف کی وجہ سے علما کے کثیر اقوال ظہور میں آئے جن میں صحیح ترین قول یہ ہے کہ چند شرائط کے ساتھ یہ سب حجت ہیں۔ ان شرائط کو اصول کی کتابوں میں تلاش کیا جائے۔

## قرآن کے وجوہ مخاطبت کا بیان

علامہ ابن جوزی نے اپنی کتاب "النفیس" میں لکھا ہے: قرآن میں خطاب پندرہ وجہوں اور طریقوں پر وارد ہے۔ ایک دوسرے اہل علم نے کہا: یہ خطاب تیس سے زیادہ وجہوں پر وارد ہے۔ ہم یہاں صرف بعض وجوہ کا ذکر کریں گے۔

[۱] خطاب عام (جس سے مراد عموم ہو) جیسے ارشاد باری ہے: (اَللّٰهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ (الروم/ ٤٠، الروم / ٥٤ [۲]) یہاں "کم" ضمیر خطاب عموم کے لیے ہے۔

[۲] خطاب خصوص (جس سے مراد خصوص ہو) جیسے ارشاد خداوندی ہے: (يٰاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآاُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۔ المائدة/ ٦٧ [۳]) اس آیت کریمہ میں ضمیر خطاب سے صرف حضور مراد ہیں۔ (اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۔ ال عمران / ١٠٦ [٤]) یہاں ضمائر خطاب سے منافقین یا اہل کتاب یا مرتدین مراد ہیں، تمام بنی نوع انسان اس میں داخل نہیں۔

[۳] خطاب عام جس سے مراد خصوص ہو جیسے ارشاد ہے: (يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۔ لقمان / ۳۳ [٥]) اس میں بچے اور پاگل داخل نہیں۔

[۴] خطاب خاص جس سے مراد عموم ہو جیسے (يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ ۔ الطلاق / ١ [٦]) خطاب کی ابتدا نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے فرمائی حالاں کہ حضور کے ساتھ وہ تمام لوگ بھی مراد ہیں جنھیں طلاق کا اختیار حاصل ہے۔ (يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّا اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ ۔ الاحزاب/ ٥٠ [٧])

علامہ ابوبکر صیرفی نے کہا: اس آیت میں خطاب کا آغاز حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ہے

---

[۱] اور اگر تم مر یا مارے جاؤ تو تمھیں اللہ ہی کی طرف اٹھنا ہے۔ [۲] اللہ ہی نے تمھیں پیدا کیا۔ [۳] اے رسول! ان احکام کی تبلیغ کرو جو تمھارے رب کی جانب سے تمھاری طرف اتارے گئے۔ [۴] کیا تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا تو اپنے کفر کے بدلے عذاب کا مزہ چکھو۔ [۵] اے لوگو اپنے رب سے ڈرو۔ [۶] اے نبی جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دو تو انھیں ان کی عدت کے وقت طلاق دو۔ [۷] اے نبی ہم نے تمھارے لیے تمھاری وہ بیویاں حلال کیں جن کے مہر تم نے انھیں دے دیے۔

لیکن جب موہوبہ عورت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ( وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ الاحزاب/۵۰[۱]) فرمایا تو لفظ "خالصة لك" سے معلوم ہو گیا کہ موہوبہ سے پہلے جن عورتوں کا ذکر ہوا ان سے نکاح کرنا نبی اور غیر نبی دونوں کے لیے جائز ہے۔

[۵] خطاب جنس (لفظ جنس سے خطاب) جیسے فرمان الٰہی: ( يَاَيُّهَا النَّبِيُّ) میں "نبی" جنس ہے۔

[۶] خطاب نوع (ایسے لفظ سے خطاب جو نوع ہو) جیسے: (يٰبَنِيْ اِسْرَاءِ يلَ البقرة/۴۰، البقرة/۴۷، البقرة/۱۲۲، طٰه/۸۰، الصف/۶)

[۷] خطاب عین (نفس ذات کو خطاب) جیسے (وَقُلْنَا يٰاٰدَمُ اسْكُنْ ۔ البقرة/۳۵، الاعراف/۱۹[۲]) (يٰا بْرَاهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ۔ الصافات /۱۰۵[۳])( يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ اِنِّي لَايَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۔ النمل/۱۰[۴]) (يٰعِيْسٰى اِ نِّي مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ ۔ آل عمران/۵۵[۵])

قرآن میں حضور کو یا محمد کہہ کر خطاب نہیں کیا گیا بلکہ (يٰاَيها النبی) اور (يٰاَيها الرسول) جیسے الفاظ سے خطاب کیا گیا تا کہ اللہ تعالیٰ، حضور کی عظمت و شرف کا اظہار و اعلان فرما دے اور واضح کر دے کہ ایسا خطاب صرف حضور کے ساتھ خاص ہے اس میں کوئی ان کا شریک و سہیم نہیں اور تا کہ اہل ایمان کو تعلیم دے کہ وہ انھیں ان کے نام پاک سے نہ پکاریں۔

[۸] خطاب مدح (مدح کے لفظ سے خطاب) جیسے، ( يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا) ظاہر ہے کہ ایمان صفت مدح ہے۔ اسی لیے یہ اہل مدینہ کے خطاب میں آیا۔

ایمان کا صفت مدح ہونا ان آیات سے خوب واضح ہوتا ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

(اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُوْنَ ۔ التوبة /۲۰[۶]) (يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۔ التوبة/۲۱[۷]) (خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (التوبة /۲۲[۸])

---

[۱] اور (اے نبی ہم نے تمھارے لیے) ایمان والی عورت حلال کی اگر وہ اپنی جان نبی کی نذر کرے اگر نبی اسے نکاح میں لانا چاہے یہ خاص تمھارے لیے ہے امت کے لیے نہیں۔ [۲] اور ہم نے کہا اے آدم تم جنت میں رہو۔ [۳] اے ابراہیم تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ [۴] اے موسیٰ خوف مت کر میری بارگاہ میں رسول خوف نہیں کرتے۔ [۵] اے عیسی میں تجھے پوری عمر تک پہنچاؤں گا اور تجھے اپنی طرف اٹھا لوں گا۔ [۶] وہ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مال جان سے اللہ کی راہ میں لڑے اللہ کے یہاں ان کا درجہ بڑا ہے اور وہی مراد کو پہنچے۔ [۷] ان کا رب انھیں خوشی سناتا ہے اپنی رحمت اور اپنی رضا اور ان باغوں کی جن میں انھیں دائمی نعمت ہے۔ [۸] ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے بیشک اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے۔

ان آیات سے پہلے یہ ہے: (اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوُونَ عِنْدَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ ۔ التوبۃ/۱۹[۱])

[۹] خطاب ذم (مذمت پر دلالت کرنے والے لفظ سے خطاب) جیسے (يٰاَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۔ التحریم/ ۷[۲])، (قُلْ يٰاَيُّهَا الْكٰفِرُونَ ۔ الکافرون /۱[۳]) ۔ ظاہر ہے کہ کفر صفت ذم ہے۔

[۱۰] خطاب کرامت (عزت وشرف پر دلالت کرنے والے لفظ سے خطاب) جیسے (يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ، يٰاَيُّهَا الرَّسُولُ[۴])

[۱۱] خطاب اہانت (توہین وتحقیر پر دلالت کرنے والے لفظ سے خطاب) جیسے: (قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيمٌ (صٓ/۷۷[۵])، (قَالَ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ (المؤمنون/۱۰۸[۶])

[۱۲] خطاب تہکم (استہزا واستخفاف کے طور پر خطاب) جیسے: (ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ ۔ الدخان/۴۹[۷])

[۱۳] جمع کو لفظ واحد سے خطاب کرنا، جیسے؛ (يٰاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ[۸])

[۱۴] واحد (ایک) کو لفظ جمع سے خطاب کرنا، جیسے: (يٰاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبٰتِ، وَاعْمَلُوا صَالِحًا اِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ۔ وَاِنَّ هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ ۔ فَتَقَطَّعُوا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۔ فَذَرْهُمْ فِي غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِينٍ ۔ المؤمنون/ ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴[۹]) میں لفظ رسول کی جمع رُسُل سے تنہا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مراد ہیں اور کلوا، اعملوا، تعملون اور فاتقون میں واو ضمیر بارز جمع مذکر حاضر اور امتکم اور ربکم میں ضمیر کُم جمع مذکر حاضر سے حضور کو خطاب کیا گیا ہے کیوں کہ نہ تو آپ کے زمانہ میں کوئی نبی ہوسکتا ہے اور نہ آپ کے پردہ فرمانے کے بعد ہی کوئی نبی ہوسکتا ہے۔

---

[۱] تو کیا تم نے حاجیوں کی سبیل اور مسجد حرام کی خدمت اس کے برابر ٹھہرالی جو اللہ اور قیامت پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہ اللہ کے نزدیک برابر نہیں اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔[۲] اے کافرو آج بہانے نہ بناؤ۔[۳] تم فرماؤ اے کافرو۔[۴] اے نبی، اے رسول۔[۵] اللہ نے فرمایا اے ابلیس تو اس سے نکل جا اس لیے کہ تو ملعون ہے۔[۶] رب فرمائے گا جہنم میں دھتکارے پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔[۷] (جہنم کے فرشتے ابوجہل سے بطور اہانت وتذلیل کہیں گے) چکھ (عذاب الٰہی کا مزہ) ہاں ہاں (بزعم خویش) تو ہی بڑی عزت والا کرم والا ہے۔[۸] اے انسان! تجھے اپنے رب کے ساتھ کس چیز نے جری بنادیا ہے۔[۹] اے پیغمبر پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اچھا کام کرو میں تمھارے کاموں کو دیکھتا ہوں اور بیشک یہ تمھارا دین ایک ہی دین ہے اور میں تمھارا رب ہوں تو مجھ سے ڈرو تو اس کی امت نے اپنا کام آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کرلیا۔ ہر گروہ جو اس کے پاس ہے اس میں خوش ہے تو تم ان کو ایک وقت تک ان کے نشے میں چھوڑ دو۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قول: (وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ • النحل/ ۱۲۶[۱]) میں تنہا حضور کو خطاب فرمایا گیا ہے جس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا قول: (وَاصْبِرْ وَمَاصَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ • النحل/ ۱۲۷[۲]) ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قول: (فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْا اَنَّمَا اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّااِلٰهَ اِلَّا هُوَ • هود/ ۱۴[۳]) میں لکم اور اعلموا کی ضمائر جمع مذکر حاضر سے حضور کو خطاب کیا گیا ہے جس پر دلیل اللہ تعالیٰ کے قول: (قُلْ فَأْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ • هود/ ۱۳[۴]) میں قل صیغۂ واحد مذکر حاضر ہے جس سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا گیا ہے۔

[۱۵] واحد (ایک) کو تثنیہ سے خطاب کرنا، جیسے: (اَلْقِيَافِىْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ • ق/ ۲۴[۵]) میں القیا صیغۂ تثنیہ سے داروغۂ جہنم مالک کو خطاب ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہاں اہل دوزخ کو دوزخ میں لے جانے والے فرشتوں سے خطاب ہے اس لیے یہ لفظ تثنیہ سے ایک جماعت کو خطاب کرنے کی قبیل سے ہوگا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ خطاب ان دو فرشتوں سے ہے جنھیں محشر میں جہنم کی طرف ہانکنے اور گواہی دینے کے لیے مقرر کیا گیا ہے جن کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس قول: (وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِقٌ وَّشَهِيْدٌ • ق/ ۲۱[۶]) میں کیا گیا ہے۔

[۱۶] دو کو لفظ واحد سے خطاب کرنا، جیسے: (فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى • طٰه/ ۴۹[۷]) میں خطاب صرف حضرت موسیٰ سے نہیں بلکہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون دونوں سے ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قول: (فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَامِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى • طٰه/ ۱۱۷[۸]) میں تشقی واحد مذکر حاضر ہے لیکن اس سے حضرت آدم وحوا دونوں کو خطاب کیا گیا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا: صرف حضرت آدم کی طرف مشقت میں مبتلا ہونے کی نسبت اس لیے ہے کہ وہی مخاطب اول اور مقصود کلام تھے ورنہ مشقت میں مبتلا ہونا دونوں کے لیے ثابت تھا۔

[۱۷] دو کو لفظ جمع سے خطاب کرنا، جیسے اللہ تعالیٰ کے قول: (وَاَوْحَيْنَا اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَابِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً • يونس / ۸۷[۹]) میں اجعلوا بیوتکم سے دونوں بھائیوں موسیٰ اور ہارون کو خطاب کیا گیا ہے۔

---

[۱] اور اگر تم سزا دو تو ایسی ہی سزا دو جیسی تمھیں تکلیف پہنچائی گئی تھی۔ [۲] اور اے محبوب تم صبر کرو اور تمھارا صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے اور ان کا غم نہ کھاؤ۔ [۳] تو اے محبوب اگر وہ تمھاری اس بات کا جواب نہ دے سکیں تو سمجھ لو کہ وہ اللہ کے علم ہی سے اترا ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی سچا معبود نہیں۔ [۴] تم فرماؤ کہ تم ایسی بنائی ہوئی دس آیتیں لے آؤ۔ [۵] (حکم ہوگا اے داروغۂ جہنم مالک) تم ہر بڑے ناشکرے، ہٹ دھرم کو جہنم میں ڈال دو۔ [۶] اور ہر جان یوں حاضر ہوئی کہ اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا اور ایک گواہ (ہے)۔ [۷] تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ (اور اے ہارون)۔ [۸] تو ایسا نہ ہو کہ وہ تم دونوں کو جنت سے نکال دے پھر تم مشقت میں پڑو۔ [۹] اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کو وحی بھیجی کہ مصر میں اپنی قوم کے لیے مکانات بناؤ اور اپنے گھروں کو نماز کی جگہ کرو۔

## فائدہ

بعض علما نے فرمایا: قرآن میں مذکور خطاب کی تین قسمیں ہیں:

[۱] وہ خطاب جو صرف نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ہے۔

[۲] وہ خطاب جو غیر نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ہے۔

[۳] جو نبی اور غیر نبی دونوں سے ہے۔

## قرآن میں وارد حقیقت ومجاز

قرآن میں اپنے حقیقی اور وضعی معنی میں استعمال ہونے والے الفاظ موجود ہیں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ مجاز کے ورود میں اختلاف ہے۔

حقیقت: ہر وہ لفظ ہے جو اپنے وضعی معنی پر باقی ہو اور اس میں کوئی تقدیم وتاخیر نہ ہو۔ کلام میں اس کا وقوع سب سے زیادہ ہے۔

مجاز: جمہور علما اس پر متفق ہیں کہ مجاز، قرآن میں موجود ہے۔ مگر ایک جماعت نے اس کا انکار لیا ہے جس میں فرقۂ ظاہریہ، ابن القاص شافعی اور ابن خویز منداد مالکی کے نام بھی آتے ہیں۔ ان کا ایک شبہہ تو یہ ہے کہ مجاز جھوٹ کے مانند ہے اور قرآن جھوٹ سے منزہ و پاک ہے۔ دوسرا شبہہ یہ ہے کہ متکلم اسی وقت مجاز کی طرف عدول کرتا ہے جب اس کے لیے حقیقت کے استعمال کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے اس لیے وہ استعارہ کی راہ اختیار کرتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے لیے محال ہے۔

لیکن ان کا یہ شبہہ صحیح نہیں بلکہ سرے سے بے بنیاد ہے کیوں کہ اگر قرآن میں مجاز نہ ہو تو اس کے حسن و جمال کا ایک حصہ ہی فوت ہو جائے گا اس لیے کہ بلغا کا اس پر اتفاق ہے کہ مجاز حقیقت سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ نیز اگر قرآن کا مجاز سے خالی ہونا ضروری ہو تو پھر حذف، تاکید، تکرار قصص اور کئی دوسرے امور سے بھی خالی ہونا ضروری ہوگا۔ حالاں کہ یہ سب قرآن میں بالاتفاق موجود ہیں۔

مجاز کی دو قسمیں ہیں.

[۱] مجاز ترکیبی: اسی کو مجاز اسنادی اور مجاز عقلی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا علاقہ ملابست ہے۔

مجاز ترکیبی: یہ ہے کہ فعل یا شبہ فعل کی اسناد محض ملابست وتعلق کی وجہ سے کسی ایسی چیز کی طرف کی جائے جس سے اصل میں وہ فعل یا شبہ فعل صادر نہ ہو، جیسے ارشاد باری ہے: ( وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا ۔ الانفال/ ۲ ) "اور جب ان پر اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ ان کے ایمان میں ترقی دیتی ہیں۔" ترقی دینے کی نسبت آیات کی طرف کی گئی کیوں کہ آیات اس کا سبب ہیں اور ترقی

دینا دراصل اللہ کا فعل ہے۔
(يُذَبِّحُ اَبْنَاءَهُمْ ۔ القصص/ ٤) "(فرعون) ان کے یعنی بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ذبح کرتا۔"
(يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا ۔ غافر/٣٦) "اے ہامان! میرے لیے ایک بلند عمارت بنا۔"
ذبح کرنا دراصل فرعون کے کارندوں کا فعل تھا مگر فرعون کی طرف اس کی اسناد اس لیے ہوئی کہ وہی ذبح کا حکم دینے والا تھا۔ دوسری آیت میں عمارت بنانے کی نسبت ہامان کی طرف ہے اس لیے کہ وہ حکم دے کر بنوانے والا تھا ورنہ تعمیر تو دراصل معماروں کا فعل ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قول:
(وَاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۔ ابراھیم/ ٢٨[١]) میں دار ہلاکت میں احلال (اتارنے) کی نسبت کفار مکہ کی طرف کی گئی اس لیے کہ وہ اپنی قوم کے کفر کا سبب بنے کیوں کہ انھوں نے اپنی قوم کو اس کفر کا حکم دیا۔
اسی قبیل سے ہے اللہ تعالیٰ کا قول: (فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ۔ المزمل/ ١٧[٢]) اور اللہ تعالیٰ کا قول: (فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ (الحاقۃ/٢١، القارعۃ/٧[٣])۔
پہلی آیت میں فعل جعل کی نسبت، ظرف زمان "یوم" کی طرف اس لیے کی گئی ہے کہ یہ فعل اسی میں واقع ہوگا جب کہ دوسری آیت میں رضا (پسند کرنے) کی نسبت عیشۃ کی طرف کی گئی حالاں کہ وہ پسند کی جانے والی چیز ہے نہ کہ پسند کرنے والی۔ رضا کا تعلق اس سے ہونے کے سبب اسے "راضیۃ" کہا گیا۔
[٢] مجاز مفرد یا مجاز لغوی: لفظ اولاً جس معنی کے لیے وضع کیا گیا ہو اس کے علاوہ کسی اور معنی میں استعمال ہو۔ اس کی انواع بہت ہیں:
[١] حذف، جیسے: (وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ ۔ یوسف/٨٢) "بستی سے یعنی بستی والوں سے پوچھو۔"
[٢] زیادت، جیسے: ( لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۔ الشوریٰ/ ١١[٤]) میں "ک" زائد ہے یعنی اصل میں لیس مثلہ شیء ہے۔ مگر اس میں نظر ہے۔
[٣] جز پر کل کا اطلاق، جیسے: ( يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْ اٰذَانِهِمْ ۔ البقرۃ/ ١٩) (وہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیتے ہیں) انگلیاں کانوں میں ڈالی نہیں جاسکتیں۔ انگلیوں کے جز یعنی پور ڈالے جاتے ہیں۔ یہاں جز پر کل کا اطلاق ہے۔
انامل (پوروں) کی اصابع (انگلیوں) سے تعبیر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ انھوں نے فرار میں مبالغہ کرنے کی وجہ سے پوروں کو غیر معمولی طور پر کانوں میں داخل کرلیا تھا گویا انھوں نے پوری انگلی کانوں میں داخل کرلی تھی۔

---

[١] اور انھوں نے اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں لا اتارا۔ [٢] اگر کفر کروگے تو کیسے بچوگے اس دن جو بچوں کو بوڑھا کردے گا۔ [٣] وہ من مانتے چین میں ہے۔ [٤] اس کے جیسا کوئی نہیں۔

اور (وَاِذَارَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ۔ المنافقون/٤[١]) میں کل یعنی اجسام سے مراد ان کے جز یعنی وجوہ (چہرے) ہیں کیوں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، عبداللہ بن ابی بن سلول وغیرہم کے پورے جسم نہ دیکھا کرتے بلکہ صرف ان کے چہرے دیکھتے جو ان کے اجسام کے محض ایک جز ہیں۔

[۴] تیسری قسم کی برعکس قسم یعنی کل پر جز کا اطلاق، جیسے:(وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ (الرحمن/٢٧[٢]) میں "وجه" سے ذات مراد ہے۔( فَوَلُّوْا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهٗ (البقرة/١٤٤، ١٥٠[٣]) میں "وجوه" سے پوری ذات مراد ہے کیوں کہ سینہ کا قبلہ رخ ہونا واجب ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ وجوہ سے نمازیوں کی پوری ذات مراد ہو۔ (وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍنَّاعِمَةٌ (الغاشية/٨[٤])اور (وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌعَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۔ الغاشية/٣[٥]) میں بھی وجوہ سے پورے جسم مراد لیے گئے ہیں کیوں کہ پورا جسم چین میں ہوتا یا مشقت جھیلتا ہے نہ کہ صرف چہرہ۔

اسی طرح (ذٰلِكَ بِمَاقَدَّمَتْ يَدَاكَ ۔ الحج/١٠[٦])اور(ذٰلِكَ بِمَاقَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ ۔ ال عمران/١٨٢[٧]) میں بھی ید (ہاتھ) اور ایدی (ہاتھوں) سے مراد پوری ذات ہے یعنی یہ (عذاب) اس کا بدلہ ہے جو تو نے آگے بھیجا اور جس کا تو نے دنیا میں ارتکاب کیا۔

ان دونوں آیتوں میں تقدیم (آگے بھیجنے) کی نسبت ایدی (ہاتھوں) کی طرف اس لیے کی گئی کہ زیادہ تر اعمال ہاتھوں ہی سے صادر ہوتے ہیں۔

[۵] اسم خاص کا عام پر اطلاق، جیسے: (اِنَّارَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ الشعراء /١٦) میں رسول سے رُسُل مراد ہیں۔اب معنی ہوگا "ہم سارے عالم کے رب کے فرستادے ہیں۔"

[٦] اسم عام کا خاص پر اطلاق، جیسے:(وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِى الْاَرْضِ ۔ الشورى/٥) میں مَن (اسم عام) سے خاص ایمان والے مراد ہیں۔اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا قول: (وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۔ غافر/٧[٨]) ہے۔اب معنی ہوگا:"فرشتے زمین میں رہنے والوں یعنی مومنین کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں۔"

[۷] (اعتبار ما کان) شے کو اس حالت کے اسم سے موسوم کرنا جس پر وہ شے پہلے تھی۔جیسے: (وَاٰتُواالْيَتٰمٰى اَمْوَالَهُمْ ۔ النساء/٢) "یعنی ان لوگوں کو ان کے اموال دے دو جو یتیم تھے"۔کیوں کہ بالغ ہوجانے کے بعد یتیمی کی حالت نہیں پائی جاتی ۔ (فَلَاتَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ

---

[۱] اور جب تو انھیں دیکھے ان کے جسم تجھے بھلے معلوم ہوں۔ [۲] اور باقی رہے گی تیرے رب کی ذات [۳] تو تم نماز میں اپنے چہرے اس کی طرف پھیرو۔[۴] کتنے ہی منہ اس دن چین میں ہیں۔[۵] کتنے ہی منہ اس دن ذلیل ہوں گے کام کریں مشقت جھیلیں۔[۶] یہ عذاب اس کا بدلہ ہے جو تیرے ہاتھ نے آگے بھیجا۔[۷] یہ بدلہ ہے اس کا جو تمھارے ہاتھوں نے آگے بھیجا۔[۸] اور فرشتے ایمان والوں کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں۔

(البقرۃ/ ۲۳۲) "یعنی اے عورتوں کے والیو! انھیں نہ روکو اس سے کہ وہ ان سے نکاح کرلیں جوان کے شوہر تھے۔" (مَنْ یَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا ۔ طٰه/۷٤) "جو اپنے رب کے حضور جرم کرتا ہوا آئے گا۔" اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اس جرم کے اعتبار سے بندے کو مجرم کہا جو اس نے دنیا میں کیا تھا۔ رب کے یہاں حاضری کے وقت کوئی شخص کفر و معصیت کرتا ہوا نہ آئے گا۔

[۸] (اعتبار ما یکون) شے کو اس حالت کے اسم سے موسوم کرنا جو آئندہ اسے حاصل ہوگی۔ جیسے: (اِنِّیْ اَرٰىنِیْ اَعْصِرُ خَمْرًا ۔ یوسف/۳٦) "میں نے خواب میں دیکھا کہ شراب نچوڑ رہا ہوں" یعنی انگور نچوڑ رہا ہوں جو شراب ہو جائے گا۔ (وَلَا یَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۔ نوح/ ۲۷) "اور وہ بدکار اور بڑی ناشکری اولاد ہی پیدا کریں گے" یعنی ایسی اولاد پیدا کریں گے جو بڑی ہونے کے بعد ناشکری اور بدکار ہوگی۔ (فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ ۔ البقرۃ/ ۲۳۰) "تو اگر وہ اسے تیسری طلاق دے دے تو اس کے بعد وہ اس کے لیے حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ اس شوہر اول کے علاوہ دوسرے زوج (شوہر) سے نکاح کرے۔"

عورت آئندہ جس مرد سے نکاح کرے گی اسے اللہ تعالیٰ نے زوج (شوہر) اس لیے فرمایا کہ عقد نکاح کا مآل زوجیت ہے یہ معنی نہیں کہ پہلے ہی وہ زوج ہو چکا ہے۔ (فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ ۔ الصافات/۱۰۱[۱])، (نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ ۔ الحجر/۵۳[۲]) اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو حضرت اسمٰعیل کی پیدائش کی خوش خبری دینے کے وقت ہی حضرت اسمٰعیل کو علم و حلم سے موصوف قرار دیا کیوں کہ وہ مستقبل میں زیور علم و حلم سے آراستہ ہونے والے تھے۔

[۹] حال کے لیے موضوع اسم کا محل پر اطلاق، جیسے: (فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۔ آل عمران/۱۰۷) "تو وہ اللہ کی رحمت (جنت) میں ہمیشہ رہیں گے۔" جنت محل رحمت ہے اس پر حال یعنی رحمت کا اطلاق ہوا۔ (بَلْ مَكْرُ الَّیْلِ ۔ سبأ/۲۳) "بلکہ رات کا مکر تھا"۔ مراد ہے رات میں جو مکر نشۂ غرور میں مست سردار، لوگوں کو ایمان سے باز رکھنے کے لیے کیا کرتے تھے۔ (اِذْ یُرِیْكَهُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنَامِكَ قَلِیْلًا (الانفال/۷۳) امام حسن بصری علیہ الرحمہ کے قول کے مطابق مراد ہے "جب کہ اے محبوب اللہ تمھیں کافروں کو تمھارے خواب میں یعنی تمھاری نگاہ میں تھوڑا دکھاتا تھا۔"

[۱۰] شے کو اس کے آلہ کے اسم سے موسوم کرنا، جیسے: (وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ ۔ الشعراء/ ۸٤) حضرت ابراہیم نے دعا کی کہ "اے میرے رب میرے لیے میرے بعد

---

[۱] تو ہم نے ابراہیم کو ایک بردبار بیٹے کی خوش خبری دی۔ [۲] ابراہیم ہم تجھے ایک بڑے علم والے بیٹے کی بشارت دیتے ہیں۔

آنے والی امتوں میں لسان صدق یعنی ثنائے جمیل کردے"۔ کیوں کہ لسان (زبان) اس ثنا کا آلہ ہے۔ (وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ ۔ ابراهيم/٤) "ہم نے ہر رسول کو اس کی قوم کی لسان (زبان) یعنی اس کی قوم کی لغت کے ساتھ بھیجا۔" کیوں کہ لسان، لغت (بولی) کا آلہ ہے۔

[۱۱] شے کو اس کی ضد کے نام سے موسوم کرنا، جیسے: (فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔ آل عمران/۲۱، التوبة/۳٤، الانشقاق/۲٤) "انھیں دردناک عذاب کی خوش خبری یعنی وعید سنا دو۔"

[۱۲] فعل کا اطلاق ہو مگر مراد فعل سے قریب ہونا اور اس کا ارادہ کرنا ہو، جیسے: (فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۔ الطلاق/۲) "تو جب وہ اپنی میعاد کو پہنچ جائیں یعنی عدت پوری ہونے کے قریب ہو جائیں تو انھیں بھلائی کے ساتھ روک لو"۔ کیوں کہ امساک (روکنا) میعاد یعنی عدت پوری ہو جانے کے بعد ممکن ہی نہیں۔ لیکن یہی اللہ تعالیٰ کے قول: (وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاۤءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ ۔ البقرة/۲۳۲[۱]) میں حقیقت ہے۔

اور جیسے: (فَاِذَا جَاۤءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۔ الاعراف/۳٤، النحل/٦١) "تو جب ان کو موت آ جائے گی یعنی موت ان کے قریب آ جائے گی تو ایک گھڑی نہ پیچھے ہوں گے نہ آگے۔" (وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۔ النساء/ ۹) "وہ لوگ ڈریں جو اگر اپنے پیچھے ناتواں اولاد چھوڑ جائیں تو انھیں ان کا خطرہ ہو" یعنی اپنے پیچھے ناتواں اولاد چھوڑنے کے قریب ہو جائیں تو خوف کریں اس لیے کہ یہاں خطاب وصیت کرنے والوں سے ہے کہ جب وہ اولاد چھوڑ کر دنیا سے جانے کے قریب ہوں گے جبھی انھیں اندیشہ ہوگا اور وہ ان کے لیے وصیت کر سکیں گے۔ (اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا ۔ المائدة/٦) "جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ" یعنی کھڑے ہونے کا ارادہ کرو تو مذکورہ اعضا کو دھوؤ، (فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۔ النحل/۹۸) "جب تم قرآن پڑھو یعنی قرآن پڑھنے کا اردہ کرو تو اللہ کی پناہ طلب کرو یعنی اعوذ بالله من الشيطن الرجيم کہو تا کہ بر تقدیر ارادہ، استعاذہ، قراءت سے پہلے واقع ہو۔ (وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَاۤءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَاۤىِٕلُوْنَ ۔ الاعراف/ ٤) "اور کتنی ہی بستیاں ہم نے ہلاک کیں یعنی ہم نے انھیں ہلاک کرنے کا ارادہ فرمایا تو ان پر ہمارا عذاب رات میں آیا یا جب وہ دو پہر کو سوتے تھے۔" کیوں کہ اگر یہاں ارادہ کی تقدیر نہ مانی جائے تو ف سے اهلكنها پر عطف درست نہ ہوگا۔

[۱۳] ایک صیغہ کو دوسرے صیغہ کی جگہ رکھنا۔ اس کی بہت سی نوعیں ہیں جن میں سے چند درج

[۱] اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور ان کی میعاد پوری ہو جائے تو اے عورتوں کے والیو انھیں نہ روکو اس سے کہ اپنے شوہروں سے نکاح کر لیں۔

ذیل ہیں:

(۱) فاعل کا مفعول پر اطلاق، جیسے: (فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّا خُلِقَ ، خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ . الطارق/٦) "تو چاہیے کہ آدمی غور کرے کہ کس چیز سے بنایا گیا، وہ زور سے گرائے ہوئے پانی سے بنایا گیا۔" (دافق بمعنی مدفوق ہے)، (لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ . ھود/٤٣) "آج اللہ کے عذاب (طوفان نوح) سے وہی محفوظ رہے گا جس پر وہ رحم فرمائے گا۔" (عاصم بمعنی معصوم ہے) (اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ . العنکبوت/٦٧) "اور کیا انھوں نے یہ نہ دیکھا کہ ہم نے حرمت والی زمین بنائی جس میں قتل وغارت سے محفوظ رہا جاتا ہے اور ان کے آس پاس کے لوگ اچک لیے جاتے ہیں۔" (اٰمن بمعنی مامون ہے)

[۲] مفعول کا فاعل پر اطلاق، جیسے: (اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا . مریم/٦١) "بیشک اس کا وعدہ آنے والا ہے۔" (ماتی بمعنی اٰتی ہے)، (وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا . الاسراء/٤٥) "اور اے محبوب جب تم نے قرآن پڑھا تو ہم نے تم میں اور ان میں کہ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ایک چھپانے والا پردہ کر دیا"۔ (مستور بمعنی ساتر ہے) ایک قول یہ ہے کہ یہاں "مستورا" اپنے باب پر ہے یعنی ہم نے تمھارے اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے درمیان ایک ایسا پردہ کر دیا ہے جو نگاہوں سے اس طرح مخفی ہے کہ کوئی اسے محسوس نہیں کر سکتا۔

[۳] مفرد، تثنیہ اور جمع میں سے ایک کا دوسرے پر اطلاق:

مفرد کا تثنیہ پر اطلاق، جیسے: (وَاللهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ / ٦٢) "اور اللہ و رسول کا حق زائد تھا کہ انھیں راضی کرتے اگر ایمان رکھتے تھے۔" اس مثال میں یرضوہ میں ضمیر بارز متصل اگرچہ مفرد ہے مگر اس کا اطلاق اللہ ورسول دونوں پر ہوا ہے۔ مفرد سے تعبیر یہ بتانے کے لیے ہے کہ اللہ کی خوشنودی اور رسول کی خوشنودی ایک دوسرے کو لازم ہے۔

مفرد کا جمع پر اطلاق، جیسے: (اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ . العصر/٢) "بیشک انسان ضرور گھاٹے میں ہے۔" اس مثال میں انسان مفرد کا اطلاق اس کی جمع اناسی پر ہوا ہے جس کی دلیل انسان سے استثنا ہے جو اس آیت کے بعد ہے یعنی "اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ . العصر/٣) "مگر جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور ایک دوسرے کو حق کی تاکید کی اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی۔" (اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا . المعارج /١٩) "بیشک انسان بنایا گیا ہے بڑا بے صبرا۔" اس مثال میں بھی انسان کا اناسی پر اطلاق ہوا ہے جس کی دلیل

(اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ) ہے۔

تثنیہ کا مفرد پر اطلاق، جیسے: (اَلْقِيَافِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ۰ ۲۴/۵۰) اس مثال میں القیا کا اطلاق اَلْقِ مفرد پر ہوا ہے۔ اس کی دلیل اس سے پہلے کی آیت کریمہ "وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ۰ " ہے۔ "یعنی اس کا ہم نشین فرشتہ بولا یہ ہے اس کا نامۂ اعمال جو میرے پاس حاضر ہے۔" حکم ہوگا "القيا فی جهنم کل کفار عنید" "اے فرشتے تو ایسے ہر بڑے ناشکرے ہٹ دھرم کو جہنم میں ڈال دے۔ (اس آیت کی اور تفسیریں بھی ہیں۔)

اسی قبیل سے ہر ایسا فعل بھی ہے جو دو چیزوں کی طرف منسوب ہو حالاں کہ وہ صرف ان دونوں میں سے کسی ایک کے لیے ہو۔ جیسے: (يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ۰ الرحمن/۲۲) "دونوں سمندروں یعنی شیریں اور شور سے موتی اور مونگا نکلتے ہیں۔" اس مثال میں منهما کی ضمیر تثنیہ کا اطلاق مفرد پر ہوا ہے کیوں کہ موتی اور مونگا ایک یعنی کھارے سمندر سے ہی نکلتے ہیں، شیریں سمندر سے نہیں نکلتے۔ (وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا ۰ نوح/۱۶) "اللہ نے آسمانوں میں یعنی ایک آسمان میں چاند کو جگمگا نے والا بنایا۔" اس مثال میں ضمیر جمع مؤنث کا اطلاق مفرد پر ہوا ہے۔ (نَسِيَا حُوْتَهُمَا ۰ الکهف/ ۶۱) "دونوں (موسیٰ اور ان کے خادم) اپنی مچھلی بھول گئے۔" اس مثال میں تثنیہ کا مفرد پر اطلاق ہوا ہے کیوں کہ بھولنے والے صرف حضرت یوشع تھے۔ اس کی دلیل جملۂ "فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۰ الکهف/ ۶۳) ہے جو انھوں نے حضرت موسیٰ سے عرض کیا تھا کیوں کہ انھوں نے بھولنے کی نسبت صرف اپنی طرف کرتے ہوئے کہا کہ "میں مچھلی بھول گیا"۔ لیکن چوں کہ مجمع البحرین پر پہنچ کر چٹان کے سایے میں آرام کرنے اور نیند سے بیدار ہونے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مچھلی کا ذکر کرنے سے سکوت کیا تھا اس لیے بھولنے کی نسبت حضرت یوشع کے ساتھ، حضرت موسیٰ کی طرف بھی کردی گئی۔ (فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ ۰ البقرۃ/ ۲۰۳) "تو جو دو دنوں میں جلدی کرے" یعنی دوسرے دن جلدی کرے۔ اس مثال میں یومین تثنیہ کا اطلاق مفرد پر ہوا ہے کیوں کہ تعجیل صرف دوسرے دن میں ہے۔

تثنیہ کا جمع پر اطلاق، جیسے: (فَارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۰ الملک/۴) "پھر دوبارہ نگاہ اٹھا وہ تھک کر تیری طرف پلٹ آئے گی" یعنی بار بار نگاہ اٹھا۔ اس لیے کہ دو سے زیادہ مرتبہ اٹھانے سے ہی نگاہ تھکتی ہے۔

جمع کا مفرد پر اطلاق، جیسے: (حَتّٰى اِذَا جَاءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۰ المؤمنون/۹۹) "یہاں تک کہ جب ان میں کسی کی موت آتی ہے تو کہتا ہے کہ اے میرے رب مجھے

واپس پھیر دیجیے"،یعنی مجھے واپس پھیر دے۔

[۴] مستقبل کا وقوع یقینی ہونے کے سبب اس پر ماضی کا اطلاق ، جیسے : (اَتٰی اَمْرُ اللّٰهِ فَلَاتَسْتَعْجِلُوْهُ ۔ النحل/۱)" اللہ کا امر آ گیا یعنی امر الٰہی (قیامت) یقیناً آئے گا تو اس کے جلد آجانے کا مطالبہ مت کرو۔"اس کی دلیل (فلا تستعجلوہ) ہے کیوں کہ فعل نہی، آیندہ کے کام سے منع کرنے کے لیے ہی آتا ہے ۔(وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ ۔ الزمر/۶۸)"اور صور پھونکا گیا تو آسمان والے ہلاک ہو گئے"،یعنی جب صور پھونکا جائے گا تو آسمان والے ہلاک ہوجائیں گے۔ (وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔ المائدۃ/۱۱۶)" اور جب اللہ نے فرمایا (یعنی جب قیامت میں فرمائے گا) اے مریم کے بیٹے عیسیٰ کیا تو نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا بنا لو اللہ کے سوا۔"

[۵] دوام اور ہیشگی کا فائدہ دینے کے لیے ماضی پر مضارع کا اطلاق ۔گویا ماضی کا وقوع صرف ایک بار نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ ہوتا رہا، جیسے: ( اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ ۔ البقرۃ/ ۴۴) " کیا تم لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو۔"،"تم نے لوگوں کو نیکی کا حکم دیا اور خود کو بھول گئے" یہ نہ فرمایا بلکہ اس کی جگہ "حکم دیتے ہو اور بھول جاتے ہو" ___ فرمایا۔ یہ بتانے کے لیے کہ یہ ان کی دائمی عادت ہے ۔ ( وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوالشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْكِ سُلَیْمٰنَ ۔ البقرۃ/۱۰۲) "اور انھوں نے اس جادو کی پیروی کی جو سلیمان کے عہد حکومت میں شیاطین (جن) پڑھتے۔"شیاطین نے پڑھا" نہ فرمایا بلکہ "پڑھتے" فرمایا، یہ بتانے کے لیے کہ جادو پڑھنا اور سکھانا شیطانوں کی عام عادت ہے۔ (وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ یَضِیْقُ صَدْرُكَ بِمَایَقُوْلُوْنَ ۔ الحجر/ ۹۷) " بیشک ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتوں سے تم تنگ دل ہوتے ہو۔"(وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا یُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ۔ النحل/ ۱۰۳) "بیشک ہم جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں یہ تو کوئی آدمی سکھاتا ہے۔"،یعنی ہمیشہ معلوم رہا۔ (قَدْ یَعْلَمُ مَااَنْتُمْ عَلَیْهِ ۔ النور/ ۶۴) "بیشک وہ جانتا ہے جس حال پر تم ہو"،یعنی اسے یہ علم ہمیشہ رہا۔(فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِیَآءَ اللّٰهِ ۔ البقرۃ/ ۹۱)"تو تم اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کرتے ہو۔"،یعنی تم نے انھیں کیوں قتل کیا۔ "قتل کرتے ہو" یہ بتانے کے لیے فرمایا کہ یہ ان کی عادت مستمرہ ہے۔

## حصر اور اختصاص

حصر : اسے قصر بھی کہا جاتا ہے۔ مخصوص طریقے سے ایک امر کو دوسرے امر کے ساتھ خاص کر دینا۔ یہ تعریف بھی کی جاتی ہے کہ: حکم کو شیءِ مذکور کے لیے ثابت کرنا اور اس کے ماسوا سے اس حکم

کی نفی کرنا۔

اس کی دو قسمیں ہیں:

[۱] قصر موصوف علی الصفۃ [۲] قصر صفت علی الموصوف:

پھر ان میں سے ہر ایک کی دو دو قسمیں ہیں:

[۱] قصر حقیقی [۲] قصر مجازی

قصر موصوف علی الصفۃ حقیقی کی مثال "مَا زَیْدٌ اِلَّا کَاتِبٌ ہے یعنی صفت کتابت کے علاوہ زید میں کوئی اور صفت نہیں ہے۔

یہ قسم پائی نہیں جاتی کیوں کہ کسی شے کی تمام صفات کا احاطہ متعذر ہے۔ اس لیے اس کی تمام صفات میں سے کسی ایک صفت کا اثبات اور کلی طور پر اس صفت کی ماسوا تمام صفات کی نفی کیسے ہوگی۔ اور اگر تمام صفات کا احاطہ متعذر نہ بھی مانا جائے تو بھی یہ بات بعید ہے کہ کسی ذات کی صرف ایک صفت ہو اس کی کوئی دوسری صفت ہی نہ ہو۔ اسی لیے یہ قسم قرآن میں واقع نہیں ہوئی۔

قصر موصوف علی الصفۃ مجازی کی مثال: "وَمَامُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ (ال عمران/۱٤٤" ہے۔ یعنی محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صفت رسالت تک محدود ہیں، موت سے بری ہونا ان کی صفت نہیں، یہ خدا کی صفت ہے۔

قصر صفت علی الموصوف حقیقی کی مثال: "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ " ہے۔ یعنی صفت الوہیت صرف اللہ کے لیے ثابت ہے، کسی اور کے لیے قطعاً یہ صفت نہیں۔

قصر صفت علی الموصوف مجازی کی مثال: " قُلْ لَا اَجِدُ فِیْمَا اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُہٗ اِلَّا اَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَۃً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّہٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُہِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ بِہٖ" (الانعام/١٤٥) "تم فرماؤ میں نہیں پاتا اس میں جو میری طرف وحی ہوئی، کسی کھانے والے پر کوئی کھانا حرام، مگر یہ کہ مردار ہو یا رگوں کا بہتا خون یا بد جانور کا گوشت (کہ) وہ نجاست ہے یا وہ بے حکمی کا جانور جس کے ذبح میں غیر خدا کا نام پکارا گیا۔"

اس آیت کا ظاہر مفہوم تو یہی ہے کہ صرف مذکورہ چیزیں ہی حرام ہیں حالاں کہ یہ مفہوم ظاہر بالکل مراد نہیں کیوں کہ بہت سی حرام چیزیں ایسی بھی ہیں جو اس آیت میں مذکور نہیں جیسے شراب وغیرہ نشہ آور چیزیں اور ہر نوک دار دانت والے جانور کا گوشت۔ اسی لیے علما نے فرمایا: اس آیت میں قصر مجازی ہے اور یہ قصر، آیت کے سبب نزول سے مقید ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ کو تسلی بخش انداز میں بیان فرمایا ہے جس کا خلاصہ درج

ذیل ہے:

''کفار چوں کہ مردار، خون، بد جانور کے گوشت اور ان جانوروں کو حلال قرار دیتے تھے جن کو ذبح کرنے کے وقت غیر خدا کا نام لیا گیا ہو اور دوسری بہت سی مباح چیزوں کو حرام گردانتے تھے اور ان کی یہ عادت وطبیعت، وضع شریعت کے خلاف تھی اس لیے یہ آیت کریمہ اسی حال کو بیان کرنے کے لیے نازل ہوئی جس پر کفار قائم تھے اور ان کے قول کا پرزور انداز میں رد کرنے اور ان کے جھوٹ کو واضح کرنے کے لیے حصر کے انداز میں انہی چیزوں کو ذکر کیا گیا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حرام وہی ہے جسے تم لوگوں نے حلال قرار دیا۔ اور مقصد صرف ان کا رد اور ان کی مخالفت ہے نہ کہ حصر حقیقی''

ایک اور اعتبار سے حصر کی تین قسمیں ہیں:

(۱) قصر افراد (۲) قصر قلب (۳) قصر تعیین:

قصر افراد سے اس شخص کو خطاب کیا جاتا ہے جو شرکت کا اعتقاد رکھتا ہو، جیسے: (قُلْ اِنَّمَا یُوْحٰی اِلَیَّ اَنَّمَا اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۔ الانبیاء/ ۱۰۸) ''تم فرماؤ! مجھے تو یہی وحی ہوتی ہے کہ تمھارا خدا نہیں مگر ایک اللہ۔''

اس آیت میں ضمیر مخاطب ''کم'' سے مشرکین کو خطاب فرمایا گیا ہے جو الوہیت میں اللہ کے سوا بتوں کو بھی شریک مانتے تھے۔

قصر قلب سے اسے خطاب کیا جاتا ہے جو اس کے لیے حکم کے اثبات کا اعتقاد نہ رکھے جس کے لیے متکلم اس حکم کو ثابت کرتا ہے، جیسے: (رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۔ البقرۃ/۲۵۸) ''ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے کہ جلاتا اور مارتا ہے۔'' اس سے نمرود بن کنعان کو خطاب کیا گیا جس کا خیال تھا کہ وہی جلاتا اور مارتا ہے نہ کہ خدا۔ (یہ مثال محل نظر ہے۔ ۱۲ مترجم)

اس کی واضح مثال اس آیت میں ہے: (وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ ۔ البقرۃ / ۱۳) ''اور جب ان منافقین سے کہا جاتا ہے ایمان لاؤ جس طرح لوگ یعنی اصحاب رسول ایمان لائے تو کہتے ہیں کیا ہم ان احمقوں کی طرح ایمان لے آئیں۔ سن لو! یہی احمق ہیں لیکن انھیں اس کا علم نہیں۔'' منافقین اہل ایمان کو بیوقوف کہتے تھے، قرآن نے بتایا کہ ''منافقین ہی بیوقوف ہیں'' اس میں قصر قلب ہے۔

قصر تعیین سے اس شخص کو خطاب کیا جاتا ہے جس کے نزدیک دونوں امر برابر ہوں۔

حصر کے طریقے بہت ہیں:

**طریق اول:** نفی اور استثنا ہے۔ خواہ یہ نفی لا یا ما سے ہو یا کسی اور اداۃ نفی سے۔ اور استثنا الا سے ہو یا غیر سے، جیسے: (لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۔ محمد/ ۱۹) ''وجود میں اللہ کے سوا کوئی معبود برحق

نہیں۔" (وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۔ ال عمران/ ٦٢) "اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔" (مَاقُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَا اَمَرْتَنِیْ بِهٖ ۔ المائدۃ/ ١١٧) "میں نے ان سے وہی کہا جو تو نے مجھے حکم دیا۔"

**طریق دوم:** انما ہے جو جمہور کے نزدیک حصر کے لیے ہے۔ جیسے ارشادِ خداوندی ہے: (اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۔ البقرۃ/ ١٧٣) "اس نے تمھارے اوپر صرف مردار، خون، سور کا گوشت، اور وہ حلال جانور حرام کیا جس پر ذبح کے وقت غیر خدا کا نام لیا گیا ہو۔" اور ارشاد باری ہے: (قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۔ الاحقاف/ ٢٣) "اس نے کہا: علم اللہ کے پاس ہی ہے۔" (قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۔ هود/ ٣٣) "بولا وہ (عذاب) تو اللہ ہی تم پر لائے گا۔"

**طریق سوم:** ہمزہ کے فتحے کے ساتھ اَنَّمَا ہے جسے زمخشری اور بیضاوی نے طرق حصر سے شمار کیا ہے چناں چہ دونوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے قول: (قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰى اِلَیَّ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ) میں انما حصر کے لیے ہے۔ "تم فرماؤ مجھے یہی وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے۔"

**طریق چہارم:** معمول کو مقدم کر دینا، جیسے: (اِيَّاكَ نَعْبُدُ ۔ الفاتحۃ/ ٥) "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔" (لَاْ اِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ۔ ال عمران/ ١٥٨) "دوبارہ زندہ کیے جانے کے بعد تم اللہ ہی کی بارگاہ میں حاضر کیے جاؤ گے۔"

کچھ علما اس کے مخالف ہیں اور اسے وجوہ حصر سے نہیں شمار کرتے۔

**طریق پنجم:** ضمیر فصل ہے، جیسے: (فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ ۔ الشوری/ ٩) "تو اللہ ہی والی ہے۔" اس میں ھو ضمیر فصل سے حصر کا معنی پیدا ہوا۔ (واُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ البقرۃ/٥، ال عمران/١٠٤، التوبۃ/٨٨، الروم/٣٨، لقمان/٥) "اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔" اس آیت میں "ھم" ضمیر فصل سے حصر کا معنی پیدا ہوا۔ (اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۔ ال عمران/٦٢) "یہی بیشک سچا بیان ہے۔" اس میں "ھو" ضمیر فصل سے حصر کا معنی پیدا ہوا۔

## قرآن میں وارد ایجاز و اطناب

ایجاز اور اطناب بلاغت کی عظیم ترین انواع میں سے ایک ہیں یہاں تک کہ مصنف "سر الفصاحۃ" (ابو محمد عبد اللہ بن محمد خفاجی متوفی ٤٦٦ھ) نے بعض علما کا یہ قول نقل کیا کہ بلاغت یہی "ایجاز و اطناب" ہیں۔

ایجاز و اطناب کی تعریف میں علما کے الفاظ مختلف ہو گئے ہیں، بعض نے کہا: ایجاز: متعارف عبارت سے کم تر عبارت سے مقصود کی ادائیگی، اور اطناب: متعارف عبارت سے زیادہ عبارت سے مقصود کی ادائیگی۔ زیادہ اس لیے کہ مقام قابل بسط و تفصیل ہے۔

بعض نے کہا : ایجاز : مراد کی ادائیگی کے لیے درکار متعارف عبارت سے کم میں مقصود کو پورے طور پر ادا کردینا۔ اطناب: کسی فائدہ کے لیے زائد لفظ سے مراد کی تعبیر، یہ اسہاب سے اخص ہے اس لیے کہ اسہاب، تطویل کا نام ہے خواہ یہ تطویل کسی فائدہ کے لیے ہو یا بے فائدہ ہو۔

ایجاز کی قسمیں:

ایجاز کی دو قسمیں ہیں (۱) ایجاز قصر (۲) ایجاز حذف:

**ایجاز قصر:** کم الفاظ میں زیادہ مضمون کا بیان، جیسے ارشاد خداوندی: ( اِنَّهٗ مِنۡ سُلَيۡمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ اَلَّا تَعۡلُوۡا عَلَىَّ وَاۡتُوۡنِىۡ مُسۡلِمِيۡنَ۔ النمل/ ۳۰) "بیشک وہ (خط) سلیمان کی طرف سے ہے اور بیشک وہ اللہ کے نام سے ہے جو نہایت مہربان رحم والا (ہے) یہ کہ مجھ پر بلندی نہ چاہو اور گردن رکھتے ہوئے میرے حضور حاضر ہو۔" یہاں خط بھیجنے والے کا نام، خط کا عنوان، اور پورا مضمون سب کچھ بہت مختصر عبارت میں بیان کر دیا گیا۔

اسی سے ایجاز جامع بھی ہے یعنی لفظ متعدد معانی پر مشتمل ہو، جیسے: ( اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَالۡاِحۡسَانِ۔ النحل/ ۹۰) "بیشک اللہ عدل واحسان کا حکم دیتا ہے۔" یہاں عدل سے مراد وہ راہ راست ہے جو افراط وتفریط سے پاک ہے۔ اس سے اعتقاد، اخلاق اور بندگی سے متعلق تمام واجبات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جب کہ احسان سے عبودیت کے واجبات میں اخلاص مراد ہے۔

احسان کا یہ معنی اس لیے بیان کیا گیا کہ حدیث میں اس کی تفسیر کرتے ہوئے حضور نے فرمایا: اَنۡ تَعۡبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ۔ "احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔" مطلب یہ ہے کہ اپنی نیت میں اخلاص رکھتے ہوئے، خضوع وفروتنی کے ساتھ کھڑے ہو اور ہوش واحتیاط کا دامن پوری طرح تھامے رہو۔ ( وَاِيۡتَآءِ ذِى الۡقُرۡبٰى (النحل/ ۹۰) "اور اللہ تعالیٰ قرابت داروں کو اپنا مال دینے کا حکم دیتا ہے۔" قرابت داروں کو مال دینا واجب سے زائد یعنی نوافل سے ہے۔

یہ ایجاز جامع اوامر سے متعلق تھا۔ اب نواہی سے متعلق ارشاد ہے: ( وَيَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ وَالۡبَغۡىِ۔ النحل/ ۹۰) "اور منع فرماتا ہے بے حیائی اور بری بات اور سرکشی سے۔" یہاں "فحشاء" سے قوت شہوانی کی طرف اور "منکر" سے اس افراط کی طرف اشارہ ہے جو قوت غضبانیہ سے پیدا ہوتا ہے یا اس سے ہر وہ امر مراد ہے جو شرعاً حرام ہے۔ اور "بغی" سے اس تکبر وتعلّی کی طرف اشارہ ہے جو قوت وہمیہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے حضرت ابن مسعود نے فرمایا: قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں ہے جو اس آیت سے زیادہ خیر وشر کی جامع ہو۔ اسے حاکم نے مستدرک میں تخریج کیا۔

اسی سے اللہ تعالیٰ کا قول: ( وَلَكُمۡ فِى الۡقِصَاصِ حَيٰوةٌ۔ البقرۃ/ ۱۷۹) ہے۔ "اور

تمھارے لیے قصاص میں حیات عظیم ہے'' اس لیے کہ اس کے الفاظ قلیل ہونے کے باوجود اس کے معانی کثیر ہیں کیوں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ انسان جب یہ جانے گا کہ کسی کو قتل کردینے پر وہ خود قتل کردیا جائے گا تو یہ اس بات کا داعی ہوگا کہ وہ اقدام قتل سے باز رہے اس طرح قتل یعنی قصاص سے ایک دوسرے کو قتل کردینے کے بہت سے واقعات رو پذیر نہ ہوں گے اور یہ لوگوں کی زندگی کا باعث ہوگا۔ اس مضمون کی ایک بڑی مختصر مثل عرب میں رائج تھی (اَلْقَتْلُ اَنْفٰی لِلْقَتْلِ۔ قتل، قتل کو زیادہ دور کرنے والا ہے) اس مثل سے ''في القصاص حيوة'' کو بیس سے زیادہ طریقوں سے افضل قرار دیا گیا ہے۔

ابن اثیر نے اس تفضیل وترجیح کا انکار کرتے ہوئے کہا: کلام خالق اور کلام مخلوق کے درمیان کوئی مماثلت نہیں۔علما اس طرح کے نکات ذہنی مشق کے طور پر بیان کرتے ہیں۔

علما کی بیان کردہ وجوہ تفضیل میں سے چند درج ذیل ہیں:

**وجہ اول:** مثل کے مقابل کلام الٰہی کا اصل حصہ یہ ہے: ''القصاص حيوة'' اس کے حروف کلام عرب کے مقابلے میں کم ہیں کیوں کہ اس کے حروف صرف دس ہیں جب کہ ''القتل انفى للقتل'' کے حروف چودہ ہیں۔

**وجہ دوم:** مثل میں یہ بیان ہے کہ قتل، قتل کو دفع کرتا ہے، حیات لاتا ہے یا نہیں، اس کی صراحت نہیں، اور آیت میں یہ صراحت ہے کہ قصاص میں حیات ہے اور یہی قصاص کا مقصود ہے۔

**وجہ سوم:** لفظ ''حياة'' کو نکرہ لانا تعظیم کا افادہ کررہا ہے لٰہذا یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قصاص میں ''حیات دراز'' ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے قول: (وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ، البقرة/ ٩٦) میں حياة کی تنکیر، تعظیم کے لیے ہے۔اس لیے معنی ہوگا: ''تم انھیں لمبی زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤ گے۔'' جب کہ مندرجہ بالا مثل ایسی نہیں کیوں کہ للقتل میں الف لام تعریف جنس کا ہے ـــ جو تعظیم کا افادہ نہیں کرتا اور چوں کہ آیت ''وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ'' میں ''حيٰوة'' کی تنکیر تعظیم کے لیے ہے اس لیے مفسرین نے اس کی تفسیر ''بقا'' سے کی ہے۔

**وجہ چہارم:** آیت کریمہ اپنے مضمون کے لحاظ سے ہر قصاص کے مفید حیات ہونے کا افادہ کررہی ہے اور یہ کلی طور پر صادق ہے۔مگر مثل کلی طور پر صادق نہیں اس لیے کہ ہر قتل، قتل کو دفع کرنے والا نہیں ہوتا، بلکہ قتل کبھی قتل کا داعی اور محرک ہوجاتا ہے، یہ وہ قتل ہے جو ظلماً ہو۔ ہاں قتل کو دفع کرنے والا ایک قتل خاص ہے جو قصاص سے موسوم ہے اس میں قتل کا ازالہ بھی ہے اور حیات کا افادہ بھی۔

**وجہ پنجم:** آیت کریمہ، مثل میں واقع لفظ قتل کی تکرار سے خالی ہے اور جو کلام تکرار سے خالی ہو وہ تکرار پر مشتمل کلام سے افضل ہوتا ہے اگر چہ یہ تکرار فصاحت میں خلل انداز نہ ہو۔

## ایجاز حذف اور اس کے اسباب

ایجاز حذف کے اسباب یہ ہیں:

[۱] اختصار اور محذوف کے ظاہر اور غیر مبہم ہونے کے سبب، بے فائدہ طولِ کلام سے بچنا۔

[۲] اس بات پر تنبیہ کہ وقت میں اتنی گنجائش نہیں کہ محذوف کو ذکر کیا جائے اور اسے ذکر کرتے کرتے اہم امر فوت ہو جائے۔[جیسے ''سانپ سانپ'' سے مقصود ہے، سانپ سے بچو یا سانپ کو مارو۔ مگر اتنا بولنے کی گنجائش نہیں، اندیشہ ہے کہ یہ بولتے بولتے آدمی اس کے ضرر کا شکار ہو جائے یا سانپ نکل بھاگے]

باب تحذیر واغرا کا یہی فائدہ ہے۔ اور یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے قول:(نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۔ الشمس/ ۱۳) میں یکجا ہو گئے ہیں کیوں کہ "ناقة الله" فعل "ذَرُوْا" کی تقدیر سے تحذیر اور "سقيٰها" "اَلْزَمُوْا" کی تقدیر سے اغرا ہے۔ اب معنیٰ ہوگا: "ناقه (اونٹنی) کو چھوڑ دو اور اس کے پینے کا جو دن مقرر ہے اس میں اسے ضرور پینے دو۔''

[۳] حذف میں ابہام پیدا ہو جانے کے سبب محذوف کی عظمت اور بڑائی کا اظہار کرنا۔ جیسے: اہل جنت کے وصف میں اللہ تعالیٰ کے قول:(حَتّٰى اِذَا جَآءُوْهَا وَ فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا ۔ الزمر/۷۳[۱]) میں جواب اذا کو اس لیے حذف کر دیا گیا کہ جنت کے پاس آنے اور اس کے دروازوں کے کھولے جانے کے وقت جو کچھ وہ دیکھیں گے اس کے وصف کی کوئی انتہا نہیں تو جواب شرط حذف کر کے یہ ظاہر کیا گیا کہ وصف جنت کی تفصیل سے بیان کا دائرہ تنگ ہے اس لیے نفوس انسانی کو چھوڑ دیا گیا کہ وہ جو چاہیں اندازے لگائیں لیکن اس کے باوجود مناظر جنت کی کنہ اور حقیقت تک ان کی رسائی نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قول: ( وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ ۔ الانعام/ ۲۷) میں بھی "لو" کا جواب حذف کر دیا گیا ہے یعنی ''اگر تم ان کے آگ پر کھڑے کیے جانے کے وقت نظر ڈالو گے تو ایک ایسا خوفناک اور بھیانک منظر دیکھو گے جس کے احاطہ سے عبارت قاصر ہے۔''

[۴] محذوف ایسا لفظ ہے جو کلام میں کثرت سے آتا رہتا ہے اس لیے اسے حذف کر کے کلام میں تخفیف مقصود ہے۔ جیسے حرف ندا کے حذف میں ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے: (يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۔ یوسف/۲۹)" اے یوسف! اس سے اعراض کرو۔'' یہاں "یا" حرف ندا محذوف ہے۔

[۵] محذوف کی تعظیم کے پیش نظر اس کو ذکر سے محفوظ رکھنا، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول: (قَالَ

---

[۱] یہاں تک کہ جب وہ جنت کے پاس آئیں گے اور اس کے دروازے کھولے جائیں گے تو وہ اس میں داخل ہوں گے۔

فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ، قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ، قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ، قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ، قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ. الشعراء/۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸)

''فرعون بولا: اور سارے جہان کا رب کیا ہے؟ موسیٰ نے فرمایا: رب آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اگر تمھیں یقین ہو۔ (فرعون) اپنے آس پاس والوں سے بولا: کیا تم غور سے سنتے نہیں۔ موسیٰ نے فرمایا: رب تمھارا اور تمھارے اگلے باپ دادوں کا۔ (فرعون) بولا تمھارے یہ رسول جو تمھاری طرف بھیجے گئے ہیں ضرور عقل نہیں رکھتے۔ موسیٰ نے فرمایا: رب پورب اور پچھم کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اگر تمھیں عقل ہو۔''

ان آیات میں تین مقامات پر مبتدا کو حذف کر دیا گیا ہے۔ ایک تو "رب" کا ذکر کرنے سے پہلے یعنی "هو رب" دوسرے ''ربكم'' سے پہلے یعنی: ''الله ربكم" اور تیسرے "رب المشرق" سے پہلے یعنی ''الله رب المشرق"۔ ایسا اس لیے ہوا کہ حضرت موسیٰ نے فرعون کے حال اور سوال پر اس کی جرأت و دلیری کو ایک بڑی بات تصور کیا کہ چھوٹا منہ بڑی بات بولتا ہے اس لیے آپ نے تعظیم کے پیش نظر اسم جلالت کو حذف کر دیا۔

[٦] محذوف کی تحقیر کے پیش نظر کلام کو اس کے ذکر سے محفوظ رکھنا، جیسے: (صُمٌّ بُكْمٌ (البقرة /۱۸، ۱۷۱) میں " هُمْ "یا" الْمُنٰفِقُوْن "کا حذف ان کی تحقیر کے لیے ہے۔ ''وہ بہرے گونگے ہیں۔''

[۷] حذف سے عموم کا قصد کرنا، جیسے: (وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (الفاتحة/ ۵) ''ہم تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں۔'' کس امر میں مدد طلب کرتے ہیں، یہ مذکور نہیں اس لیے کہ عموم مقصود ہے یعنی ہم عبادت میں اور اپنے تمام امور میں تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں۔

(وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ. يونس/ ۲۵) ''اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔'' کسے بلاتا ہے، یہ مذکور نہیں اس لیے کہ مقصود یہ ہے کہ ہر ایک کو اس طرف بلاتا ہے۔

[۸] رعایت فاصلہ، جیسے: ( مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى. الضحىٰ/ ۳) ''تمھارے رب نے تمھیں نہ چھوڑا اور نہ مکروہ جانا۔'' اس مثال میں اصل " وَمَا قَلَاكَ " ہے۔ مگر رعایت فاصلہ کی وجہ سے "ك" کو حذف کر دیا گیا اس سے کلام میں اختصار بھی ہو گیا، اور قرینۂ ماسبق کے سبب محذوف کی تعیین دشوار بھی نہیں۔

[۹] ابہام کے بعد بیان مقصود ہو۔ اس لیے کہ ابہام کے باعث نفس میں ادراک کا اشتیاق

پیدا ہو جاتا ہے اور انتظار واشتیاق کی حالت میں جب بیان آتا ہے تو ذہن میں زیادہ راسخ اور دل میں زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ جیسا کہ فعل "مشیئۃ" میں ہوتا ہے کہ عموماً اس کا مفعول، فعل کے ساتھ مذکور نہیں ہوتا اور مابعد سے معلوم ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے: ( وَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ ۔ النحل/ ۹) "اگر وہ چاہتا تو تمھیں ہدایت دیتا۔" اصل عبارت یہ ہے " وَلَوْ شَاءَ هِدَايَتَكُمْ لَهَدَاكُمْ " "اگر وہ تمھیں ہدایت دینا چاہتا تو تمھیں ہدایت دے دیتا۔" شاء کا مفعول حذف کر دینے سے ابہام پیدا ہوا کہ اس کا مفعول کیا ہے پھر ھداکم سے اس کا بیان ہوا تو حذف سے ابہام پیدا کر کے مفعول کو جاننے کا اشتیاق پیدا کیا گیا پھر مفعول کا پتہ دیا گیا تاکہ نفس میں زیادہ راسخ اور زیادہ اثر انداز ہو۔

## اطناب چند امور سے ہوتا ہے

[۱] ابہام کے بعد ایضاح، جیسے: ( رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۔ طٰه/ ۲۵ ) ) "اے میرے رب میرے لیے میرا سینہ کشادہ کر دے۔" "اشرح لی" کا معنی ہے "میرے لیے کھول دے"، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ متکلم اپنے لیے کسی چیز کے کھولنے کی طلب کر رہا ہے مگر وہ کیا چیز ہے اس کا بیان نہ ہوا، وہ مبہم ہے۔ بعد میں "صدری "(میرا سینہ) کا اضافہ اس ابہام کو دور کر کے مطلوب کو بیان کر رہا ہے ۔ اس طریقۂ کلام میں تاکید بھی پائی جاتی ہے۔ گویا مفعول کو دوبار ذکر کیا گیا، ایک بار مبہم طور پر، دوسری بار مفسَّر طور پر۔ اور یہ موقع تاکید کا طالب بھی ہے۔ اس لیے کہ رسول بنا کر بھیجنا یہ بتا رہا ہے کہ سختیوں کا سامنا ہوگا۔ اسی طرح (اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۔ الشرح/۱)[۱] بیان بعد ابہام کے سبب کلام مؤکد ہے اور مقام تاکید کا مقتضی بھی ہے اس لیے کہ یہ مقام امتنان وتفخیم شان کا مقام ہے۔

[۲] عام کے بعد خاص کا اس پر عطف: اس کا فائدہ اس خاص کے فضل و برتری پر تنبیہ ہے۔ گویا وہ اپنے ہم جنسوں سے افضل و برتر ہونے کے سبب ان سے مغایر اور جدا ہے جیسے معطوف اپنے معطوف علیہ سے مغایر اور جدا ہوتا ہے۔ اس لیے اس خاص کو بطور عطف ذکر کیا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے: (حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۔ البقرة / ۲۳۸) "نمازوں اور خاص طور سے بیچ والی نماز (عصر) کی پابندی کرو۔" دوسری جگہ ہے: ( مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ ، فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ۔ ) "جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں اور جبریل و میکائیل کا دشمن ہو تو اللہ ان کافروں کا دشمن ہے۔"

پہلی مثال میں صلوات عام ہے، صلاۃ وسطیٰ خاص، دوسری مثال میں ملائکہ عام ہے اور جبریل و میکائیل خاص، اور عام پر خاص کے عطف کا فائدہ وہی ہے جو اوپر ذکر ہوا۔

---

[۱] کیا ہم نے تمھارے لیے تمھارا سینہ کشادہ نہ کر دیا۔

[۳] عام کا خاص پر عطف۔ بعض علما نے اس کے وجود کا انکار کر کے غلطی کی کیوں کہ اس کا فائدہ یعنی تعمیم بالکل واضح ہے۔ اور خاص کو پہلے الگ لانے کا فائدہ اس کی اہمیت کا اظہار ہے۔ جیسے: (اِنَّ صَلٰوتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۔ / الانعام/۱۶۲) "بیشک میری نماز، میری عبادت اور میرا جینا مرنا سارے عالم کے رب اللہ کے لیے ہے۔" اس مثال میں "نسك" بمعنی عبادت کا عطف "صلوتی" پر ہے جو "صلوتی" سے عام ہے کیوں کہ عبادت میں نماز بھی داخل ہے اور دیگر عبادتیں بھی۔ اور جیسے: (اٰتَیۡنٰكَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِی وَالۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ۔ الحجر/۸۷) "بیشک ہم نے تم کو سات آیتیں دیں جو دہرائی جاتی ہیں اور عظمت والا قرآن (دیا)۔" اس مثال میں معطوف علیہ "سبعا من المثانی" سے سورۂ فاتحہ مراد ہے اور ظاہر ہے کہ معطوف یعنی "القرآن العظیم" اس سے عام ہے۔ خاص کو پہلے الگ کر کے لانا اس کی اہمیت کے اظہار کے لیے ہے اور عام کو بعد میں معطوف کرنا عمومِ حکم بتانے کے لیے ہے۔

## تشبیہ و استعارۂ قرآن

تشبیہ بلاغت کی اشرف و اعلیٰ قسموں میں سے ایک ہے۔

مبرد نے کامل میں کہا: اگر کوئی کہنے والا کہے کہ "یہ کلام عرب میں سب سے زیادہ مستعمل ہے تو اس کی بات بعید از حقیقت نہ ہوگی"۔

حضرت ابو القاسم بن البند ار بغدادی (عبداللہ بن محمد بن حسین معروف بہ "ابن ناقیا" متوفی ۴۸۵ھ) نے تشبیہات قرآنی پر ایک مستقل کتاب تصنیف فرمائی ہے جس کا نام انھوں نے "الجمان فی تشبیہات القرآن" رکھا ہے۔

ایک جماعت نے۔ جس میں سکاکی بھی شامل ہیں۔ اس کی تعریف یوں کی ہے۔

تشبیہ: کسی معنی میں ایک امر کے ساتھ دوسرے امر کی مشارکت بتانا۔

اس کے ادوات، حروف، اسما اور افعال تینوں ہیں:

حروف، جیسے اللہ تعالیٰ کے قول: (مَثَلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّہِمۡ اَعۡمَالُہُمۡ کَرَمَادِ اشۡتَدَّتۡ بِہِ الرِّیۡحُ فِیۡ یَوۡمٍ عَاصِفٍ۔ ابراھیم/ ۱۸[۱]) میں "رماد" پر کاف۔ اور جیسے اللہ تعالیٰ کے قول: (اِنَّہَا شَجَرَۃٌ تَخۡرُجُ فِیۡۤ اَصۡلِ الۡجَحِیۡمِ طَلۡعُہَا کَاَنَّہٗ رُءُوۡسُ الشَّیٰطِیۡنِ ۔ الصافات/ ۶۵[۲]) میں "کأن"۔

---

[۱] اپنے رب سے منکروں کا حال ایسا ہے کہ ان کے کام ہیں جیسے راکھ کہ اس پر ہوا کا سخت جھونکا آیا آندھی کے دن میں۔ [۲] بیشک وہ (تھوہڑ) ایک پیڑ ہے کہ جہنم کی جڑ میں نکلتا ہے اس کا شگوفہ جیسے دیووں کے سر۔

اسما، جیسے "مثل"، "شبہ" اور انھیں جیسے وہ الفاظ جو مصدر مماثلت ومشابہت سے مشتق ہوں۔ طیبی نے کہا: "مَثَل" قدر ومنزلت کے حامل ایسے حال یا صفت میں ہی استعمال ہوتا ہے جس میں غرابت وندرت ہو۔ جیسے ارشاد خداوندی ہے: ( مَثَلُ مَا يُنفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ ۔ ال عمران/۱۱۷ ) " کہاوت اس کی جو اس دنیا کی زندگی میں خرچ کرتے ہیں اس ہوا کی سی ہے جس میں پالا ہو۔" اور جیسے ارشاد باری ہے: (اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ، حَتّٰى اِذَا اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَ ظَنَّ اَهْلُهَا اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَا اَتٰهَا اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ۔ یونس/۲۴) "دنیا کی زندگی کی کہاوت تو ایسی ہی ہے جیسے وہ پانی کہ ہم نے آسمان سے اتارا تو اس کے سبب زمین سے اگنے والی چیزیں سب گھنی ہو کر نکلیں جو کچھ آدمی اور چوپائے کھاتے ہیں یہاں تک کہ جب زمین نے اپنا سنگار لے لیا اور خوب آراستہ ہوگئی اور اس کے مالک سمجھے کہ یہ ہمارے بس میں آگئی، ہمارا حکم اس پر آیا رات میں یا دن میں تو ہم نے اسے کر دیا کاٹی ہوئی گویا کل تھی ہی نہیں۔"

اس مثال میں دس ایسے جملے ہیں جن کے مجموعے سے ایسی ترکیب بنی کہ اگر ان میں سے کوئی بھی جملہ ساقط ہو جائے تو تشبیہ مختل اور فاسد ہو جائے کیوں کہ یہاں مقصود حالِ دنیا کو اس کے جلد فنا ہو جانے، نعمت دنیوی کے تیزی سے ختم ہو جانے اور لوگوں کے اس دنیا سے فریب خوردہ رہنے میں، آسمان سے برسنے والے اس پانی کے حال سے تشبیہ دینا ہے جس نے قسم قسم کی سرسبز وشاداب فصلیں اور گھاسیں اگائیں اور ان کے حسن وجمال سے نفیس اور عمدہ لباس میں ملبوس نئی نویلی دلہن کی طرح روئے زمین کو مزین وآراستہ کر دیا یہاں تک کہ جب اہل دنیا ان کی طمع کریں اور یہ خیال کر بیٹھیں کہ وہ آفات سماوی سے محفوظ ہیں تو اچانک ان پر اللہ کا سخت عذاب آجائے جس سے حالت یہ ہو جائے کہ گویا وہ کل تھیں ہی نہیں۔

افعال، جیسے يُشَابِهُ ، يُمَاثِلُ ، يَحْكِيْ وغیرہ۔ بعض علما نے عَلِمْتُ، حَسِبْتُ کو بھی بعض احوال میں افادۂ تشبیہ کے لیے مانا ہے مگر بعض دیگر حضرات ان سے افادۂ تشبیہ نہیں مانتے۔

## قرآنی استعارات

استعارہ: وہ لفظ جو ایسے معنی میں مستعمل ہو جو اس لفظ کے معنیٔ اصلی سے مشابہ قرار دیا گیا ہو۔
بعض نے کہا: استعارہ کی حقیقت یہ ہے کہ: کلمہ سے جو شئی معلوم ومتعارف ہو اس سے کلمہ کو ایسی شئی کے لیے بطور عاریت لینا جو اس کلمہ سے معلوم ومتعارف نہ ہو۔

اس کی حکمت: مخفی کا اظہار، اس ظاہر کی توضیح جو خوب واضح نہ ہو یا حصول مبالغہ یا ایک ساتھ ان سب کا حصول۔

اظہار خفی، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول: ( وَاِنَّهٗ فِيْ اُمِّ الْكِتٰبِ. الزخرف / ٤ ) "بیشک وہ ( قرآن ) اصل کتاب ( لوح محفوظ ) میں ہے۔" اس قول کی حقیقت " وَاِنَّهٗ فِيْ اَصْلِ الْكِتٰبِ " ہے۔ تو یہاں لفظ ام، اصل ( جڑ ) کے لیے مستعار ہوا۔ وجہ جامع یہ ہے کہ جیسے اصل سے شاخیں نکلتی ہیں اسی طرح ام ( بمعنی ماں ) سے اولاد کا ظہور ہوتا ہے۔

اس کی حکمت ایک غیر مرئی چیز کی تمثیل ہے تا کہ وہ مرئی ہو جائے۔ یوں سامع ( سننے والا ) حد سماع ( شنوائی ) سے حد عیان ( آنکھ سے دیکھنے ) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور یہ بیان میں سب سے زیادہ بلیغ ہے۔

امر غیر جلی کو اس طرح واضح کرنا کہ خوب روشن ہو جائے، جیسے اللہ تعالیٰ کے قول: ( وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ. الاسراء/ ٢٤[1] ) سے مراد "اولاد کو نرم دلی سے اپنے والدین کے حضور عاجزی وفروتنی کرنے کا حکم" دینا ہے۔ لیکن اس مضمون کا بیان کرنے کے لیے سب سے پہلے "ذل" کا " جانب " سے پھر " جانب "کا " جناح " سے استعارہ کیا گیا۔ اس لیے استعارۂ قریبہ کی تقدیر " وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ " ہوئی جس کا معنی ہے "اپنے پہلو کو عاجزی کی وجہ سے پست رکھو"۔ یوں اس مقام میں استعارہ کی حکمت یہ ہے کہ حسن بیان کے مقصد سے شئ غیر مرئی کو مرئی کر دیا جائے۔ اور چوں کہ یہاں مقصود یہ ہے کہ اولاد، والدین کے لیے اپنا پہلو انتہائی عاجزی وفروتنی کی حد تک پست کر دے۔ اس لیے استعارہ میں، استعارۂ قریبہ سے بھی بلیغ تر استعارے کی حاجت ہوئی لہٰذا لفظ " جناح" سے ان معانی کے پیش نظر استعارہ کیا گیا جو " خَفْضُ الْجَانِبِ" سے حاصل نہیں ہوتے کیوں کہ اگر کوئی شخص اپنا پہلو پستی کی طرف ذرا بھی جھکا دے تو اس پر "پہلو کا جھکانا" صادق ہو جائے گا جب کہ مطلوب یہ ہے کہ "پہلو کو زمین سے لگا دے۔" اور یہ بات "پرندوں" جیسے "جناح" ( بازو ) کے ذکر سے پیدا ہوتی ہے۔

مبالغہ، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول: ( وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا. القمر/ ١٢ ) کہ اس کی حقیقت "وَفَجَّرْنَا عُيُوْنَ الْاَرْضِ" ہے۔ "یعنی ہم نے زمین کے چشمے جاری کیے۔" لیکن اگر اس معنی کی تعبیر اسی جملے سے کی جائے تو اس میں وہ مبالغہ نہ ہوگا جو پہلے جملے میں ہے کیوں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری زمین چشموں میں بدل دی گئی۔

---

[1] اور ان کے لیے عاجزی کا بازو بچھا نرم دلی سے۔

# قرآن میں وارد کنایہ اور تعریض

کنایہ اور تعریض فصاحت و بلاغت کی انواع و اقسام سے ہیں:

کنایہ صریح سے بلیغ تر ہوتا ہے۔

اہل بیان کے نزدیک کنایہ: وہ لفظ ہے جس سے اس کا لازم معنی مراد لیا جائے۔

کنایہ کے چند طریقے ہیں:

[۱] قدرت کے عظیم ہونے پر تنبیہ، جیسے اللہ تعالیٰ کے قول: (هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۔ الاعراف/ ۱۸۹) میں " نفس واحدة " سے حضرت آدم کا کنایہ ہے۔ ''وہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا۔''

[۲] تصریح کا ناپسندیدہ ہونا، جیسے قرآن میں "ملامسة "، "مباشرة "، "افضاء "، "رفث " اور " دخول " سے جماع کا کنایہ۔ اسی طرح (وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا ۔ البقرة/ ۲۳۵) میں "سر " سے جماع کا کنایہ۔ ''ہاں ان سے خفیہ وعدہ نہ کر رکھو۔''

[۳] بلاغت اور مبالغہ کا قصد، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول: ( اَوَ مَنْ يُّنَشَّؤُا فِى الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِى الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ۔ الزخرف/ ۱۸ )"اور کیا وہ جو گہنے میں پروان چڑھے اور بحث میں صاف بات نہ کرے۔" اس آیت میں '' دقیق امور و معانی میں غور و فکر سے بے خبر، زینت و آرائش اور آرام و آسائش میں پرورش پانے والی'' سے "نساء "(عورتوں) کا کنایہ کیا گیا۔ اگر خود لفظ "نساء" کو ذکر کر دیا جاتا تو اس سے اس مضمون کا اِشعار نہ ہوتا۔ یہاں مراد فرشتوں سے اس کی نفی ہے۔ اور جیسے ارشاد باری ہے: ( بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۔ المائدة/٦٤ )" بلکہ اس کے ہاتھ کشادہ ہیں۔" اس میں اللہ تعالیٰ کے بہت زیادہ جواد و کریم ہونے سے کنایہ ہے۔

[۴] قصد اختصار، جیسے: لفظ" فَعَلَ " سے متعدد الفاظ کا کنایہ۔ ارشاد خداوندی ہے: ( لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۔ المائدة /۷۹)" ضرور بہت ہی برے کام کرتے تھے۔'' مثلاً اللہ کی نافرمانی، سرکشی، بری بات کرنا اور ایک دوسرے کو برائی سے نہ روکنا۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے: (فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا [فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۔ ]البقرة / ٢٤ )" تو اگر تم نہ کر سکو اور ہم کہے دیتے ہیں کہ تم ہرگز نہ کر سکو گے یعنی اگر قرآن جیسی کوئی سورہ نہ لا سکو تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں۔''

[۵] کسی شی کے انجام پر تنبیہ، جیسے: ( تَبَّتْ يَدَا اَبِىْ لَهَبٍ ۔ المسد/۱[۱]) کا مطلب

[۱] تباہ ہو جائیں ابولہب کے دونوں ہاتھ۔

ہے"ابولہب جہنمی ہے جس کا انجام بے دھویں کا آگ کا شعلہ ہے" کیوں کہ ابو لہب کا معنی ہے "آگ کے شعلے والا" اور ظاہر ہے کہ یہ صفت جہنمی کی ہے۔ اور جیسے ارشاد باری تعالیٰ (حَمَّالَةَ الْحَطَبِ، فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ ۰ المسد/ ٤، ٥[۱]) کا مطلب ہے "اس کی بیوی بہت چغل خور ہے جس کا انجام یہ ہوگا کہ وہ جہنم کا ایندھن بنے گی اور اس کی گردن میں طوق پڑا ہوگا۔

**تعریض**: کنایہ سے قریب ہے اور دونوں کے درمیان فرق دقیق اور دشوار ہے۔ امام سیوطی نے فرمایا: علما نے کنایہ اور تعریض کے درمیان فرق کے بیان میں جو عبارتیں لکھی ہیں وہ باہم قریب قریب ہیں۔

زمخشری نے کہا: کنایہ: شی کو ایسے لفظ سے ذکر کرنا جس کے لیے وہ لفظ موضوع نہ ہو۔ اور تعریض: ایسی شی کا ذکر کرنا جس سے دوسری ایسی شی پر دلالت ہو جسے تم نے ذکر نہ کیا ہو۔

سکاکی نے کہا: تعریض: وہ کلام ہے جو موصوف غیر مذکور کے لیے ذکر کیا جائے۔ تعریض یہ بھی ہے کہ کسی ایک کو مخاطب کیا جائے اور مراد دوسرے کو لیا جائے۔

تعریض کی مثالیں، اللہ تعالیٰ کے قول: (وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۰ البقرۃ/ ۲۵۳) میں "بعضھم" سے بطور تعریض محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مراد ہیں اور اس کا سبب حضور کی قدر و منزلت اور رفعت و بلندی کا اظہار ہے۔ یعنی "درجوں بلند کیا جانا" ایسا وصف ہے جس کا مصداق ان کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا، اس لیے نام لیے بغیر بھی وہ متعین ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ: (وَمَالِيَ لَا اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۰ یٰس / ۲۲[۲]) میں تعریض کے طور پر "وَمَالَكُمْ لَا تَعْبُدُوْنَ" مراد ہے (تم کیوں نہ اس کی عبادت کرو جس نے تمھیں پیدا کیا) دلیل اللہ تعالیٰ کا قول: "وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ" ہے۔ "اور تم لوگ اسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔" اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قول: (ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖ اٰلِهَةً ۰ یٰس/ ۲۳) میں بھی بطور تعریض "اَتَتَّخِذُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ اٰلِهَةً" [۳] مراد ہے۔

صاف اور صریح بات یہ تھی کہ جن اصنام کو تم نے معبود بنا رکھا ہے یہ رب کے عذاب سے تمھیں نہیں بچا سکتے بلکہ یہ تمھارے جہنم رسید ہونے کا سبب بنیں گے۔ لیکن اس طرح خطاب سے لوگ غضب ناک ہو جاتے اور کلمۂ حق سننے کے لیے تیار نہ ہوتے۔ اس لیے مناسب ہوا کہ حق بات اس طرح سنائی جائے کہ وہ سننے، غور کرنے اور ماننے کی جانب مائل ہوں تو دعوت حق یوں پیش کی: "کیا

---

[۱] پوری عبارت یوں ہے: سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ،وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ، فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ: اب دھنستا ہے لپٹ مارتی آگ میں وہ اور اس کی جورو لکڑیوں کا گٹھا سر پر اٹھاتی، اس کے گلے میں کھجور کی چھال کا رسّا۔ [۲] میں کیوں نہ اس کی عبادت کروں جس نے مجھے پیدا کیا۔ [۳] کیا تم لوگ اس کے سوا اور خداؤں کو مانو گے۔

میں خدا کو چھوڑ کر ایسے معبودوں کو اختیار کروں گا کہ اگر رحمٰن مجھے کوئی تکلیف دینا چاہے تو ان کی سفارش میرے کام نہ آئے، نہ یہ مجھے اس کے عذاب سے نجات دے سکیں''[۱] ساری بات اپنے بارے میں بیان کی اور مقصد قوم کو ہدایت وتنبیہ ہے مگر یہ ایسا انداز ہے جو قوم کو غضب کے بجائے توجہ اور غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ کیوں کہ اس سے یہ اظہار ہوتا ہے کہ داعی اپنے لیے جس چیز کو باعث ہلاکت جانتا ہے اسی سے قوم کو بچانا چاہتا ہے۔

ارشاد خداوندی: (لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ. الزمر/ ٦٥[٢]) میں خطاب تو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ہے مگر اس سے غیر نبی مراد ہیں کیوں کہ شرعاً نبی سے شرک محال ہے۔

## خبر وانشا

ماہرین علم نحو وغیرہم اور تمام اہل بیان کا مذہب یہ ہے کہ کلام انھیں دو قسموں میں منحصر ہوتا ہے اور اس کی کوئی تیسری قسم نہیں ہوتی۔

خبر: وہ ہے جس میں صدق وکذب دونوں کا احتمال ہو، یا جس کی تصدیق وتکذیب ہو سکے۔

انشا: وہ ہے جو ایسا نہ ہو یعنی جس میں صدق وکذب کا احتمال نہ ہو یا جو قابل تصدیق وتکذیب نہ ہو۔

خبر کا مقصد مخاطب کو فائدہ پہنچانا ہوتا ہے۔

کبھی خبر امر کے معنی میں آتی ہے، جیسے: (وَالْوٰلِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ. البقرة/ ٢٣٣[٣]) اور (وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ. البقرة/ ٢٢٨[٤]) ان دونوں مثالوں میں يرضعن اور يتربصن خبر ہیں مگر امر لِيُرْضِعْنَ اور لِيَتَرَبَّصْنَ کے معنی میں ہیں۔

کبھی نہی کے معنی میں آتی ہے، جیسے: (لَا يَمَسُّهٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ. الواقعة/ ٧٩) میں لايمسه مضارع منفی، خبر ہے لیکن یہاں نہی یعنی لا يَمَسَّه کے معنی میں ہے۔ ''اس (قرآن) کو نہ چھوئیں مگر پاک لوگ''

کبھی دعا کے معنی میں آتی ہے، جیسے: (وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ. الفاتحة/٥[٥]) میں نستعين خبر ہے مگر اَعِنَّا (ہماری مدد فرما) کے معنی میں ہے جو دعا کے لیے ہے۔

کبھی دعاے ضرر (دعاے بد) کے معنی میں آتی ہے، جیسے: (تَبَّتْ يَدَا اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ. سورة الهب/١) میں تبت خبر ہے جو یہاں بد دعا کے لیے مستعمل ہے اسی لیے معنی ہے: ''تباہ

---

[۱] اصل آیت کریمہ اس طرح ہے: ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّىْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّ لَا يُنْقِذُوْنِ.

[۲] میری عزت وجلال کی قسم اگر تو شرک کرے گا تو تیرا عمل ضرور اکارت ہو جائے گا۔ [۳] اور مائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔

[۴] اور طلاق والی عورتیں اپنے آپ کو تین حیضوں تک روکے رہیں۔ [۵] اور ہم تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں۔

ہو جائیں ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ تباہ ہو ہی گیا۔'' اسی طرح: ( غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۔ المائدۃ/٦٤) میں غلت خبر ہے جو بددعا کے آئی ہے۔ معنی ہے ''ان (یہودیوں) کے ہاتھ باندھے جائیں اور ان پر اس کہنے سے لعنت ہے۔''

کچھ لوگوں نے ( حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ ۔ النساء/٩٠) کو بھی اسی قبیل سے قرار دیا ہے۔ چناں چہ انھوں نے کہا: یہ ان پر اس بات کی بددعا ہے کہ وہ اُحُد کی جنگ سے تنگ دل اور اس سے عاجز و درماندہ رہیں۔

## فصل

انشا کی ایک قسم استفہام ہے۔ استفہام کا لغوی معنی طلبِ فہم ہے۔ لیکن یہاں استفہام: ''کسی بات یا چیز کے بارے میں دریافت کرنے'' کے معنی میں ہے۔ اس کے ادوات یہ ہیں: همزہ، هَلْ، مَا، مَنْ، اَیٌّ، کَمْ، کَیْفَ، اَیْنَ، اَنّٰی، مَتٰی، اَیَّانَ۔

### استفہام متعدد معانی کے لیے آتا ہے

[۱] انکار: اس میں استفہام کا معنی نفی ہوتا ہے اور اس کا مابعد منفی ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کے ساتھ اِلَّا آتا ہے، جیسے یہ ارشاد ربانی: ( فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ۔ الاحقاف/٣٥) ''ہلاک نہیں کیے جائیں گے مگر نافرمان'' ( وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ۔ سبأ/١٧) ''اور ہم سزا نہیں دیتے مگر ناشکرے کو۔''

اسی لیے اللہ تعالیٰ کے قول: ( فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۔ الروم/٢٩) میں جملۂ منفی '' وما لهم من نّصِرين ''کا مَن استفہامیہ پر عطف کیا گیا ہے۔ معنی ہے: ''نہ انھیں کوئی ہدایت دے سکتا ہے جنھیں اللہ گمراہ کردے اور نہ ان کا کوئی حامی و مددگار ہوسکتا ہے۔'' (اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ۔ الشعراء/ ١١١) ''ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے جب کہ تمھارے ساتھ کمینے ہیں۔'' (اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا ۔ المؤمنون/٤٧) ''(بنی اسرائیل) بولے ہم اپنے جیسے دو آدمیوں (موسیٰ و ہارون) پر ایمان نہیں لائیں گے۔'' (اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ ۔ الطور/٣٩) ''یہ نہیں ہوسکتا کہ اس کو بیٹیاں اور تم کو بیٹے ہوں۔''، (اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۔ النجم/ ٢١) ''یہ نہیں ہوسکتا کہ تم کو بیٹا اور اس کو بیٹی ہو۔'' (اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ۔ الزخرف/ ١٩) ''ان کو پیدا کرتے وقت وہ حاضر نہ تھے۔''

ایسا بہت ہوتا ہے کہ استفہام کے ساتھ تکذیب (جھوٹ قرار دینے) کا مفہوم بھی موجود ہوتا ہے اور ماضی میں '' لم یکن '' اور مستقبل میں '' لا یکون '' کے معنی میں ہوتا ہے، جیسے: (اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ۔ الاسراء/ ٤٠) ''ایسا نہیں ہوا کہ تمھارے رب نے تم

کو بیٹے چن دیے اور اپنے لیے فرشتوں سے بیٹیاں بنائیں۔" (اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ . ہود/ ۲۸) "ایسا نہیں ہوگا کہ ہم اسے (حجت کو) تمھارے گلے چپیٹ دیں حالاں کہ تم بیزار ہو۔"

[۲] توبیخ، اسے تقریع بھی کہا جاتا ہے۔ جیسے: (اَفَعَصَيْتَ اَمْرِىْ . طٰه/ ) "کیا تو نے میرا حکم نہ مانا۔" (اَتَعْبُدُوْنَ مَاتَنْحِتُوْنَ . الصافات/۹۵) "کیا اپنے ہاتھ کے تراشوں کو پوجتے ہو۔" (اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخٰلِقِيْنَ . الصافات/۱۲۵) "کیا بعل کو پوجتے ہو اور چھوڑتے ہو سب سے اچھے پیدا کرنے والے اللہ کو۔"

توبیخ زیادہ تر کسی ثابت شدہ امر میں واقع ہوتی ہے۔ یعنی کوئی کام کسی سے واقع ہوا، اس پر اسے توبیخ کی گئی جیسے سابقہ مثالیں۔

توبیخ کبھی کسی ایسے کام کو چھوڑ دینے پر بھی ہوتی ہے جسے کرنا چاہیے تھا، جیسے یہ مثالیں: (اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ . فاطر/۳۷) "اور کیا ہم نے تمھیں وہ عمر نہ دی تھی جس میں سمجھ لیتا جسے سمجھنا ہوتا۔" (اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا . النساء۸ ۹۷) "کیا اللہ کی زمین کشادہ نہیں تھی کہ اس میں ہجرت کر جاتے۔"

[۳] تقریر: مخاطب کو کسی ایسے امر کے اقرار و اعتراف پر برانگیختہ کرنا جو اس کے نزدیک یقینی طور پر ثابت شدہ ہو۔

تقریر کے ساتھ کلام، مُوْجَب یعنی مثبت ہوتا ہے اسی لیے اس پر صریح موجب اور اس کا صریح موجَب پر عطف کیا جاتا ہے۔

اول کی چند مثالیں: (اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ، وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ . الشرح/۱) "کیا ہم نے تمھارے لیے تمھارا سینہ کشادہ نہ کر دیا اور تم سے تمھارا بوجھ اتار دیا" یعنی ہم نے تمھارا سینہ کشادہ کر دیا۔ (اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ، وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى . الضحیٰ/۶) "کیا اس (اللہ) نے تمھیں (اے نبی) یتیم نہ پایا پھر جگہ دی اور تمھیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی یعنی اس نے تمھیں یتیم پایا۔ (اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِىْ تَضْلِيْلٍ ، وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ . الفیل/ ۲، ۳) "کیا ان کا داؤں تباہی میں نہ ڈالا اور ان پر پرندوں کی ٹکڑیاں بھیجیں یعنی اللہ نے ان کا داؤں تباہی میں ڈالا۔"

دوم کی مثال: (اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِىْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا . النمل/۸۴) "اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تم نے میری آیتیں جھٹلائیں حالاں کہ تمھیں ان کا پورا یقین تھا۔"

جرجانی نے اس آیت کریمہ کو (وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا . النمل/۱۴ [۱])

---

[۱] اور ظلم اور تکبر سے ان (آیتوں) کے منکر ہوئے حالاں کہ ان کے دلوں میں ان کا یقین تھا۔

کی طرح قرار دیا ہے اس لیے یہ مثال [اَکَذَّبْتُمْ ،الخ] ان کی اسی تقریر و تحقیق پر مبنی ہے۔

استفہام تقریری کی حقیقت انکار نفی ہے۔ نفی صراحۃً مذکور ہے، اس پر استفہام برائے انکار آیا تو نفی کی نفی ہوئی اور نفی کی نفی اثبات ہوتی ہے اس طرح اس استفہام سے تقریر و اثبات کا معنی حاصل ہوتا ہے۔

## ایسے استفہام تقریری کی مثالیں:

(اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ ۔ الزمر/۳۶) " کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے یعنی کافی ہے۔" (اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ۔ الاعراف/۱۷۲) " کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں یعنی میں تمھارا رب ہوں۔"

زمخشری کے نزدیک آیت کریمہ (اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۔ البقرۃ/ ۱۰۶) بھی استفہام تقریری کی مثال ہے۔ " کیا تجھے علم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت والا ہے" یعنی تجھے علم ہے۔

[۴] تعجب یا تعجیب (تعجب میں ڈالنا)، جیسے: (کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ ۔ البقرۃ /۲۸) "بھلا کیوں کر تم خدا کے منکر ہو گے۔" (مَالِیَ لَا اَرَی الْھُدْ ھُدَ ۔ النمل / ۲۰) حضرت سلیمان نے پرندوں کا جائزہ لینے پر جب ہد ہد کو نہ دیکھا تو تعجب سے کہا: " مجھے کیا ہوا کہ میں ہد ہد کو نہیں دیکھتا۔"

اللہ تعالیٰ کے قول: (اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ ۔ البقرۃ/ ۴۴) میں یہ اور اس سے پہلے کی دونوں قسمیں یکجا ہیں۔ زمخشری نے کہا: ہمزہ، توبیخ اور ان کے حال سے تعجب دلانے کے ساتھ ساتھ تقریر کے لیے بھی ہے یعنی انھیں دوسروں کو نیکی کا حکم دینے کے ساتھ خود کو بھول جانے پر توبیخ بھی کی گئی، ان کی اس حالت پر تعجب بھی دلایا گیا، اور ان کی اس احمقانہ عادت کا اثبات بھی کیا گیا اور بتایا گیا کہ واقعۃً وہ دوسروں کو تو بھلائی کا حکم دیتے ہیں مگر خود کو بھول جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا قول: (سَیَقُوْلُ السُّفَھَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰھُمْ عَنْ قِبْلَتِھِمُ الَّتِیْ کَانُوْا عَلَیْھَا ۔ البقرۃ/۱۴۲) تعجب اور استفہام حقیقی دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔ " عنقریب لوگوں میں سے جہلا کہیں گے کہ ان مسلمانوں اور ان کے نبی کو کس بات نے ان کے اس قبلہ سے پھیر دیا جس کی طرف نماز میں وہ رخ کیا کرتے تھے۔"

[۵] عتاب، جیسے ارشاد خداوندی: (اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ ۔ الحدید/۱۶) " کیا ایمان والوں کو ابھی وہ وقت نہ آیا کہ ان کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد کے لیے۔"

لطیف ترین عتاب وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے خیر خلق محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خطاب کیا ہے۔ فرماتا ہے: (عَفَا اللّٰہُ عَنْکَ ، لِمَ اَذِنْتَ لَھُمْ ۔ التوبۃ/۴۳) "اللہ نے تمھیں معاف کر دیا، تم نے انھیں اجازت کیوں دی۔"

[٦] تذکیر (یاددہانی): (اس میں ایک طرح کا اختصار بھی ہوتا ہے) جیسے ذیل کے ارشادات ربانی: (اَلَمۡ اَعۡهَدۡ اِلَيۡكُمۡ يٰبَنِىۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّيۡطٰنَ ۔ یس/٦٠) "اے اولاد آدم! کیا میں نے تم سے عہد نہ لیا تھا کہ شیطان کو نہ پوجنا۔" (اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۔ البقرۃ/٣٣) "کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی ڈھکی چھپی تمام چیزوں کو جانتا ہوں۔" (هَلۡ عَلِمۡتُمۡ مَّا فَعَلۡتُمۡ بِيُوۡسُفَ وَاَخِيۡهِ ۔ یوسف/ ٨٩) "کچھ خبر ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا۔"

[٧] فخر کرنا، جیسے: (اَلَيۡسَ لِىۡ مُلۡكُ مِصۡرَ ۔ الزخرف/٥١) فرعون نے کہا: "کیا میرے پاس مصر کی بادشاہت نہیں ہے۔" یہ بات اس نے بطور فخر ومباہات کہی تھی۔

[٨] تفخیم اور عظمت دکھانا، جیسے: (مَالِ هٰذَا الۡكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيۡرَةً وَّلَا كَبِيۡرَةً اِلَّاۤ اَحۡصٰٮهَا ۔ الکہف/ ٤٩) "اس نوشتہ کو کیا ہوا، نہ اس نے کوئی چھوٹا گناہ چھوڑا نہ بڑا"، یعنی یہ اتنی عظیم اور بڑی کتاب ہے کہ اس میں تمام انسانوں کے چھوٹے بڑے سارے گناہ درج ہیں۔

[٩] تہویل اور ڈرانا، جیسے: (اَلۡحَآقَّةُ ، مَا الۡحَآقَّةُ ۔ الحاقۃ/١، ٢) "وہ (قیامت) حق ہونے والی، کیسی [ہوگی] وہ حق ہونے والی" اس مثال میں "الحاقۃ" قیامت کی ہولناکی کو بیان کرنے اور اس سے ڈرانے کے لیے ہے۔" (اَلۡقَارِعَةُ مَا الۡقَارِعَةُ ۔ القارعۃ/١، ٢) "دل دہلانے والی، کیا [ہوگی] وہ دل دہلانے والی۔" یعنی قیامت اتنی خوفناک ہوگی کہ اس سے دل دہل اٹھیں گے۔

[١٠] برعکس تخویف یعنی آسان اور ہلکا دکھانا، جیسے: (وَمَاذَا عَلَيۡهِمۡ لَوۡ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ۔ النساء/٣٩) "انھیں کیا سختی پیش آتی اگر وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لے آتے"، یعنی یہ تو بہت آسان ہے۔

[١١] تہدید اور وعید (برے انجام کی دھمکی دینا)، جیسے: (اَلَمۡ نُهۡلِكِ الۡاَوَّلِيۡنَ ۔ المرسلات/١٦) "کیا ہم نے اگلے زمانہ والوں کو ہلاک نہیں کیا۔"

[١٢] تسویہ: یہ ایسے استفہام میں ہوتا ہے جو ایسے جملے پر داخل ہو جس کی جگہ مصدر کا آنا صحیح ہو، جیسے: (سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ۔ البقرۃ/٦) "ان کے لیے برابر ہے آیا تم انھیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔"

[١٣] امر، جیسے: (ءَاَسۡلَمۡتُمۡ ۔ آل عمران/ ٢٠) "کیا تم اسلام لائے"، یعنی اسلام لاؤ۔ (فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّنۡتَهُوۡنَ ۔ المائدۃ/ ٩١) "کیا تم باز آنے والے ہو"، یعنی باز آجاؤ۔ (اَتَصۡبِرُوۡنَ ۔ الفرقان/٢٠) "کیا تم صبر کرو گے"، یعنی صبر کرو۔

[۱۴] تنبیہ (یہ امر کی ایک قسم ہے)، جیسے: (اَلَمۡ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَيۡفَ مَدَّ الظِّلَّ ۔ الفرقان/۴۵) "کیا تم نے اپنے رب کو نہ دیکھا کہ اس نے سایہ کو کیسا دراز کیا" یعنی دیکھو تمھارے رب نے سایہ کیسا پھیلایا ہے۔

[۱۵] ترغیب، جیسے: (مَنۡ ذَاالَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا ۔ البقرة/۲۴۵، الحدید/۱۱) "ہے کوئی جو اللہ کو قرض حسن دے۔" (هَلۡ اَدُلُّكُمۡ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنۡجِیۡكُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ۔ الصف/۱۰) "کیا میں بتادوں وہ تجارت جو تمھیں دردناک عذاب سے بچالے۔"

[۱۶] نہی، جیسے: (اَتَخۡشَوۡنَهُمۡ فَا للّٰهُ اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشَوۡهُ ۔ التوبة/ ۱۳) "کیا ان سے ڈرتے ہو تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو" یعنی ان سے مت ڈرو۔ دلیل اللہ تعالیٰ کا قول: (فَلَا تَخۡشَوُا النَّاسَ وَ اخۡشَوۡنِ ۔ المائدة/۴۴) ہے۔ "تو لوگوں سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔" (وَمَاغَرَّكَ بِرَبِّكَ الۡكَرِیۡمِ ۔ الانفطار /۶) "اور تجھے کس چیز نے فریب دیا اپنے کرم والے رب سے یعنی فریب خوردہ مت ہو۔"

[۱۷] دعا: یہ بھی نہی کے مانند ہے لیکن دعا فروتر کی برتر سے ہوتی ہے، جیسے: (اَتُهۡلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا ۔ الاعراف/۱۵۵) "کیا تو ہمیں اس کام پر ہلاک فرمائے گا جو ہمارے بے عقلوں نے کیا" یعنی ہمیں ہلاک نہ فرما۔

[۱۸] استرشاد (رہنمائی طلب کرنا)، جیسے: (اَتَجۡعَلُ فِیۡهَامَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا ۔ البقرة/۳۰) "کیا ایسے کو (نائب) کرے گا جو اس (زمین) میں فساد پھیلائے گا" یعنی اس سلسلے میں ہم تیری ہدایت ورہنمائی چاہتے ہیں کیوں کہ تیرے بتائے بغیر آدم اوران کی اولاد کی نیابت کی حکمت ہمیں سمجھ میں نہیں آسکتی۔

ادوات استفہام مذکورہ بالا معانی کے علاوہ اور بھی معانی کے لیے آتے ہیں۔

## فصل

انشا کی ایک قسم "امر" ہے۔

امر: ایسے فعل کی طلب کو کہتے ہیں جو کف یعنی ترک نہ ہو۔

اس کے صیغے اِفۡعَلۡ اور لِیَفۡعَلۡ، ہیں۔ یہ ایجاب میں حقیقت ہیں، جیسے: (وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوةَ ۔ البقرة/۴۳) "نماز قائم کرو" یعنی اقامت نماز تم پر واجب یعنی فرض ہے۔ (فَلۡيُصَلُّوۡا مَعَكَ ۔ النساء/۱۰۲) "تو وہ تمھارے ساتھ نماز پڑھیں" یعنی ان پر تمھارے ساتھ نماز پڑھنا واجب یعنی فرض ہے۔

امر مجازاً دوسرے چند معانی کے لیے بھی آتا ہے:

[۱] ندب، جیسے: ( وَاِذَاقَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۔ النحل/۹۸) "جب قرآن پڑھو تو مردود شیطان سے خدا کی پناہ لو۔" مردود شیطان سے ابتدائے قراءت کے وقت استعاذہ مندوب ہے۔

[۲] اباحت، جیسے: (وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّامَلَكَتْ اَيْمٰنُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ ۔ النور/۳۳) "اور تمھارے ہاتھ کی مِلک باندیوں اور غلاموں میں سے جو یہ چاہیں کہ کچھ مال کمانے کی شرط پر انھیں آزادی لکھ دو تو لکھ دو" یعنی آزادی لکھ دینا مباح ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تصریح فرمائی کہ یہاں صیغۂ امر "کاتبوا" اباحت کے لیے ہے۔ اور جیسے: ( وَاِذَاحَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ۔ المائدۃ/ ۲) "اور جب احرام سے نکلو تو شکار کرو" یعنی شکار کرنا مباح ہے۔

[۳] پست کی بلند وبالا سے دعا کرنا، جیسے: (رَبِّ اغْفِرْ لِيْ ۔ الاعراف / ۱۵۱، ص/۳۵) "اے میرے رب مجھے بخش دے۔"

[۴] تہدید (دھمکی)، جیسے: (اِعْمَلُوْا مَاشِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَاتَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۔ حٰم السجدۃ/ ۴۰) "جو جی میں آئے کرو، بیشک وہ تمھارے تمام اعمال سے آگاہ ہے۔" کیوں کہ اس مثال میں یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ کفار الحاد پرست جو چاہیں کریں ان پر کسی بھی کام میں کوئی پابندی اور روک نہیں ہے۔

[۵] اہانت، جیسے: (ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ۔ الدخان/ ۴۹) (کھولتے پانی کا عذاب) "چکھ، ہاں ہاں تو ہی بڑا عزت والا کرم والا ہے۔"

"ملائکہ یہ کلمہ، اہانت وتذلیل کے لیے کہیں گے، کیوں کہ ابوجہل کہا کرتا تھا کہ بطحا میں، میں بڑا عزت والا کرم والا ہوں، اس کو عذاب کے وقت یہ طعنہ دیا جائے گا۔ (خزائن العرفان)

[۶] تسخیر یعنی تذلیل، جیسے: (كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ۔ البقرۃ/ ۶۵، الاعراف/۱۶۶) "بندر ہو جاؤ دتکارے ہوئے۔"

شہر ایلہ کے بنی اسرائیل کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل کرنے کی تعبیر اس لفظ سے انھیں ذلیل کرنے کے لیے ہے۔ یوں تسخیر اہانت سے اخص ہوتی ہے۔

[۷] تعجیز، جیسے: ( فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۔ البقرۃ/۲۳) "تو اس نازل ہونے والے قرآن جیسی ایک سورہ ہی لے آؤ۔" کیوں کہ اس سے مراد کتاب الٰہی کے مُنَزَّلٌ مِنَ اللہ ہونے میں شک کرنے والوں سے قرآن جیسی کوئی سورہ بنانے کا مطالبہ نہیں ہے بلکہ ان کے عجز و درماندگی کا اظہار ہے۔

[۸] امتنان؛ (احسان جتانا)، جیسے: (وَهُوَ الَّذِیٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُکُلُهٗ وَالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ، کُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ ۔ الانعام/ ۱۴۲)"اور وہی ہے جس نے پیدا کیے کچھ زمین پر چھپے ہوئے (یعنی ٹٹیوں پر قائم کیے ہوئے مثل انگور وغیرہ کے) اور کچھ بے چھپے اور کھجور اور کھیتی جس میں رنگ رنگ کے کھانے (یعنی رنگ اور مزے اور مقدار اور خوشبو میں باہم مختلف) اور زیتون اور انار کسی بات میں ملتے (مثلاً رنگ میں یا پتوں میں) اور کسی میں الگ (مثلاً ذائقہ اور تاثیر میں) کھاؤ اس کا پھل جب پھل لائے (کنز الایمان مع خزائن العرفان) اس آیت کریمہ میں " کلوا من ثمرہ " امتنان کے لیے ہے۔

[۹] تعجب دلانا، جیسے: (اُنْظُرْ کَیْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ ۔ الاسراء/ ۴۸)" دیکھو! انھوں نے تمھیں کیسی تشبیہیں دیں"، یعنی ایسی تشبیہیں تعجب خیز ہیں۔

[۱۰] تسویہ، جیسے: (فَاصْبِرُوْا اَوْ لَاتَصْبِرُوْا ۔ الطور/ ۱۶)" تو صبر کرو یا نہ کرو"، یعنی صبر کرنا اور نہ کرنا دونوں تمھارے لیے برابر ہیں کیوں کہ آتش جہنم سے تمھیں کبھی بھی کسی صورت میں بھی چھٹکارا نہیں ملے گا۔

[۱۱] ارشاد، جیسے: (وَاَشْهِدُوْا اِذَاتَبَایَعْتُمْ ۔ البقرۃ/ ۲۸۲) "اور جب خرید وفروخت کروتو گواہ کرلو۔"

[۱۲] احتقار، (حقیر سمجھنا)، جیسے: (اَلْقُوْا مَآاَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۔ یونس/ ۸۰) جب جادوگر آئے (تو) ان سے حضرت موسیٰ نے کہا: "ڈالو جو تمھیں ڈالنا ہے۔" یعنی اپنے رسّے اور شہتیر وغیرہ زمین پر ڈالو اور جو جادو تمھیں کرنا ہو کرو، یہ میرے نزدیک نہایت حقیر اور معمولی چیزیں ہیں۔

[۱۳] انذار، جیسے: (قُلْ تَمَتَّعُوْافَاِنَّ مَصِیْرَکُمْ اِلَی النَّارِ ۔ ابراھیم/ ۳۰)" تم فرماؤ! الوہیت میں بتوں کو شریک کرنے والو (دنیا میں کچھ) برت لو اس لیے کہ تمھارا انجام کار جہنم ہے۔"

[۱۴] اکرام، جیسے: (اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ۔ الحجر/) "جنت میں داخل ہو سلامتی کے ساتھ۔"

[۱۵] انعام یعنی نعمت کی یاد دہانی، جیسے: (کُلُوْا مِمَّارَزَقَکُمُ اللّٰهُ ۔ الانعام/ ۱۴۲) "اللہ کی دی ہوئی روزی میں سے کھاؤ۔"

[۱۶] تکذیب (جھوٹ کو ظاہر کرنا)، جیسے: (قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآاِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۔ اٰل عمران/ ۹۳) "تم فرماؤ! (اے یہودیو!) توریت لاکر اسے پڑھو اگر تم سچے ہو۔" لیکن وہ توریت لانے کی ہمت نہ کرسکے یوں ان کا یہ جھوٹ آشکارا ہوگیا کہ حضرت ابراہیم اونٹ کا گوشت اور دودھ نہیں کھاتے پیتے تھے۔ (قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَ کُمُ الَّذِیْنَ یَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۔ الانعام/

۱۵۱) "تم فرماؤ! لاؤ اپنے وہ گواہ جو گواہی دیں کہ اللہ نے اِسے حرام کیا۔"

کفار نے چوپایوں کی چند قسمیں حرام کر رکھی تھیں اور ان کی حرمت کی نسبت وہ اللہ کی طرف کرتے تھے اس پر ان سے گواہ طلب کیے گئے لیکن وہ انھیں پیش نہ کر سکے یوں ان کا دعوی جھوٹا اور بے بنیاد ثابت ہوا۔

[۱۷] مشورہ، جیسے: (فَانْظُرْ مَا ذَا تَرٰی. الصافات/۱۰۲) "اب تو دیکھ تیری کیا رائے ہے۔" یہاں حضرت ابراہیم، اپنے فرزند ارجمند حضرت اسمٰعیل کو مشورہ دے رہے ہیں کہ اپنے ذبح کیے جانے کے متعلق غور کرلو کہ تمھاری کیا رائے ہونی چاہیے۔

[۱۸] اعتبار (عبرت حاصل کرنا)، جیسے: (اُنْظُرُوْا اِلٰی ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ. الانعام/ ۱۰۰) "اس کا پھل دیکھو جب پھلے۔"

## فصل

انشا کی دوسری قسم نہی ہے:

نہی: کسی فعل سے باز رہنے کی طلب کرنا۔

اس کا صیغہ لا تَفعلْ ہے جو تحریم میں حقیقت ہے۔ اور مجازاً چند معانی کے لیے آتا ہے:

[۱] کراہت، جیسے: (وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا. الاسراء/۳۷، لقمان /۱۸) "اور زمین پر تکبر و خودنمائی سے اتراتا ہوا مت چل۔"

[۲] دعا، جیسے: (رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا. ال عمران/۸) "اے ہمارے رب! نعمت ہدایت سے سرفراز کرنے کے بعد ہمارے دل ٹیڑھے مت کر۔"

[۳] ارشاد، جیسے: (لَا تَسْئَلُوا عَنْ اَشْیَاۤءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ. المائدۃ/ ۱۰۱) "اے ایمان والو! ایسی باتیں نہ پوچھو جو تم پر ظاہر کی جائیں تو تمھیں بری لگیں۔"

[۴] تسویہ، جیسے: (اِصْبِرُوْا اَوْلَا تَصْبِرُوْا. الطور/ ۱۶) "تم صبر کرو یا صبر نہ کرو [تمھارے لیے دونوں یکساں ہیں]

[۵] احتقار اور تقلیل (قلیل دکھانا)، جیسے: (لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ. الحجر/۸۸، طٰہ/۱۳۱) "اپنی آنکھ اٹھا کر اس چیز کو نہ دیکھو جو ہم نے ان کے کچھ جوڑوں کو برتنے دی"، یعنی وہ بہت حقیر اور قلیل ہے اس لائق نہیں کہ آنکھ اٹھا کر اسے دیکھا جائے۔

[۶] بیانِ عاقبت و جزاے خیر، جیسے: (وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَاۤءٌ. ال عمران/۱۶۹) "اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کو ہرگز مردہ مت گمان کرو بلکہ وہ زندہ

ہیں''یعنی جہاد کا انجامِ خیر زندگی ہے موت نہیں۔

[۷] یاس و نا امیدی، جیسے: (لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمٰنِكُمْ ۔ التوبة /٦٦، ٩٤، التحریم/٧)''بہانے نہ بناؤ تم ایمان لانے کے بعد مرتکب کفر ہو گئے''یعنی تمھارے بہانے قبول نہیں کیے جائیں گے، تم اس سے مایوس اور نا امید ہو جاؤ۔

[۸] اہانت، جیسے :(اِخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ۔ المؤمنون/١٠٨) رب فرمائے گا: ''دھتکارے پڑے رہو اس (جہنم) میں اور مجھ سے بات نہ کرو۔''

## فواتح سور

اللہ تعالیٰ نے قرآن کی سورتیں دس قسم کے کلام سے شروع فرمائی ہیں جن سے کوئی سورہ خارج نہیں۔

## نوع اول: اللہ کی ثنا

حمد پانچ سورتوں میں ① فاتحہ، سورہ نمبر ا ② انعام، س ٦۔ ③ کہف، س ۱۸ ④ سبا، س ۳۴ ⑤ فاطر، س ۳۵۔

تبارك دو سورتوں میں: ① فرقان، س ۲۵ ② ملک، س ٦٧

تسبیح سات سورتوں میں: ① جمعہ س ٦٢ ② تغابن، س ٦٤ ③ حدید، س ۵۷ ④ حشر، س ۵۹ ⑤ صف، س ٦١ ⑥ اعلیٰ، س ۸۷ ⑦ اسراء، س ۱۷

نوع دوم: حروف تہجی انتیس سورتوں میں:

الر پانچ سورتوں میں: ① یونس، س ۱۰ ② ہود، س ۱۱ ③ یوسف، س ۱۲ ④ ابراہیم، س ۱۴ ⑤ حجر، س ۱۵

الم چھ سورتوں میں: ① بقرہ، س ۲ ② آل عمران، س ۳ ③ عنکبوت، س ۲۹ ⑤ روم، س ۳۰ ⑥ لقمان، س ۳۱ ⑦ سجدہ، س ۳۲۔

المر رعد، س ۱۳ میں۔

المص اعراف، س ۷ میں۔

حم سات سورتوں میں: ① مومن، س ۴۰ ② حم السجدہ، س ۴۱ ③ شوریٰ، س ۴۲ ④ زخرف، س ۴۳ ⑤ دخان، س ۴۴ ⑥ جاثیہ، س ۴۵ ⑦ احقاف، س ۴٦۔

ص ص، س ۳۸ میں۔

طس نمل، س ۲۷ میں۔

طسم دوسورتوں میں: ① شعرا،س ۲۶ ② قصص،س ۲۸۔

طٰہ طٰہ،س۲۰ میں۔

قٓ ق،س۵۰ میں

ن قلم،س۶۸ میں

کھیعص مریم،س۱۹ میں۔

یٰس یٰس،س۳۶ میں۔

**نوع سوم: ندا** ۔پانچ سورتوں میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ندا: ①احزاب،س۳۳ ②طلاق،س۶۵ ③ تحریم،س۶۶ ④مزمل،س۷۳ ⑤مدثر،س۷۴ ۔پانچ سورتوں میں امت کو ندا: ①نساء،س۴ ②مائدہ،س۵ ③حج،س۲۲ ④حجرات،س۴۹ ⑤ممتحنہ،س۶۰ ۔

نوع چہارم: خبری جملے تیئیس سورتوں میں: ①انفال،س۸ ②توبہ،س۹ ③ نحل،س۱۶ ④انبیا،۲۱ ⑤مومنون،س۲۳ ⑥نور،س۲۴ ⑦زُمَر،س۳۹ ⑧محمد،س۴۷ ⑨فتح،س۴۸ ⑩قمر،س۵۴ ⑪رحمٰن،س۵۵ ⑫مجادلہ،س۵۸ ⑬حاقہ،س۶۹ ⑭معارج،س۷۰ ⑮نوح،س۷۱ ⑯قیامہ،س۷۵ ⑰بلد،س ۹۰ ⑱عبس،س۸۰ ⑲قدر،س۹۷ ⑳بَیِّنہ،س۹۸ ㉑ قارعہ،س۱۰۱ ㉒تکاثر،س۱۰۲ ㉓ کوثر،۱۰۸

نوع پنجم: پندرہ سورتوں میں قسم۔

[۱] صافات،س ۳۷ میں فرشتوں کی،[۲،۳] بروج،س ۸۵اور طارق،س۸۶ میں افلاک یعنی آسمانوں کی اور چھ سورتوں میں افلاک کے لوازم کی قسم ہے۔چناں چہ [۴] نجم،س۵۳ میں ثریا کی[۵] فجر،س۸۹ میں دن کے ابتدا کی[۶] شمس،س۹۱ میں دن کی نشانی کی[۷] لیل،س۹۲ میں زمانے کے ایک جز کی[۸] ضحیٰ،س۹۳ میں دن کے ایک حصے کی[۹] اورعصر،س۱۰۳ میں دن کے آخری حصے کی یا پورے زمانے کی قسم ہے۔[۱۰،۱۱] ذاریات،س۵۱ اور مرسلات،س۷۷ میں ہوا کی قسم ہے جو چاروں عناصر میں سے ایک ہے، (۱۲) طور،س۵۲ میں خاک کی قسم ہے جو خود بھی انھیں عناصر میں سے ایک ہے۔[۱۳] تین،س۹۵ میں نبات (درخت) کی [۱۴] نازعات،س۷۹ میں حیوان ناطق کی[۱۵] اورعادیات،س۱۰۰ میں چوپایوں یعنی گھوڑوں کی قسم ہے۔

میں کہتا ہوں: اگر قیامہ،س۷۵اور بلد،س۹۰ میں آئے ہوئے "لا" کے بارے میں ہم کہیں کہ یہ صلہ ہے تو پھر دونوں سورتوں میں روز قیامت، اپنے اوپر بہت ملامت کرنے والی جان اور حضرت ابراہیم اوران کی اولاد کی قسم ہوگی۔

نوع ششم : شرط سات سورتوں میں : ① واقعہ، س ۵۶ ② منافقون، س ۶۳ ③ تکویر، س ۸۱ ④ انفطار، س ۸۲ ⑤ انشقاق، س ۸۴ ⑥ زلزال، س ۹۹ ⑦ نصر س ۱۱۰۔

نوع ہفتم: امر چھ سورتوں میں : ① جن، س ۷۲ ② علق، س ۹۶ ③ کافرون، س ۱۰۹ ④ اخلاص، س ۱۱۲ ⑤ فلق، س ۱۱۳ ⑥ ناس، س ۱۱۴۔

نوع ہشتم: استفہام چھ سورتوں میں: ① دہر، س ۷۶ ② نبأ، س ۷۸ ③ غاشیہ، س ۸۸ ④ شرح، س ۹۴ ⑤ فیل، س ۱۰۵ ⑥ ماعون، س ۱۰۷۔

نوع نہم: دعا (یعنی بد دعا) تین سورتوں میں: ① مطففین، س ۸۳ ② ہُمَزَہ، س ۱۰۴ ③ مسد، س ۱۱۱۔

نوع دہم: تعلیل قریش، س ۱۰۶ میں۔

## خواتم سور

یہ بھی حسن و جمال میں فواتح سور کی طرح ہی ہیں کیوں کہ خواتم کانوں سے ٹکرانے والے سب سے آخری کلام کا نام ہے اسی لیے بدائع اور انوکھے معانی پر مشتمل ہونے کے ساتھ سامع کو اختتام کلام سے بھی آگاہ کرتے ہیں یہاں تک کہ نفوس کو ان کے بعد کچھ اور ذکر کیے جانے کی خواہش باقی نہیں رہتی کیوں کہ یہ خواتم ادعیہ، وصایا، فرائض، تحمید و تہلیل، مواعظ اور وعد و وعید کے علاوہ اور دوسرے امور پر بھی مشتمل ہوتے ہیں۔ جیسے سورۂ فاتحہ کے خاتمے میں جملۂ مطلوب یعنی ( اِهْدِنَاالصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ: الفاتحة/٦[١]) کی تفصیل۔ کیوں کہ مطلوب اعلیٰ وہ ایمان ہے جو ان معاصی اور گناہوں سے محفوظ ہو جو غضب الٰہی اور گمرہی کا سبب ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس جملے کی تفصیل اپنے ارشاد (صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ. الفاتحة/٧[٢]) سے فرمائی۔

دعا جس پر سورۂ بقرہ کی یہ دو آیتیں مشتمل ہیں: (غُفْرَانَكَ رَبَّنَا: البقرة/ ٢٨٥) "تیری معافی ہوا ے رب ہمارے۔ اور ( رَبَّنَالَا تُؤَاخِذْنَااِنْ نَّسِيْنَااَوْ أَخْطَأْنَارَبَّنَاوَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَااِصْرًا كَمَاحَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَارَبَّنَاوَلَا تُحَمِّلْنَامَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۰وَاعْفُ عَنَّا (وقفة) وَاغْفِرْ لَنَا(وقفة)وَارْحَمْنَا(وقفة)اَنْتَ مَوْلٰنَافَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۰ البقرة/ ٢٨٦)" اے رب ہمارے ہمیں نہ پکڑ اگر ہم بھولیں یا چوکیں۔ اے رب ہمارے اور ہم پر بھاری بوجھ نہ رکھ جیسا تو نے ہم سے اگلوں پر رکھا تھا۔ اے رب ہمارے اور ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی ہمیں سہار نہ ہو اور ہمیں معاف فرما دے اور بخش دے اور ہم پر مہر کر۔ تو ہمارا مولیٰ ہے تو کافروں پر ہمیں مدد دے۔"

[۱] ہمیں سیدھا راستہ چلا۔ [۲] ان لوگوں کا راستہ چلا جن پر تو نے انعام کیا۔

وصایا جن پر سورۂ آل عمران کا اختتام ہوا۔ ارشاد ہوا (یٰٓأَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْاوَاتَّقُوااللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۰ال عمران/۲۰۰) ''اے ایمان والوصبر کرواور صبر میں دشمنوں سے آگے رہواور سرحد پر اسلامی ملک کی نگہ بانی کرواور اللہ سے ڈرتے رہواس امید پر کہ کامیاب ہو''۔

فرائض جن پر سورۂ نساء کا اختتام ہوا۔ ارشاد ہوا (یَسْتَفْتُوْنَکَ قُلِ اللّٰہُ یُفْتِیْکُمْ فِی الْکَلٰلَۃِ ، اِنِ امْرُءٌ ھَلَکَ لَیْسَ لَہٗ وَلَدٌ وَّلَہٗٓ اُخْتٌ فَلَھَانِصْفُ مَاتَرَکَ وَھُوَ یَرِثُھَااِنْ لَّمْ یَکُنْ لَّھَاوَلَدٌ ، فَاِنْ کَانَتَا اثْنَتَیْنِ فَلَھُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَکَ ، وَاِنْ کَانُوْا اِخْوَۃً رِّجَالًا وَّنِسَاءً فَلِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ :النساء/۱۷۷) ''اے محبوب! تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں، تم فرما دو کہ اللہ تمھیں کلالہ میں فتویٰ دیتا ہے[۱]۔ اگر کسی مرد کا انتقال ہو جو بے اولاد ہے اور اس کی ایک بہن ہو تو ترکہ میں اس کی بہن کا آدھا ہے اور مرد اپنی بہن کا وارث ہوگا اگر بہن کی اولاد نہ ہو۔ پھر اگر دو بہنیں ہوں تو ترکہ میں اُن کا تہائی۔ اگر بھائی بہن ہوں مرد بھی اور عورتیں بھی تو مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر''۔

فرائض پر ختم کرنے کا حسن اس لیے بھی ہے کہ ان میں احکامِ موت کا بیان ہے جو ہر زندہ کی سب سے آخری حالت ہے اور یہ حسن اس لیے بھی ہے کہ یہ احکام سب سے آخر میں نازل کیے گئے۔

تعظیم و تجیل جس پر سورۂ مائدہ ختم ہوئی ۔ ارشاد ہوا(لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَافِیْھِنَّ وَھُوعَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ : المائدۃ/۱۲۰) ''اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کی سلطنت اور وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

وعد و وعید جس پر سورۂ انعام کا اختتام ہوا۔ ارشاد ہوا (اِنَّ رَبَّکَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّہٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ :الأنعام /۱۶۶)''بیشک تمھارے رب کو عذاب کرتے دیر نہیں لگتی اور بیشک وہ ضرور بخشنے والا مہربان ہے''۔

حالِ ملائکہ کا بیان فرما کر عبادت پر برانگیختگی جس پر سورۂ اعراف ختم ہوئی ۔ ارشاد ہوا ( اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّکَ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِہٖ وَ یُسَبِّحُوْنَہٗ وَلَہٗ یَسْجُدُوْنَ : الأعراف / ۲۰۶) ''بیشک وہ جو تیرے رب کے پاس ہیں اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور اس کی پاکی بولتے ہیں اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں''۔

جہاد اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی پر ترغیب جس پر سورۂ انفال ختم ہوئی ۔ ارشاد ہے: (وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ ھَاجَرُوْا وَ جَاھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَ نَصَرُوْا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَّھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّ رِزْقٌ کَرِیْمٌ ، وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْ بَعْدُ وَھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا مَعَکُمْ فَاُولٰٓئِکَ مِنْکُمْ،

---

[۱] (وہ مرد جو اپنے بعد نہ باپ چھوڑے نہ اولاد)

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ، اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ : الأنفال/ ۷۵)
"اور وہ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں لڑے اور جنھوں نے جگہ دی اور مدد کی وہی سچے ایمان والے ہیں، ان کے لیے بخشش ہے اور عزت کی روزی، اور جو بعد کو ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمھارے ساتھ جہاد کیا وہ بھی تمھیں میں سے ہیں، اور رشتہ والے ایک دوسرے سے زیادہ نزدیک ہیں اللہ کی کتاب میں بے شک اللہ سب کچھ جانتا ہے۔"

رسول کا وصف، ان کی مدح اور تہلیل (لا الٰہ الا اللہ کہنا) جس پر سورۂ براءت ختم ہوئی۔ ارشاد ہے (لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَاعَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ : التوبة /۹) "بیشک تمھارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول جن پر تمھارا مشقت میں پڑنا گراں ہے، تمھاری بھلائی کے نہایت چاہنے والے، مسلمانوں پر کمالِ مہربان، پھر اگر وہ منہ پھیریں تو تم فرمادو کہ اللہ کافی ہے، اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں، میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور وہ بڑے عرش کا مالک ہے۔"

حضور علیہ الصلاۃ والتسلیم کو تسلی دی جس پر سورۂ یونس اور سورۂ ہود ختم ہوئیں۔ ارشاد ہے (وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ : يونس/ ۱۰۹) "اور اس پر چلو جو تم پر وحی کی جاتی ہے اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ حکم فرمائے اور وہ سب سے بہتر حکم فرمانے والا ہے"۔ (وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ وَمَارَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّاتَعْمَلُوْنَ : هود/ ۱۲۳)" اور اس پر بھروسہ رکھو اور تمھارا رب تمھارے کاموں سے غافل نہیں۔"

قرآن کی مدح وتوصیف جس پر سورۂ یوسف ختم ہوئی۔ ارشاد ہے (وَمَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ : يوسف/ ۱۱۱) "یہ (قرآن) کوئی بناوٹ کی بات نہیں لیکن اپنے سے اگلے کاموں کی تصدیق ہے اور ہر چیز کا مفصل بیان اور مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت۔"

رسول کو جھٹلانے والوں کا رد جس پر سورۂ رعد ختم ہوئی۔ ارشاد ہوتا ہے: (وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ، وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ : الرعد/۴۳) "اور کافر کہتے ہیں تم رسول نہیں، تم فرماؤ اللہ گواہ کافی ہے مجھ میں اور تم میں اور وہ جسے کتاب کا علم ہے۔"

اختتام سورہ کو سب سے زیادہ واضح طور پر بتانے والا سورۂ ابراہیم کا خاتمہ بھی ہے۔ ارشاد ہے (هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ لِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ: ابراهيم/۵۲)

"یہ لوگوں کو حکم پہنچانا ہے اور اس لیے کہ وہ اس سے ڈرائے جائیں اور اس لیے کہ وہ جان لیں کہ وہ ایک ہی معبود ہے اور اس لیے کہ عقل والے نصیحت مانیں۔"

اسی کے مثل سورۂ احقاف اور سورۂ حجر کے خاتمے بھی ہیں۔ سورۂ احقاف کا خاتمہ اس طرح ہے: (بَلٰغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ : الاحقاف/ ۳۵) "یہ پہنچانا ہے تو وہی لوگ ہلاک کیے جائیں گے جو بے حکم ہیں" اور سورۂ حجر کے خاتمے کے الفاظ اس طرح ہیں: (وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ : الحجر/ ۹۹) "اور مرتے دم تک اپنے رب کی عبادت میں رہو۔"

اس آیت کریمہ میں یقین کی تفسیر موت سے کی گئی ہے، اس لیے یہ خاتمہ بلا شبہہ غایت براعت میں ہے۔

سورۂ زلزلہ کو دیکھو کہ کس طرح قیامت کے ہولناک مناظر سے اس کی ابتدا اور اللہ تعالیٰ کے قول ( فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ، وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ :الزلزال/۷،۸) پر اس کا اختتام ہوا۔ "تو جو ایک ذرہ بھر بھلائی کرے اسے دیکھے گا اور جو ایک ذرہ بھر برائی کرے اسے دیکھے گا"۔

سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت (وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ : البقرۃ/ ۲۸۱ ) کو دیکھو اس میں براعت اور اس آخریت کا کیسا اشعار ہے جس کو وفات مستلزم ہوتی ہے۔ "اور ایسے دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاوگے"

اسی طرح سب سے آخر میں نازل ہونے والی سورۂ نصر میں وفات کا اشعار ہے جیسا کہ امام بخاری نے بطریق سعید بن جبیر، حضرت عبداللہ بن عباس سے تخریج کی کہ حضرت عمر نے صحابۂ کرام سے اللہ تعالیٰ کے قول ( اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ / ۱ ) کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا کہ اس کا معنی ہے: شہروں اور محلات کی فتح۔ پھر حضرت عمر نے حضرت ابن عباس سے کہا: ابن عباس! تم کیا کہتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا: اس سے مراد ہے: دنیا میں محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات کا وقت معین جس سے خود حضور کو باخبر کر دیا گیا تھا۔

بخاری نے ہی حضرت ابن عباس سے تخریج کی کہ انھوں نے کہا: حضرت عمر مجھے جنگ بدر میں شریک ہونے والے سن رسیدہ صحابہ کے درمیان بٹھاتے، میرا خیال ہے کہ ایک صاحب کو حضرت عمر کا یہ طرز عمل پسند نہ آیا اس لیے انھوں نے کہا: یہ جناب ہمارے درمیان بیٹھتے ہیں حالاں کہ ان کے برابر تو ہمارے بیٹے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمر نے فرمایا: یہ کون ہیں آپ سب لوگ جانتے ہیں۔ پھر ایک دن ان لوگوں کو حضرت عمر نے بلا کر ان سے دریافت فرمایا: آپ لوگ اللہ تعالیٰ کے قول ( اذا جاء

نصر الله والفتح ) کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ جواب میں بعض نے کہا: اس آیت میں ہمیں اس وقت اللہ کی حمد کرنے اور اس سے مغفرت طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے جب ہمیں دشمنوں پر فتح ونصرت حاصل ہو؛ جب کہ بعض خاموش رہے اور کچھ نہیں بولے؛ اب انھوں نے مجھ سے سوال کیا ابن عباس! کیا تم بھی یہی کہتے ہو؟ میں نے کہا: نہیں میں یہ نہیں کہتا، اس پر انھوں نے فرمایا تو پھر تم کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا: اس سے مراد رسول کے اس دنیا سے پردہ فرمانے کا وقت ہے جس سے آپ کو اللہ نے پہلے ہی آگاہ فرمادیا تھا چناں چہ فرمایا ( اذا جاء نصر الله والفتح ) تمھاری وفات کے وقت کی علامت ہے اس لیے تم اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے اس کی پاکی بیان کرو اور اس سے مغفرت طلب کرو بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔( فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا : النصر/ ۳) —— یہ سن کر حضرت عمر نے کہا: میں بھی اس سورہ کی وہی مراد جانتا ہوں جس کے تم قائل ہو۔

## آیتوں اور سورتوں کی مناسبت

لغت میں لفظِ مناسبت، مشابہت اور ایک چیز کے دوسری سے قریب ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ لیکن آیات اور ان کے مماثل امور میں مناسبت کا مطلب ہے: آیات کے درمیان ربط پیدا کرنے والا معنی خواہ وہ عام ہو یا خاص، عقلی ہو یا حسی، خیالی ہو یا ان کے علاوہ علاقات کی کوئی نوع یا تلازم ذہنی ہو۔ جیسے سبب، مسبب، علت، معلول، دو نظیریں، دو ضدیں اور انھیں جیسے دوسرے امور۔

اس کا فائدہ ہے کلام کے بعض اجزا کا بعض دوسرے اجزا سے اس طرح متصل ہونا کہ اس سے ارتباطِ باہمی مضبوط اور پختہ ہو جائے اور تالیف وربط باہم کا حال اس مضبوط و مستحکم عمارت کی طرح ہو جائے جس کے اجزا باہم ملے ہوئے ہوں۔

شیخ ابوحیان علامہ ابوجعفر بن الزبیر نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب تالیف فرمائی ہے جس کا نام "البرهان فی مناسبة سور القرآن " ہے، اسی طرح شیخ برہان الدین بقاعی کی بھی ایک مستقل تصنیف ہے جس کا نام "نظم الدرر فی تناسب الآ ی والسور " ہے، علامہ سیوطی نے بھی ایک عمدہ جز تحریر فرمایا ہے جس کا نام " تناسق الدرر فی تناسب السور " ہے۔

علم المناسبۃ ایک بلند مرتبہ علم ہے لیکن چوں کہ یہ علم مشکل اور دشوار ہے اس لیے مفسرین نے اس کی طرف کم توجہ دی ہے۔ امام فخر الدین رازی اس زمرۂ مفسرین سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے اس علم سے بہت زیادہ اعتنا کیا ہے۔ وہ اپنی تفسیر میں کہتے ہیں: "قرآن کے زیادہ تر نکتے، ترتیبات و روابط قرآنی میں ودیعت رکھے گئے ہیں"۔

شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے کہا: علم المناسبۃ ایک اچھا علم ہے لیکن ارتباط کلام کے حسن کے

بارے میں شرط یہ ہے کہ وہ کلام ایک ایسے امر متحد میں واقع ہو جس کا اول اس کے آخر سے جڑا ہوا ہو اس لیے اگر کلام مختلف اسباب کی بنا پر واقع ہو تو ایسے کلام میں ارتباط نہیں پیدا ہوگا لہٰذا جو شخص اس کلام کے اجزا میں ربطِ باہم پیدا کرے گا وہ ایک ایسی بات کی زحمت کرے گا جو اس کے بس سے باہر ہے۔ ہاں اس کے بس میں یہ ضرور ہوگا کہ وہ ایک کمزور اور پھسپھسا ربط ظاہر کر دے جس سے اچھے کلام کو محفوظ رکھا جانا چاہیے چہ جائیکہ سب سے اچھے کلام قرآن مجید کو کہ اس کو تو ایسے ربط سے محفوظ رکھا جانا از بس ضروری ہوگا کیوں کہ قرآن بیس سے زیادہ سالوں میں ایسے مختلف احکام کی بابت نازل ہوا جو مختلف اسباب کی وجہ سے جاری کیے گئے اور جو کلام ایسا ہو اس کے بعض اجزا کو بعض سے مربوط کرنا ممکن نہیں۔

## تنبیہ

کچھ آیات ایسی بھی ہیں جن کا اپنے ماقبل کی آیات سے مناسب ہونا مشکل ہے۔ جیسے سورۂ قیامہ کی یہ آیات ( لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ، اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ، فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ، ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ: القيامة/١٦ ، ١٧، ١٨، ١٩) ، ( كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ، وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ: القيامة/٢٠، ٢١) ”تم یاد کرنے کی جلدی میں قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دو، بیشک اس کا محفوظ کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے تو جب ہم اسے پڑھ چکیں اس وقت اس پڑھے ہوئے کا اتباع کرو، پھر بیشک اس کی باریکیوں کا تم پر ظاہر فرمانا ہمارے ذمہ ہے۔“ ”کوئی نہیں بلکہ اے کافرو! تم پاؤں تلے کی (دنیا کو) دوست رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ بیٹھے ہو۔“

ان آیات کی اولِ سورہ اور آخرِ سورہ سے وجہ مناسبت کا بیان بہت دشوار ہے کیوں کہ پوری سورہ احوالِ قیامت کے بیان میں ہے بس یہی چند آیات اس سے مستثنیٰ ہیں یہاں تک کہ بعض رافضیوں نے یہ بے بنیاد دعویٰ کر دیا کہ اس سورہ کی کچھ آیات درمیان سے ساقط ہوگئی ہیں حالاں کہ صحیح بخاری میں ہے کہ یہ آیات نزولِ وحی کی حالت میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اپنی زبان کو حرکت دینے کے بارے میں نازل ہوئیں۔

ائمہ نے ان کی چند مناسبتیں ذکر فرمائی ہیں جن میں سے دو کو ہم ذیل میں تحریر کر رہے ہیں:

ایک مناسبت تو یہ ہے کہ چوں کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کا ذکر فرمایا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی محبت انھیں لوگوں کو ہوتی ہے جو طاقت وقدرت کے باوجود قیامت کے لیے عمل کرنے سے باز رہتے ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ افعالِ خیر کی طرف سبقت و پیش قدمی کا مطلوب ہونا اصلِ دین سے ہے اس لیے حضور کو اس بات پر متنبہ فرما دیا کہ کبھی کبھی تم اس مطلوب کے مقابلے میں اس سے بھی عظیم تر چیز کے درپے ہوتے ہو اور وہ ہے وحی کو پوری توجہ سے کان لگا کر سننا اور اس کی مراد کو سمجھنے کی

کوشش کرنا جب کہ نزولِ وحی کی حالت میں ہی اس کے حفظ میں مشغولیت اس مقصد کے حصول میں رکاوٹ بنتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم وحی کو یاد کرنے کی کوشش میں پہل نہ کرو کیوں کہ اسے یاد کرا دینا اور تمھارے سینے میں اسے محفوظ کر دینا ہمارے ذمۂ کرم پر ہے۔ بس تم وحی کو پوری کی پوری نازل ہونے تک غور سے سننے میں پوری توجہ مبذول رکھو پھر اس مضمون کا اتباع کرو جس پر وہ مشتمل ہو۔ پھر جب جملۂ معترضہ یعنی مندرجہ بالا آیات کریمہ پوری ہوگئیں تو اسی مضمون سے متعلق کلام کا آغاز ہوا جس کا تعلق اسی انسان سے ہے جس کے ذکر سے ابتدا ہوئی تھی اور جو حضور ہی کی جنس سے ہے۔ چناں چہ ارشاد ہوا ( کَلَّا[۱]: ہرگز نہیں ) گویا فرمایا: بلکہ اے اولادِ آدم! تمھاری خلقت میں عجلت وجلد بازی شامل ہونے کے سبب تم ہر کام میں جلد بازی کرتے ہو اور یہی وجہ ہے کہ تم دنیا سے محبت کرتے ہو۔

دوسری مناسبت یہ ہے کہ چوں کہ "نفس" کا ذکر اولِ سورہ میں ہو چکا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے نفسِ مصطفیٰ کے ذکر کی طرف عدول فرمایا گویا کہا گیا: یہ دوسرے نفوس کا حال ہے اور اے محمد! قدر ومنزلت میں تمھارا نفس چوں کہ تمام نفوس سے اشرف واعلیٰ ہے اس لیے اسے کامل ترین احوال کو اختیار کرنا چاہیے۔

اسی قبیل سے اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی ہے: (یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ، وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ أَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ : البقرة/۱۸۹) "تم سے نئے چاندوں کو پوچھتے ہیں۔ تم فرمادو وہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں اور حج کے لیے۔ اور یہ کچھ بھلائی نہیں کہ گھروں میں پچھیت توڑ کر آؤ، ہاں بھلائی تو پرہیز گاری ہے اور گھروں میں دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو اس امید پر کہ فلاح پاؤ"۔

یہاں یہ سوال اٹھایا گیا کہ نئے چاند کے احکام اور گھروں میں آنے کے حکم کے درمیان ربط پیدا کرنے والا معنی کیا ہے؟

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ بابِ استطراد سے ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ نے چاند کے گھٹنے بڑھنے کی حکمت کے بارے میں کیے جانے والے سوال کے جواب میں فرمایا کہ "اَهِلَّه" حج کا وقت معلوم کرنے کی علامتیں ہیں ـــــ اور حج میں پچھواڑوں سے اپنے گھروں میں داخل ہونا زمانہ جاہلیت کے لوگوں کا ایک فعل تھا جیسا کہ اس آیت کریمہ کے سببِ نزول میں ثابت ہو چکا ـــــ تو سوال میں مذکور امر پر جواب میں زیادتی کر دینے کے باب سے ذکرِ اہلہ کے ساتھ "اتیانِ بیوت" کا ذکر فرما دیا

[۱] یہ کلمۂ ردع ہے۔

جیسے حضور سے سمندر کے پانی کے بارے میں سوال ہوا تو فرمایا: "هُوَالطَّهُوْرُ مَاءُهٗ وَالْحِلُّ مَيْتَتُهٗ"۔ "اس کا پانی پاک کرنے والا اور اس کا مردار حلال ہے۔"

صحابۂ کرام نے صرف سمندر کے پانی کے بارے میں سوال کیا تھا مگر حضور نے جواب میں "الحل میتته" کا اضافہ فرما دیا۔

اسی قبیل سے اللہ تعالیٰ کا یہ قول (وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ: البقرۃ/ ۱۱۵) بھی ہے۔ "اور پورب پچھّم سب اللہ ہی کا ہے تو تم جدھر منہ کرو ادھر وجہ اللہ (خدا کی رحمت تمھاری طرف متوجہ) ہے۔"

یہاں یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اس قول کا اپنے ماقبل (وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا: البقرۃ/ ۱۱۴[۱]) سے کیا تعلق ہے؟

شیخ ابو محمد جوینی نے اپنی تفسیر میں فرمایا: میں نے ابوالحسن دہان کو کہتے ہوئے سنا: اس قول کے اپنے ماقبل سے تعلق کی وجہ یہ ہے کہ بیت المقدس کی ویرانی کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اس لیے مطلب یہ ہوا کہ اے ایمان والو تم سے مسجدوں یعنی بیت المقدس میں خدا کا نام ذکر کیے جانے سے روکنے اور ان کی ویرانی کی کوشش کرنے کی ایسی قبیح حرکت سرزد نہ ہو جو روم کے نصرانیوں سے صادر ہوئی بلکہ تم اپنی نمازوں میں اس کی طرف رخ کرو اس لیے کہ مشرق و مغرب کا مالک تو اللہ ہے۔

## اعجاز قرآن

معجزہ: ایسا امر ہے جو خارق عادت ہو اور تحدی (چیلنج) پر مشتمل ہونے کے ساتھ، معارضہ سے محفوظ بھی ہو۔

یہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ [۱] حسی [۲] عقلی۔

بنی اسرائیل کے اکثر معجزات، ان کی قلت ذکاوت و بصیرت کی وجہ سے حسی ہیں جب کہ اس امت کے اکثر معجزات اس کی حد سے زیادہ ذکاوت اور استنباط معانی کے لیے اس کے ذہنوں کی جودتِ استعداد کے کمال کی وجہ سے عقلی ہیں اور اس لیے بھی عقلی ہیں کہ یہ شریعت روز قیامت تک صفحات دہر پر باقی رہے گی اس لیے خصوصی طور پر اسے قیامت تک باقی رہنے والے عقلی معجزہ (قرآن کریم) سے نوازا گیا تا کہ اہل بصیرت اسے دیکھیں جیسا کہ بخاری کی تخریج کے مطابق نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا "ہر نبی کو کوئی نہ کوئی ایسا معجزہ دیا گیا جس کی بنیاد پر لوگ اس نبی پر ایمان لائے لیکن مجھے جو معجزہ دیا گیا وہ وحی ہے جو اللہ نے مجھ پر نازل کی اس لیے مجھے امید ہے (یقین

---

[۱] اوراس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ کی مسجدوں کو روکے ان میں نام خدا لیے جانے سے اوران کی ویرانی میں کوشش کرے۔

ہے) کہ میرے پیرو کار تمام انبیا سے زیادہ ہوں گے''۔

کہا گیا کہ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ انبیائے کرام کے معجزات ان کے زمانوں کے ختم ہونے کے ساتھ ناپید ہو گئے اس لیے ان معجزات کے صدور کے وقت جو لوگ موجود تھے انھیں نے ان کا مشاہدہ کیا جب کہ قرآن کا معجزہ قیامت تک باقی رہے گا۔

حضور کے اس دعوے کی صحت پر دلیل یہ ہے کہ قرآن اپنے اسلوب بیان و بلاغت میں خارق عادت ہے اور اس نے امور غیبی کی بھی خبر دی ہے اسی لیے جو زمانہ بھی گذرتا ہے اس میں غیب کی ان باتوں میں سے کچھ ضرور رونما ہو جاتا ہے جن کے آئندہ وقوع پذیر ہونے کی قرآن نے خبر دی ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ حدیث شریف کا معنی ہے: ماضی کے واضح معجزات مثلاً ناقۂ حضرت صالح اور عصائے حضرت موسیٰ حسی تھے جن کا مشاہدہ آنکھوں سے کیا جاتا تھا جب کہ معجزۂ قرآن کا مشاہدہ نگاہ بصیرت سے کیا جاتا ہے اس لیے جو لوگ بصیرت کی وجہ سے اس کا اتباع کریں گے وہ اکثریت میں ہوں گے کیوں کہ سر کی آنکھ سے جس کا مشاہدہ کیا جائے وہ مشاہدہ کرنے والے کے فنا ہونے سے فنا ہو جاتا ہے لیکن جس کا مشاہدہ نگاہ عقل سے کیا جائے وہ باقی رہتا ہے اور اس کا مشاہدہ ہمیشہ تواتر کے ساتھ وہ تمام لوگ کریں گے جو یکے بعد دیگرے دنیا میں آتے رہیں گے۔

اہل عقل کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اس طرح معجز ہے کہ لوگوں کو معارضے کا چیلنج دیے جانے کے بعد بھی کوئی اس جیسا کلام نہیں پیش کر سکا چناں چہ جب نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسے اہل عرب کے سامنے پیش کیا جو تمام فصحا سے فصیح تر اور بلاغت و تفنن کلام میں با کمال خطیب تھے اور انھیں چیلنج دیا کہ وہ قرآن جیسا کوئی کلام بنا کر لے آئیں اور انھیں سالہائے دراز تک مہلت دی تو بھی وہ ایسا نہ کر سکے۔ ارشاد باری ہے ( فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ :الطور / ۳٤) ''اگر وہ سچے ہیں تو اس (قرآن) جیسا کوئی کلام لے آئیں۔''

پھر انھیں قرآن جیسی دس سورتیں بنانے کا چیلنج دیا گیا، ارشاد ہوا ( اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ، قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ : هود /۱۳، ۱٤) ''کیا یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے اسے جی سے بنالیا ہے تم فرماؤ کہ تم ایسی بنائی ہوئی دس سورتیں لے آؤ اور اللہ کے سوا جو مل سکیں سب کو بلالو اگر تم سچے ہو تو اے مسلمانو! اگر وہ تمھاری اس بات کا جواب نہ دے سکیں تو سمجھ لو کہ وہ اللہ کے علم ہی سے اترا ہے''۔

پھر انھیں ایک سورہ بنا کر پیش کرنے کا چیلنج دیا گیا، ارشاد ہوا :(اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىه، قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ : يونس/ ۳۸) ''کیا یہ کہتے

ہیں کہ انھوں نے اسے بنالیا ہے تم فرماؤ! تو اس جیسی ایک سورہ لے آؤ اور اللہ کو چھوڑ کر جو مل سکیں سب کو بلالو اگر تم سچے ہو"۔

اس کے بعد انھیں دوبارہ چیلنج کیا گیا۔ ارشاد ہوا( وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: البقرة/۲۳) "اور اگر تمھیں کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے (اس خاص) بندے پر اتارا تو اس جیسی ایک سورہ تو لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے سب حمایتیوں کو بلالو اگر تم سچے ہو"۔

یوں جب وہ اپنے درمیان خطبا و بلغا کی کثرت کے باوجود قرآن کے معارضے اور اس کے مشابہ ایک سورہ بھی پیش کرنے سے عاجز و بے بس ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے عجز و بے بسی کا اظہار اور قرآن کے اعجاز کا اعلان پرزور انداز میں کرتے ہوئے فرمایا ( قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰى اَنْ يَّأْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا: الاسراء/۸۸) " تم فرماؤ! اگر آدمی اور جن سب اس بات پر متفق ہو جائیں کہ اس قرآن کی مانند لے آئیں تو اس کا مثل نہ لا سکیں گے اگر چہ ان میں ایک دوسرے کا مددگار ہو"۔

ظاہر ہے کہ ان کی یہ بے بسی اس لیے نہیں تھی کہ وہ غیر فصیح تھے یا بحث و جدال سے دور رہنے والے لوگ تھے۔ نہیں۔ بلکہ وہ فصیح اور سخت جھگڑالو واقع ہوئے تھے، ان کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ وہ نور قرآن کو ہمیشہ کے لیے گل کر دیں اور اس کے امر کو مخفی کر دیں اس لیے اگر اس کا معارضہ کرنا اور اس جیسا کلام تیار کر لینا ان کے بس میں ہوتا تو یقیناً وہ حجت و دلیل کی غرض سے ضرور اس کی طرف رجوع کرتے لیکن ان میں سے کسی کے بارے میں بھی منقول نہیں کہ اس نے اپنے دل میں ہی یہ سوچا ہو یا اس کا ارادہ کیا ہو بلکہ انھوں نے کبھی عناد اور دیدہ و دانستہ انکار قرآن کا سہارا لیا اور کبھی استہزا و تمسخر کی جانب مائل ہوئے چناں چہ کبھی اسے جادو کہا، کبھی شعر کہا اور کبھی اسے اگلوں کی بے اصل داستان ہوش ربا قرار دیا یہ سب کچھ ان کی حیرانی و سراسیمگی اور ان کی فصاحت و شیریں بیانی کے سوتے خشک ہو جانے کی وجہ سے ہی ہوا۔

ولید بن مغیرہ نے جب قرآن کو سنا اور اس سے اس کی قوم کے لوگوں نے قرآن کے بارے میں اپنے لیے کوئی خوش کن بات کہنے کی فرمائش کی تو وہ کہتا ہے: میں کیا کہوں! خدا کی قسم تم میں کوئی بھی مجھ سے زیادہ دانائے شعر نہیں اور نہ ہی کوئی شعر کے رجز و قصیدہ اور اشعارِ جن سے ہی مجھ سے زیادہ واقف و آگاہ ہے۔ خدا کی قسم قرآن کی باتیں ان میں سے کسی سے ذرا بھی مشابہ نہیں۔ بخدا اس کی کہی ہوئی بات میں حلاوت اور مٹھاس ہے اور اس کے اوپر رونق و تابانی اور حسن و جمال ہے۔ اس کا بالائی حصہ پھل دار ہے اور اس کا زیریں حصہ زرخیز ہے، یہ غالب ہوگا مغلوب نہیں اور ان سب کو شکست و ریخت سے دوچار کر دے گا جو اس سے کہتر ہیں۔

# فصل

## وجہ اعجاز قرآن

امام فخر الدین رازی نے کہا: وجہ اعجاز : فصاحت ،ندرت اسلوب اور تمام عیوب سے محفوظ ہونا ہے۔

علامہ زملکانی نے کہا: و جہ اعجاز کا تعلق قرآن کے خصوصی انداز تالیف سے ہے نہ کہ مطلق تالیف سے۔یعنی وجہ اعجاز یہ ہے کہ قرآن کے مفردات ،ترکیب اور وزن میں معتدل ہیں اوراس کے مرکبات معنی میں بلند و بالا ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا: اس سلسلے میں صحیح قول جس کے قائل جمہور اور ماہرین وجہ اعجاز ہیں — یہ ہے کہ قرآن کا اعجاز اس کے نظم اور اس کے معانی کی صحت اور اس کے الفاظ کی پیہم فصاحت کے سبب ہے۔

یہ اس لیے کہ علم الٰہی ہر شئی کو اور ہر کلام کو محیط ہے تو احاطۂ علم کے سبب اسے معلوم ہے کہ کون سا لفظ ، پہلے لفظ کے بعد آنے کے لائق ہے اور ایک معنی کے بعد دوسرے معنی کو واضح کر سکتا ہے۔ پھر قرآن کا یہ حال اول تا آخر ہے ایسا نہیں کہ یہ کسی ایک مقام یا چند مقامات کے ساتھ مخصوص ہو جب کہ جہل ،نسیان اور غفلت افراد بشر میں عام ہے اور ضروری طور پر معلوم ہے کہ کسی بھی انسان کا علم ہر چیز اور ہر کلام کو محیط نہیں اسی لیے نظم قرآن ،فصاحت کے انتہائی اعلیٰ و برتر معیار پر ہے۔

اسی سے ان لوگوں کا قول باطل ہو گیا جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن کا مثل پیش کر دینا عرب کے بس میں تھا مگر انھیں اس سے پھیر دیا گیا۔

صحیح یہی ہے کہ کبھی بھی اس کا مثل پیش کرنا کسی کی قدرت میں نہیں رہا اسی لیے تم ایک بلیغ شخص کو دیکھتے ہو کہ وہ سال بھر ایک قصیدہ یا خطبہ کی تصحیح و اصلاح کرتا ہے لیکن جب پھر اس میں نظر غائر ڈالتا ہے تو اس میں کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور کرتا ہے اور یہ عمل بس اسی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ آگے بھی جاری ہی رہتا ہے، جب کہ کتاب الٰہی کا معاملہ یہ ہے کہ اگر اس سے ایک لفظ بھی نکال دیا جائے پھر اس سے بہتر اور زیادہ خوب صورت کسی لفظ پر عربوں کی زبانیں جاری کی جائیں تو انھیں ایسا کوئی لفظ نہ مل سکے گا۔

ہمارے سامنے قرآن کا کمال فصاحت و بلاغت اکثر مقامات پر عیاں ہے۔بعض جگہوں میں وجہ کمال ہمارے لیے مخفی ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ ہم سلامتی ذوق اور جودت فکر میں اس درجے کو نہ پہنچ سکے جس پر عرب زمانۂ نزول قرآن میں تھے مگر جب وہ معارضہ سے عاجز رہے تو اعجاز قرآن کی حجت انہی عرب کے ذریعہ سارے عالم پر قائم ہو گئی اس لیے کہ وہ ارباب فصاحت تھے اور ان کی ہی جانب سے قرآن کے معارضے کا امکان تھا جیسے حضرت موسی کے معجزے میں جادوگروں سے اور حضرت عیسی کے معجزے میں اطبا سے حجت قائم ہوئی کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بھی نبی کو جو بھی معجزہ عطا فرمایا وہ اس

نبی کے زمانے کے مشہور اور سب سے زیادہ نادر اور انوکھے نہج پر ہی ہوتا تھا چناں چہ جادو حضرت موسیٰ کے زمانے میں انتہائی درجے کو پہنچا ہوا تھا اسی طرح حضرت عیسیٰ کے زمانے میں طب اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیہم اجمعین کے زمانے میں فصاحت اپنی آخری حدوں کو پہنچی ہوئی تھی۔

## تنبیہات

[۱] قرآن کے بلند ترین مراتب بلاغت پر فائز ہونے کی بابت علما کے درمیان اس حیثیت سے اتفاق ہے کہ تراکیب میں کوئی ایسی ترکیب نہیں پائی جاسکتی جو افادۂ معنی میں اس سے زیادہ متناسب اور معتدل ہو۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ کیا سارا قرآن ایک ہی درجۂ بلند پر ہے یا نظم قرآن میں درجۂ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے باہم تفاوت ہے۔ قاضی ماوردی اس کے قائل ہیں کہ کوئی تفاوت نہیں، قرآن کا ہر کلمہ فصاحت کے بلند ترین مقام پر فائز ہے اگر چہ بعض لوگ بعض دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اسے زیادہ بہتر طور پر محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ابونصر قشیری وغیرہ نے تفاوت کو مختار قرار دیا ہے یوں ان کے نزدیک قرآن میں فصیح اور فصیح تر دونوں موجود ہیں۔

[۲] شعر موزوں کا رتبۂ فصاحت کلام منثور کے مقابلے میں اونچا مانا جاتا ہے مگر قرآن کریم شعر موزوں سے خالی ہے اس میں کیا حکمت ہے؟

اس بارے میں کہا گیا کہ قرآن سرچشمۂ حق اور جامع صداقت وراستی ہے جب کہ شاعر کا انتہائی کمال خیال آفرینی ہے۔ باطل اور غیر واقعی امر کو وہ حق اور واقعی امر کے پیکر میں پیش کرتا ہے، تعریف میں غلو اور مذمت و ایذا میں مبالغہ سے کام لیتا ہے، حق کا اظہار اور سچی بات کا اثبات اس کا مقصود نہیں ہوتا اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو شعر سے منزہ رکھا۔ اور چوں کہ شعر کذب بیانی و دروغ بافی پر مشتمل ہونے میں حد شہرت کو پہنچا ہوا ہے اسی لیے اصحاب برہان نے ایسے قیاسات کو "شعریہ" کا نام دیا ہے جو زیادہ تر بطلان اور کذب کا نتیجہ دیتے ہیں۔

بعض دانش وروں نے کہا: کوئی دین دار اور راست گفتار شخص ایسا نہیں دیکھا گیا جو اپنے شعر میں حیرت انگیز باتیں بیان کرے۔

## قرآن سے مستنبط علوم سے علما کا اعتنا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (مَافَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ: الانعام/۳۸) "ہم نے اس کتاب میں کچھ اٹھا نہ رکھا۔" "یعنی جملہ علوم اور تمام ما کان وما یکون کا اس میں بیان ہے اور جمیع اشیا کا علم اس میں ہے۔" (خزائن العرفان)

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے: (وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ، النحل/۸۹)

"اور ہم نے تم پر یہ قرآن اتارا کہ ہر چیز کا بیان ہے۔"

ترمذی وغیرہ کی تخریج ہے کہ ارشاد رسالت مآب ہوا "سَتَكُوْنُ فِتَنٌ" "جلد فتنے رونما ہوں گے۔" عرض کی گئی: ان سے نکلنے کی راہ کیا ہے؟ فرمایا: اللہ کی کتاب۔ اس میں تم سے پہلے پیش آنے والے واقعات بھی مذکور ہیں اور تمھارے بعد رونما ہونے والے واقعات بھی یوں ہی تمھارے مابین کا حکم یعنی علم بھی۔

سعید بن منصور نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے تخریج کی۔ انھوں نے فرمایا: جو علم کا طلب گار ہو وہ قرآن کو اپنے اوپر لازم کرلے کیوں کہ اس میں اولین و آخرین کی خبریں ہیں۔ بیہقی نے کہا: انھوں نے علم سے مراد اصول علم لیا ہے۔

بیہقی نے حسن بصری سے تخریج کی۔ انھوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ایک سو چار کتابیں نازل فرمائیں جن میں سے چار یعنی توریت، انجیل، زبور اور فرقان میں ان کتابوں کے علوم ودیعت فرمادیے پھر ان تینوں کتابوں یعنی توریت، انجیل اور زبور کے علوم، فرقان میں ودیعت فرمادیے۔

حضرت امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: علماے امت کے سارے اقوال سنت کی شرح ہیں اور سنت قرآن کی شرح ہے۔ یہ بھی فرمایا: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جو بھی احکام صادر فرمائے، قرآن سے سمجھ کر صادر فرمائے۔ اس کی تائید حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اس قول سے ہوتی ہے: "اِنِّیْ لَا اُحِلُّ اِلَّا مَا اَحَلَّ اللّٰهُ ، وَلَا اُحَرِّمُ اِلَّا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فِیْ كِتَابِهٖ . اخرجه بهذا اللفظ الشافعي في الام ". "بلاشبہہ میں وہی حلال کرتا ہوں جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور وہی حرام کرتا ہوں جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام کیا۔"

سعید بن جبیر نے کہا: مجھے رسول اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جو بھی حدیث درست طریقے پر ملی اس کی تصدیق مجھے کتاب اللہ سے ملی۔ حضرت ابن مسعود نے کہا: جب میں تم سے کوئی حدیث بیان کروں تو میں کتاب اللہ سے اس کی تصدیق بھی بیان کردوں گا۔ (ان دونوں اقوال کی تخریج ابن ابی حاتم نے کی)

امام شافعی نے یہ بھی فرمایا: کسی کو جو بھی نیا دینی مسئلہ درپیش ہوتا ہے اس کے متعلق راہ ہدایت کی رہ نمائی کتاب اللہ میں ہوتی ہے۔

اگر کہا جائے کہ کچھ ایسے احکام ہیں جو براہ راست سنت سے ثابت ہوئے ہیں؟ تو ہم جواباً کہیں گے: درحقیقت یہ بھی کتاب اللہ سے ماخوذ ہیں اس لیے کہ کتاب اللہ نے ہمارے اوپر اتباع رسول کو ضروری اور ان کے قول پر عمل کو فرض کیا ہے۔

ایک بار امام شافعی نے مکہ میں کہا: تم لوگ مجھ سے جو چاہو پوچھو میں تمھیں اس کے متعلق کتاب اللہ سے بتاؤں گا۔ سوال ہوا: اس مُحرِم کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں جو بھڑ کو مار ڈالے؟ فرمایا: بِسْمِ

اللّٰہِ الرَّ حمٰنِ الرَّ حِیمِ (وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ، وَمَانَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا: الحشر/۷) ''اور رسول تمھیں جو کچھ عطا کریں اسے اختیار کرلو اور جس چیز سے بھی وہ تمھیں روک دیں اس سے باز آ جاؤ۔''

سفیان بن عیینہ نے ہمیں عبد الملک بن عمیر سے، اِنھوں نے رِبعی بن حراش سے، اِنھوں نے حذیفہ بن الیمان سے اور انھوں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے یہ حدیث بیان کی کہ آپ نے فرمایا: میرے بعد ابو بکر وعمر کی اقتدا کرو۔

ہمیں سفیان نے مسعر بن کدام سے اِنھوں نے قیس بن مسلم سے انھوں نے طارق بن شہاب سے اور اِنھوں نے حضرت عمر بن خطاب سے روایت کی کہ انھوں نے حکم دیا کہ محرم بھڑ کو مار ڈالے۔

امام بخاری نے حضرت ابن مسعود سے روایت کی کہ انھوں نے فرمایا: گودنے والیوں، گدوانے والیوں، پیشانی کے بال اکھیڑنے والیوں اور زینت وآرائش کے لیے اپنے دانتوں کے درمیان تفریق کرنے والیوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو کیوں کہ یہ سب اللہ کی بناوٹ کو بدلنے والی ہیں۔

یہ بات جب بنی اسد کی ایک عورت کو معلوم ہوئی تو اس نے ابن مسعود سے کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے ایسی ایسی عورتوں پر لعنت کی ہے؟ آپ نے جواب دیا: میں کیوں نہ ان عورتوں پر لعنت بھیجوں جن پر اللہ کے رسول نے لعنت بھیجی اور یہ لعنت اللہ کی کتاب میں بھی مذکور ہے۔ عورت نے کہا: میں نے اس قرآن کو پڑھا ہے جو دو دفتیوں کے درمیان مکتوب ہے مگر جو بات آپ کہہ رہے ہیں وہ مجھے اس میں نہیں ملی۔ انھوں نے کہا: بخدا! اگر تم نے اسے پڑھا ہوتا تو یہ بات پائی ہوتی۔ کیا تم نے (وما اٰتکم الرسول فخذوه وما نهٰکم عنه فانتهوا) نہیں پڑھا ہے۔ اس نے کہا: ہاں پڑھا تو ہے۔ فرمایا: تو رسول نے ان چیزوں سے نہی فرمائی ہے۔

ابن سراقہ نے کتاب الاعجاز میں ابو بکر بن مجاہد سے نقل کیا کہ انھوں نے ایک دن کہا: عالَم میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کتاب اللہ میں نہ ہو۔ سوال ہوا کہ سرایوں کا ذکر کہاں ہے؟ جواب دیا: اللہ تعالیٰ کے ارشاد: (لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ مَسْکُوْنَةٍ فِیْهَا مَتَاعٌ لَّکُمْ : النور/۲۹) میں بیوتا غیر مسکونة سے مراد سرائیں ہی تو ہیں۔ ''اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں کہ ان گھروں میں جاؤ جو خاص کسی کی سکونت کے لیے نہیں اور ان کے برتنے کا تمھیں اختیار ہے''۔

ابن برہان نے کہا؛ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جو کچھ بھی فرمایا وہ یا تو ہو بہو قرآن میں موجود ہے یا اس کی اصل قریب یا اصل بعید موجود ہے۔ لیکن جو سمجھ سکے انھوں نے سمجھا اور جو نہ جان سکے انھوں نے نہ جانا۔ اسی طرح آپ نے جو حکم دیا، یا جو فیصلہ فرمایا ان کی اصل قریب یا بعید بھی قرآن میں موجود ہے۔ ہاں ان باتوں کا متلاشی ان کو اتنا ہی جان سکتا ہے جتنا وہ جدو جہد کرے گا، اپنی ذہنی و

فکری توانائی صرف کرے گا اور جس قدر وہ انھیں سمجھ سکے گا۔

ایک اور اہل علم نے کہا: اللہ نے جسے سمجھ عطا کی ہے وہ ہر چیز کا استخراج قرآن سے کر سکتا ہے یہاں تک کہ ایک اہل علم نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ترسٹھ سالہ عمر مبارک کا استنباط سورۂ منافقون میں اللہ تعالیٰ کے قول: (وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَاجَآءَ اَجَلُهَا: المنافقون/ ۱۱[۱]) سے کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اسی آیت کریمہ پر ترسٹھ سورتیں مکمل ہوتی ہیں۔ اس کے بعد سورۂ تغابن کو رکھا ہے تا کہ یہ اظہار ہو کہ نبی کے نہ رہنے پر تغابن (نقصان اور کمی) کا ظہور ہوگا۔

ابن ابوالفضل مرسی نے اپنی تفسیر میں کہا: قرآن اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم کا جامع ہے۔ ان سارے علوم کا احاطہ صاحب کلام جل وعلا کو ہے پھر اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہے۔ سوا ان علوم کے جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے مخصوص فرمالیا ہے۔ پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ان علوم کے بڑے حصے کے وارث سر برآوردہ اور ممتاز صحابۂ کرام ہوئے جیسے خلفاے راشدین اور عبداللہ بن مسعود وعبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم یہاں تک کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اگر میرے اونٹ باندھنے کی رسی کھو جائے تو میں اسے کتاب اللہ میں پالوں گا۔ پھر صحابہ سے ان علوم کے وارث وہ تابعین ہوئے جو بھلائی کے ساتھ ان کی پیروی کرنے والے ہیں۔ مگر ان کے بعد ہمتیں پست ہوگئیں، عزائم سست ہوگئے، اہل علم کے حوصلے کمزور ہوگئے اور وہ ان قرآنی علوم وفنون کا بار اٹھانے سے قاصر ہوگئے جن کے حامل صحابہ وتابعین تھے اس لیے انھوں نے علوم قرآن کو اقسام وانواع میں تقسیم کیا، اور ایک ایک گروہ ایک ایک فن کی تحصیل وتعلیم میں لگ گیا۔

کچھ علما نے قرآن کے معانی سے تعرض اور اس میں ودیعت رکھے ہوئے احکام واَسرار وحِکَم میں تدبر کے بغیر صرف اس کے لغات کے ضبط، اس کے کلمات کی تصحیح، اس کے حروف کے مخارج، حروف کی تعداد، اس کے کلمات وآیات وسور اور اَحزاب واَنصاف (آدھا) واَرباع (چوتھائی) کی تعداد، اس کے سجدوں کی تعداد اور ہر دس آیت پر ایک علامت مقرر کرنے سے اعتنا کیا۔ مزید برآں انھوں نے ایک جیسے کلمات اور ملتی جلتی آیات کے شمار میں بھی دل چسپی لی اس لیے انھیں قرا کہا گیا۔

نحویوں نے قرآن میں وارد معرب ومبنی، اسما وافعال اور حروف عاملہ وغیر عاملہ کی طرف توجہ مبذول کی اور اسما اور ان کے توابع، اقسام افعال، لازم ومتعدی، کلمات کے رسم الخط اور ان تمام امور میں تفصیلی گفتگو کی جن کا قرآن سے تعلق ہے حتیٰ کہ بعض نحویوں نے مشکل آیات کی ترکیب نحوی بیان کی اور بعض نے پورے قرآن کی ترکیب لکھی۔

---

[۱] اور ہرگز اللہ کسی بھی جان کو مہلت نہ دے گا جب اس کی موت آجائے گی۔

مفسرین نے قرآن کے الفاظ سے اعتنا کیا چناں چہ انھیں اس میں کوئی ایسا لفظ ملا جو ایک معنی پر دلالت کرتا ہے اور کوئی ایسا لفظ ملا جو دو یا دو سے زیادہ معانی پر دلالت کرتا ہے۔ یوں انھوں نے اول کو اس کے حکم پر جاری کیا اور اگر اس طرح کے کسی لفظ کی مراد میں خفا تھا تو اس کی توضیح کی۔ اور دو یا دو سے زیادہ معانی رکھنے والے الفاظ کے چند محتملات میں سے ایک کو ترجیح دی۔ اس طرح ان مفسرین میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی فکر سے کام لیا اور اپنے تقاضائے فکر ونظر کے مطابق کلام کیا۔

علمائے اصول قرآن میں موجود عقلی دلائل اور اصلی ونظری شواہد کی طرف متوجہ ہوئے۔ جیسے اللہ تعالی کا یہ قول: (لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا: الانبیاء/ ۲۲) اور دوسری کثیر آیات۔ ''اگر زمین وآسمان میں اللہ کے سوا چند خدا ہوتے تو ضرور دونوں بدنظمی کا شکار ہو جاتے۔''

اسی لیے انھوں نے قرآن سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کے وجود، بقا، قِدم، قدرت، علم اور نا شایاں امور سے اس کی تنزیہ پر دلائل کا استنباط کیا۔ اور اس علم کو ''اصول دین'' سے موسوم کیا۔

ایک گروہ نے خطاب قرآنی کے معانی میں تأمل کیا، تو دیکھا کہ بعض کلمات عموم کے مقتضی ہیں اور بعض خصوص چاہتے ہیں اور اس طرح کے امور پر نظر کی تو اس سے حقیقت ومجاز جیسے لغوی احکام مستنبط کیے اسی طرح تخصیص، خبر، نص، ظاہر، مجمل، محکم، متشابہ، امر، نہی، نسخ، قیاس کی قسمیں، استصحاب حال، استقرا وغیرہ کے بارے میں کلام کیا اور اس فن کا نام ''اصول فقہ'' رکھا۔

ایک گروہ نے اپنی نظر صائب اور فکر صادق قرآن کے حلال وحرام اور دیگر احکام کے ادراک میں صرف کی تو اس کے اصول کی تاسیس اور فروع کی تفریع کا کام کیا اور اس بارے میں اچھی تفصیل کی۔ اس فن کو انھوں نے ''علم فروع'' اور ''علم فقہ'' سے موسوم کیا۔

ایک جماعت نے قرآن میں ذکر شدہ قصص اور گزشتہ امتوں کے احوال کی جانب نظر اٹھائی تو ان سارے واقعات وحالات کو نقل کیا، امتوں کے آثار واخبار کی تدوین کی، یہاں تک کہ دنیا کی ابتدا اور اول خلق کا تذکرہ کیا۔ اس فن کو انھوں نے ''تاریخ وقصص'' کا نام دیا۔

کچھ حضرات کو قرآن میں بیان شدہ حِکم، امثال اور مواعظ کا خیال آیا کہ یہ دلوں میں اضطراب برپا کر دیتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑوں کو اپنے اثر سے ریزہ ریزہ کر ڈالیں گے۔ تو انھوں نے قرآن کے وعدہ، وعید، تخویف، بشارت اور موت، معاد، نشر، حساب، عقاب اور جنت ونار کے تذکروں سے کچھ مواعظ کی فصلیں اور زجر وتنبیہ کے اصول مستنبط کیے۔ یہ حضرات خطبا و وُعاظ کہلائے۔

کچھ لوگوں نے قرآن سے ''خوابوں کی تعبیر کا علم'' مستنبط کیا۔ قرآن میں حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کے تحت فربہ گایوں کا ذکر ہے۔ اسی طرح قید خانے میں ان کے دو ساتھیوں کے خواب

اوران کی تعبیر کا بیان ہے، خود حضرت یوسف علیہ السلام نے سورج، چانداور گیارہ ستاروں کو خواب میں دیکھا کہ ان کا سجدہ کررہے ہیں، آخر میں اس کی جو تعبیر رونما ہوئی وہ بھی قرآن میں مذکور ہے۔ ان سب سے اخذ کرتے ہوئے ان حضرات نے ''علم تعبیر رویا'' نکالا۔ اور ہر خواب کی تعبیر قرآن سے نکالی، اگر قرآن سے نکالنا دشوار ہوا تو حدیث میں نظر کی، اس لیے کہ حدیثِ رسول، شارحِ قرآن ہے۔ اگر حدیث سے تعبیر ملنی مشکل ہوئی تو حِکم وامثال سے اخذ کی۔ پھر یہ دیکھا کہ بول چال میں لوگوں کی اصطلاح اوران کا عرف کیا ہے؟ تا کہ اس سے اپنا مطلوب اخذ کرسکیں، اس لیے کہ قرآن ''وَامُرْ بِالْعُرْفِ'' ''معروف کا حکم دو۔'' سے اس طرف اشارہ کررہا ہے۔

قرآن میں میراث سے متعلق آیات، وراثت پانے والوں اور ان کے حصوں وغیرہ کا بیان ہے، ایک جماعت نے اس سے ''علم فرائض'' اخذ کیا۔ اور قرآن میں جو نصف، ثلث، ربع، سدس، اور ثمن کا ذکر ہے اس سے فرائض کے حساب اور عَول کے مسائل کا استنباط کیا۔ اور قرآن سے ''وصیتوں کے احکام'' کا بھی استخراج کیا۔

ایک جماعت نے اس پر نظر کی جو قرآن میں لیل ونہار، شمس وقمر، منازل قمر، نجوم اور بروج وغیرہ کے ذکر میں رب کی قدرت پر عظیم دلائل اور روشن احکام فراہم کیے گئے ہیں۔ اس سے انھوں نے ''علم توقیت'' کا استنباط کیا۔

فن ادب اور شاعری ونثر نگاری سے دل چسپی رکھنے والوں نے قرآن کے ادبی محاسن پر توجہ دی، قرآن میں لفظ کی جزالت، نظم کا بانکپن، سیاق کا حسن، مبادی، مقاطع وغیرہ کی عمدگی، خطاب کی رنگارنگی، ایجاز واطناب وغیرہ کی خوبیاں دیکھیں اوران سب سے ''علم معانی وبیان وبدیع'' کا استنباط کیا۔

ارباب اشارات اور صحاب حقیقت نے قرآن میں نظر کی تو ان کے سامنے قرآن کے الفاظ سے کچھ ایسے دقائق اور معانی رونما ہوئے جن کے انھوں نے خاص خاص اصطلاحی نام رکھے جیسے فنا۔ بقا، حضور، خوف، ہیبت، اُنس، وحشت، قبض، بسط وغیرہ۔ [انھوں نے ان سب سے ایک مستقل فن تشکیل کیا، جسے علم الاسرار، علم باطن یا علم آخرت سے موسوم کیا۔ اب اسی کو علم تصوف کہا جاتا ہے]

یہ ہے ان علوم وفنون کا مختصر تذکرہ جو ملت اسلامیہ نے قرآن حکیم سے اخذ کیے۔

امام غزالی وغیرہ نے فرمایا: قرآن میں احکام سے متعلق آیات پانچ سو ہیں۔ بعض نے کہا ایک سو پچاس ہیں۔ کہا گیا کہ شاید ان کی مراد وہ آیات ہیں جن میں صراحۃً احکام کا بیان ہے ورنہ بہت سے احکام، قصص وامثال کی آیات سے بھی مستنبط ہوتے ہیں۔

شیخ عزالدین بن عبدالسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الِامام فی ادلۃ الاحکام'' میں

لکھا ہے کہ ''بیشتر آیات قرآنی ایسی ہیں کہ آداب حسنہ اور اخلاق جمیلہ پر مشتمل احکام سے خالی نہیں۔ وہ فرماتے ہیں: احکام پر استدلال کئی طرح ہوتا ہے۔ کبھی صیغہ سے ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے۔ کبھی خبر سے ہوتا ہے۔ جیسے: ''اُحِلَّ لَكُمْ'' ''تمھارے لیے حلال کیا گیا۔'' ''حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ'' ''تم پر حرام کیا گیا مردار۔'' ''كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ'' ''تم پر روزے فرض کیے گئے۔''

کبھی احکام کا استدلال اس سے بھی ہوتا ہے جو کسی کام پر دنیا یا آخرت میں بھلائی یا برائی، نفع یا ضرر مرتب کیا گیا ہے۔

شارع نے بندوں کی ترغیب وتخویف اور ان کے اذہان سے قریب کرنے کے لیے بیان احکام کو بہت ساری نوعوں میں تقسیم کیا ہے۔ مثلاً درج ذیل امور وہ ہیں جن سے کسی فعل کی مشروعیت ظاہر ہوتی ہے خواہ وہ وجوب کے درجہ میں ہو یا مندوبیت کے درجہ میں۔

۱۔ شریعت نے کسی فعل کو باعظمت بتایا۔ ۲۔ اس کی مدح کی۔ ۳۔ یا اس فعل کے سبب فاعل کی مدح کی۔ ۳۔ اس فعل کو پسند کیا۔ ۴۔ اس کے فاعل کو پسند کیا۔ ۵۔ اس فعل سے شارع راضی ہے۔ ۶، اس کے فاعل سے راضی ہے۔ ۷۔ اس فعل کو مستقیم، مبارک یا طیب کہا۔ ۸۔ اس کی قسم یاد کی۔ ۹۔ اس کے فاعل کی قسم یاد کی۔ جیسے شفع ووتر کی، مجاہدین کے گھوڑوں کی، نفس لوامہ کی قسم یاد کی۔

۱۰۔ اس فعل کو اپنے بندے کے تذکرے کا سبب بنایا۔ ۱۱۔ اسے محبوب بنانے کا سبب بنایا۔ ۱۲۔ دنیا یا آخرت میں ثواب کا سبب بنایا۔ ۱۳۔ اسے نیک صلہ کا سبب بنایا۔ ۱۴۔ اس فعل کو اس کی ہدایت کا سبب بنایا۔ ۱۵۔ فاعل کو راضی کرنے کا ۱۶۔ اس کے گناہ بخشنے کا ۱۷۔ اس کی برائیاں مٹانے کا ۱۸۔ اسے قبول فرمانے کا ۱۹۔ فاعل کی نصرت کا ۲۰۔ یا اس کی بشارت کا سبب بنایا۔ ۲۱۔ فاعل کو طیب کہا۔ ۲۲۔ فعل کو معروف کہا۔ ۲۳۔ فاعل سے حزن وخوف کی نفی کی۔ ۲۴۔ فاعل کو امن و بے خوفی کا وعدہ دیا۔ ۲۵۔ فعل کو فاعل کی ولایت کا سبب بنایا۔ ۲۶۔ یہ خبر دی کہ رسول نے اس فعل کے حصول کی دعا کی۔ ۲۷۔ فعل کو ''قربت'' بتایا۔ ۲۸۔ کسی مدح کی صفت مثلاً حیات، نور، شفا سے موصوف کیا۔

یہ سارے امور ایسے ہیں جو فعل کی مشروعیت بیان کرتے ہیں۔

اب وہ امور دیکھیے جو فعل کی حرمت وممانعت کی دلیل ہوتے ہیں۔

۱۔ شارع نے اس فعل کے ترک کا مطالبہ کیا۔ ۲۔ اس فعل کی مذمت کی ۳۔ فاعل کی مذمت کی۔ ۴۔ فاعل پر عتاب کیا۔ ۵۔ فاعل کو دشمن رکھا۔ ۶۔ اس پر لعنت کی۔ ۷۔ فعل کے پسندیدہ ہونے کی نفی کی۔ ۸۔ فاعل کے پسندیدہ ہونے کی نفی کی۔ ۹۔ فعل سے رضا کی نفی کی۔ ۱۰۔ فاعل سے رضا کی نفی کی۔ ۱۱۔ فاعل کو بہائم یا شیاطین کے مشابہ کہا۔ ۱۲۔ فعل کو ہدایت سے مانع قرار دیا۔ ۱۳۔ فعل کو قبول سے

مانع کہا۔۱۴۔ اسے برا یا ناپسندیدہ ہونے سے موصوف کیا۔۱۵۔انبیا نے اس فعل سے پناہ مانگی۔۱۶۔اسے دشمن رکھا۔۱۷۔فعل کو نفی فلاح کا ۱۸۔دنیا یا آخرت کے عذاب کا سبب بتایا۔ ۱۹۔مذمت۔۲۰یا ملامت .... ۔۲۱یا ضلالت ....۔۲۲یا معصیت کا سبب بتایا۲۳۔اسے خبیث ....۔ ۲۴یا رجس....۔۲۵یا نجس کہا۲۶ فسق.....۔۲۷یا گناہ کہا۲۸ گناہ....۔۲۹یا رجس....۔۳۰یا لعنت....۔۳۱یا غضب ..... ۔ ۳۲یا زوال نعمت.... ۔۳۳یا نزول مصیبت۳۴۔یا حدود میں سے کسی حد۳۵۔یا سخت دلی ۳۶۔یا رسوائی ۳۷۔یا حقارت نفس کا سبب بتایا۔ ۳۸۔اللہ کی عداوت ۳۹۔اس کی جنگ ۴۰۔اس کے استہزا کے وبال ۴۱۔تمسخر کے وبال ....کا سبب بتایا۔۴۲۔اس فعل کو فاعل کے بھلا دیئے یعنی چھوڑ دیے جانے کا سبب بتایا۔۴۳۔اس فعل پر اپنے صبر ۴۴۔یا حلم ۴۵۔یا ترک تعرض کا ذکر کیا۔۴۶۔اس سے توبہ کی دعوت دی۔۴۷۔فاعل کو خبث ۴۸۔یا حقارت سے موصوف کیا۔۴۹۔فعل کو شیطان کے کام ۵۰۔اس کی تزیین ....۔۵۱۔یا فاعل پر شیطان کے تسلط کی طرف منسوب کیا۔۵۲۔فعل کو کسی صفت ذم۔مثلاً ظلم، بغی، عدوان، گناہ، یا مرض سے موصوف کیا۔۵۳۔انبیا نے اس فعل سے ....۔۵۴۔یا اس کے فاعل سے بیزاری ظاہر کی ۵۵۔یا خدا کی بارگاہ میں اس کے فاعل کی شکایت کی۔۵۶۔یا فاعل سے کھلی عداوت رکھی ۵۷۔یا اس پر رنج وغم سے منع کیا ۵۸۔یا شارع نے اس فعل کو دنیا یا آخرت میں فاعل کی نامرادی کا سبب بنایا ۵۹۔اس فعل پر جنت اور جنت کی نعمتوں سے محرومی مرتب کی ۶۰۔یہ بتایا کہ فاعل خدا کا دشمن ہے ۶۱۔یا خدا اس کا دشمن ہے ۶۲۔فاعل کو خدا اور رسول سے جنگ کی آگاہی دی ۶۳۔یہ بتایا کہ فاعل پر دوسروں کے گناہوں کا بھی بوجھ ہے ۶۴۔بتایا گیا کہ یہ شایاں نہیں، یا یہ نہ ہو۔ ۶۵۔اس فعل سے متعلق پوچھنے پر تقویٰ کا حکم دیا ۶۶۔یا اس کے برخلاف کام کا حکم دیا ۶۷۔فاعل سے متارکت کا حکم دیا ۶۸۔یہ بتایا کہ اس فعل کا ارتکاب کرنے والے آخرت میں ایک دوسرے کو لعنت کریں گے ۶۹۔یا ایک، دوسرے سے بیزاری ظاہر کرے گا ۷۰۔یا ایک دوسرے پر بد دعا کرے گا ۷۱۔فاعل کو گمراہی سے موصوف کیا ۷۲۔یہ بتایا کہ وہ فاعل خدا کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا ۷۳۔یا وہ رسول اور صحابہ سے الگ ہے ۷۴۔اس سے باز رہنے کو فلاح کا سبب بتایا ۷۵۔اسے مسلمانوں کے درمیان بغض وعداوت ڈالنے کا سبب بتایا ۷۶۔اس سے فرمایا گیا: کیا تو باز آنے والا ہے؟ ۷۷۔انبیا کو اس فعل کے مرتکب کے لیے دعا کرنے سے روکا گیا۔۷۸۔اس پر ابعاد یعنی ہلاکت یا طرد یعنی دھتکار مرتب فرمائی۔۷۹۔یا کہا گیا "قُتِلَ مَنْ فَعَلَهٗ" ہلاکت زدہ ہو جو ایسا کرے یا "قَاتَلَهُ اللّٰهُ" خدا اسے ہلاک کرے۔۸۰۔یہ بتایا کہ اس فعل کے مرتکب سے اللہ روز قیامت کلام نہ فرمائے گا۔۸۱۔یا اس کی طرف نظر رحمت نہ فرمائے گا۔۸۲۔اسے ستھرا نہ کرے گا۔۸۳۔اس کا کام نہ بنائے

گا۔۸۴۔اس کا داؤ کامیاب نہ ہونے دے گا۔۸۵۔وہ فلاح نہ پائے گا۔۸۶۔اس پر شیطان کو لگا دیا ہے۔۸۷۔وہ فعل اس کے مرتکب کا دل کج کیے جانے کا.....۸۸۔یا اللہ کی نشانیوں سے پھیر دیے جانے کا.....۸۹۔یا فعل کی علت پوچھنے کا سبب ہے۔

یہ سارے امور ایسے ہیں جو فعل کے ممنوع ہونے کی دلیل ہیں، اور بہ نسبت مکروہ ہونے کے حرام ہونے پر ان کی دلالت زیادہ ظاہر ہے۔

فعل کی اباحت اور جواز درج ذیل امور سے مستنبط ہوتا ہے۔

ا۔صاف ''حلال کرنا'' بتایا گیا ہو۲۔اس پر گناہ، حرج، اثم، مواخذہ کی نفی ہو۳۔اس کے ماذون اور عفو ہونے کا بیان ہو۴۔اشیا میں جو منافع ہیں انھیں ذکر کر کے ان پر احسان جتایا گیا ہو ۵۔تحریم سے سکوت ہو۶۔اسے حرام کہنے والے پر نکیر ہو۷۔بتایا گیا ہو کہ اسے ہمارے لیے بنایا یا پیدا کیا۸۔اگلوں کے فعل کا بیان ہو اور اس پر کوئی مذمت نہ ہو۔

اگر اگلوں کا فعل بتانے کے ساتھ اس پر مدح بھی آئی ہو تو یہ فعل کے وجوباً یا استحباباً مشروع ہونے کی دلیل ہے۔انتهیٰ كلام الشيخ عز الدين ۔

بعض علما نے فرمایا کہ جواز کبھی سکوت سے بھی مستنبط ہوتا ہے۔

ایک جماعت نے قرآن کے غیر مخلوق ہونے پر اس سے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اٹھارہ جگہ انسان کا ذکر کیا اور فرمایا کہ وہ مخلوق ہے۔اور قرآن کا چون (۵۴) جگہ ذکر فرمایا اور یہ نہ کہا کہ ''وہ مخلوق ہے''۔اور جب انسان اور قرآن دونوں کو یکجا ذکر کیا تو دونوں کا حال الگ الگ رکھا اور یوں فرمایا:

(اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ، خَلَقَ الاِنْسَانَ :الرحمن/۱ )"وہ رحمٰن ہے جس نے قرآن سکھایا۔انسان کو پیدا کیا۔''

## امثال القرآن

ارشاد باری تعالیٰ ہے:(وَلَقَدْ ضَرَبْنَالِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ: الزمر/۲۷) "اور بیشک ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی کہاوت بیان فرمائی کہ کسی طرح انھیں دھیان ہو۔''

دوسرے مقام پر ہے:( وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ : العنکبوت/۴۳ ) "اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان فرماتے ہیں اور انھیں نہیں سمجھتے مگر علم والے۔''

بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ سے تخریج کی کہ انھوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن پانچ وجہوں پر نازل ہوا حلال، حرام، محکم، متشابہ اور امثال تو حلال پر عمل کرو، حرام سے

گریز کرو، محکم کا اتباع کرو، متشابہ پر ایمان رکھو اور امثال سے عبرت حاصل کرو۔

ماوردی نے کہا: قرآن کے امثال کا علم بھی علم القرآن کی ایک عظیم ترین نوع ہے۔ لیکن لوگ اَمثال میں مشغول ہو گئے اور جن چیزوں کے لیے مَثلیں ذکر کی گئی ہیں ان کو نظر انداز کر دیا حالاں کہ مثل، مُمَثَّل لہٗ کے بغیر ایسے ہی ہے جیسے گھوڑا بغیر لگام کے اور اونٹنی بغیر مہار کے۔

ایک صاحب علم نے کہا: امام شافعی رحمہ اللہ نے اس علم کو ان علوم قرآنی سے شمار فرمایا جن سے آگاہی مجتہد کے لیے ضروری ہے۔ وہ فرماتے ہیں: پھر مجتہد کے لیے اللہ کی اطاعت پر دلالت کرنے والی اور اس کی معصیت سے اجتناب کا بیان کرنے والی ان امثال کی معرفت لابدی ہے جو قرآن میں مذکور ہیں۔

شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے قرآن میں تذکیر اور پند و موعظت کے لیے امثال کا بیان فرمایا ہے۔ لہٰذا جو مَثل (کہاوت)، ثواب میں عدم یکسانیت یا کسی عمل کو اکارت کرنے، یا مدح یا ذم یا اسی جیسے کسی اور امر پر مشتمل ہو وہ احکام پر دلیل ہوگی۔

## فصل

امثال القرآن کی دو قسمیں ہیں: [۱] ظاہر و مصرح [۲] خفی و غیر ظاہر جس میں مُمَثَّل کا ذکر نہ ہو۔

اول کی چند مثالیں:

(مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ، صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ، أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ :البقرۃ/۱۷، ۱۸، ۱۹) "ان کی کہاوت اس کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی تو جب اس سے آس پاس سب جگمگا اٹھا، اللہ ان کا نور لے گیا اور انھیں اندھیریوں میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں سوجھتا، بہرے گونگے اندھے، تو وہ پھر آنے والے نہیں یا جیسے آسمان سے اترتا پانی کہ اس میں اندھیریاں ہیں اور گرج اور چمک، اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس رہے ہیں کڑک کے سبب موت کے ڈر سے، اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔"

ان آیات میں منافقین کی دو کہاوتیں بیان فرمائیں، ایک آگ کی اور دوسری بارش کی۔

( أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَابِيًا وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِثْلُهُ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ: الرعد / ۱۷) "اس نے آسمان سے پانی اتارا تو نالے

اپنے لائق بہ نکلے تو پانی کی رو اس پر ابھرے ہوئے جھاگ اٹھالائی، اور جس پر آگ دہکاتے ہیں گہنا، یا اور اسباب بنانے کو، اس سے بھی ویسے ہی جھاگ اٹھتے ہیں، اللہ بتاتا ہے کہ حق اور باطل کی یہی مثال ہے، تو جھاگ تو پھک کر دور ہو جاتا ہے اور وہ جو لوگوں کے کام آئے زمین میں رہتا ہے۔"

ابن ابی حاتم نے بطریق علی، حضرت ابن عباس سے تخریج کی: آپ نے فرمایا: یہ ایک مثل ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی، دلوں نے اس سے اپنے یقین اور شک کے مطابق اپنا اپنا حصہ لیا۔ "فاما الزبد فیذ ھب جفاء" شک ہے۔ اور "واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض" یقین ہے۔ تو جس طرح سونے چاندی کے زیورات کو آگ میں ڈالے جانے کے بعد ان کے خالص حصے کو لے لیا جاتا ہے اور ان کے کھوٹ کو آگ میں چھوڑ دیا جاتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ یقین کو قبول فرمائے گا اور شک کو ترک فرمادے گا۔

ابن ابی حاتم نے ہی عطا سے تخریج کی: انھوں نے کہا: یہ مثل اللہ تعالی نے مومن و کافر کے لیے بیان فرمائی ہے۔

انھوں نے ہی قتادہ سے تخریج کی: قتادہ نے کہا: اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک مثل میں تین مثلیں، بیان فرمائی ہیں۔ فرماتا ہے: جس طرح جھاگ پانی سے چھنٹ کر پھک ہو جاتا ہے پھر نہ تو وہ قابل انتفاع رہ جاتا ہے اور نہ ہی اس کی برکت کی کوئی آس رہ جاتی ہے اسی طرح باطل، باطل پرستوں سے چھنٹ کر الگ ہو جاتا ہے۔ اور جس طرح پانی جب زمین میں ٹھہر کر باقی رہتا ہے تو اس سے زمین زرخیز ہو جاتی ہے، اس کی برکت بڑھ جاتی ہے اور وہ اپنے پیڑ پودے، لہلہاتی فصلیں اور ہری بھری گھاسیں اگاتی ہے اور جس طرح سونا چاندی کو جب آگ میں ڈال دیا جاتا ہے تو ان کا کھوٹ زائل ہو جاتا ہے اور خالص سونا چاندی باقی رہ جاتے ہیں اسی طرح حق، اہل حق کے لیے باقی رہتا ہے۔ اور جس طرح سونے کا کھوٹ آگ میں ڈالے جانے کے وقت اس سے زائل ہو جاتا ہے اسی طرح باطل، اہل باطل سے چھنٹ کر زائل ہو جاتا ہے۔

(وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا : الاعراف/ ۵۸) "اور جو اچھی زمین ہے اس کا سبزہ اللہ کے حکم سے نکلتا ہے اور جو خراب ہے اس میں نہیں نکلتا مگر تھوڑا بمشکل۔"

ابن ابی حاتم نے بطریق علی، حضرت ابن عباس سے تخریج کی: آپ نے فرمایا: اللہ تعالی نے یہ مثل "والبلد الطیب" مومن کے لیے بیان فرمائی ہے۔ فرماتا ہے: جس طرح اچھی زمین کا پھل اچھا ہوتا ہے اسی طرح مومن بھی اچھا اور اس کا عمل بھی اچھا ہوتا ہے۔ اور "الذی خبث" کافر کے لیے مثل

ہے تو جس طرح زمین شور و نمکین اچھی نہیں ہوتی اسی طرح نہ تو کافر اچھا ہوتا ہے نہ اس کا عمل ہی۔

(اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ فَاَصَابَهَا اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ : البقرة/٢٦٦) "کیا تم میں کوئی اسے پسند رکھے گا کہ اس کے پاس ایک باغ ہو کھجوروں اور انگوروں کا جس کے نیچے ندیاں بہیں، اس کے لیے اس میں ہر قسم کے پھلوں سے ہو اور اسے بڑھاپا آیا اور اس کے ناتواں بچے ہیں تو آیا اس پر ایک بگولا جس میں آگ تھی تو جل گیا۔"

امام بخاری نے حضرت ابن عباس سے تخریج کی: انھوں نے کہا کہ حضرت عمر بن خطاب نے ایک دن اصحاب نبی صلی اللہ تعالی علیہ وسلم سے پوچھا کہ آیت کریمہ "ایود احدکم ان تکون له جنة من نخیل و اعناب" کس کے بارے میں نازل ہوئی؟۔ انھوں نے جواب دیا اللہ ہی خوب جاننے والا ہے۔ حضرت عمر کو ایسے جواب پر غصہ آ گیا اور فرمایا: یہ کہو کہ ہم جانتے ہیں یا ہم نہیں جانتے۔ ابن عباس نے کہا: میرے دل میں اس سے متعلق ایک بات ہے۔ اس پر حضرت عمر نے فرمایا: میرے برادر زادے! تم جواب دو اور خود کو حقیر مت تصور کرو۔ ابن عباس نے کہا: اس آیت میں ایک عمل کی مثل بیان کی گئی ہے۔ حضرت عمر نے کہا: وہ عمل کیا ہے؟ حضرت ابن عباس نے کہا: یہ ایک ایسے صاحب دولت و ثروت شخص کے لیے مثل ہے جو طاعت خداوندی پر عمل پیرا ہو، بعد ازاں اللہ تعالی نے اس کے پاس شیطان بھیج دیا جس سے وہ معاصی اور گناہوں میں لگ گیا یہاں تک کہ اپنے نیک اعمال ضائع و برباد کر ڈالے۔

**امثال القرآن کی قسم دوم: امثال خفیہ۔**

ماوردی نے کہا: میں نے ابواسحٰق ابراہیم بن مضارب بن ابراہیم سے سنا وہ کہتے ہیں، میں نے اپنے والد سے سنا، وہ کہتے ہیں کہ میں نے حسن بن فضل سے پوچھا: آپ عرب وعجم کی مثلیں قرآن سے نکالتے رہتے ہیں۔ بتائیے کہ یہ مثل "خَيْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَاطُهَا" "امور میں بہتر وہ ہیں جو درمیانی ہوں" قرآن میں آپ کو ملتی ہے؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں! یہ مثل چار جگہوں میں ملتی ہے:

[١] (لَا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ : البقرة/٦٨)" (گائے) نہ بوڑھی ہو اور نہ اوسر بلکہ ان دونوں کے بیچ میں (ہو)۔"

[٢] (وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا :الفرقان/٦٧) "اور وہ کہ جب خرچ کریں نہ حد سے بڑھیں اور نہ تنگی کریں اور ان دونوں کے بیچ اعتدال پر رہیں۔"

[٣] ( وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا

مَّحْسُوْرًا : الاسراء/ ۲۹)" اور اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ اسے پورا کھول دے کہ تو بیٹھ رہے ملامت کیا ہوا، تھکا ہوا۔"

[۴] (وَلَا تَجْهَرْ بِصَلٰوتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهٖ وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا: الاسراء / ۱۱۰) "اور اپنی نماز نہ بہت آواز سے پڑھو، نہ بالکل آہستہ اور ان دونوں کے بیچ میں راستہ چاہو۔"

میں نے پھر پوچھا کیا آپ کتاب اللہ میں "مَنْ جَهِلَ شَيْئًا عَادَاهُ" [۱] کو پاتے ہیں؟ انھوں نے کہا ہاں! یہ دو جگہوں میں ہے:

[۱] (بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ: یونس/۳۹) "بلکہ اسے جھٹلایا جس کے علم پر قابو نہ پایا۔"

[۲] (وَاِذَا لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَا اِفْكٌ قَدِيْمٌ :الاحقاف/۱۱)" اور جب انھیں اس کی ہدایت نہ ہوئی تو اب کہیں گے کہ یہ پرانا بہتان ہے۔"

میں نے پھر سوال کیا: کیا "اِحْذَرْ شَرَّ مَنْ اَحْسَنْتَ اِلَيْهِ" [۲] کتاب اللہ میں موجود ہے؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں! اس آیت کریمہ میں (وَمَا نَقَمُوْا اِلَّا اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ: التوبۃ/ ۷۴)" اور انھیں کیا برا لگا یہی نا کہ اللہ و رسول نے انھیں اپنے فضل سے غنی کر دیا۔"

میں نے پھر دریافت کیا: "لَيْسَ الْخَبَرُ كَالْعِيَانِ" [۳] کے بارے میں بتایئے؟ انھوں نے جواب دیا یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: (قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ: البقرۃ/ ۲۶۰) "فرمایا: (ابراہیم) کیا تجھے یقین نہیں؟ عرض کی یقین کیوں نہیں مگر یہ چاہتا ہوں کہ میرے دل کو قرار آ جائے۔"

میں نے پھر پوچھا " فِي الْحَرَكَاتِ الْبَرَكَاتُ" (حرکت میں برکت ہے) کے بارے میں بتایئے؟ انھوں نے کہا یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: (وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً: النساء/ .... ۱) "اور جو اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑ کر نکلے گا وہ زمین میں بہت جگہ اور گنجائش پائے گا۔"

میں نے پھر سوال کیا "كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ" (جیسا کرو گے ویسا بھرو گے) کتاب اللہ میں ہے؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں اس آیت کریمہ میں (مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ:النساء/ ۱۲۳) "جو برائی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا۔"

میں نے پھر دریافت کیا کہ کیا عربوں کا یہ قول "حِيْنَ تَقْلِيْ تَدْرِيْ" (جب بھنو گے تو

---

[۱] آدمی اس چیز کا دشمن ہو جاتا ہے جسے نہیں جانتا۔ [۲] اس کے شر سے چوکنا رہو جس کے ساتھ تم نے احسان کیا ہے۔ [۳] شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ (سنا ہوا، دیکھے ہوئے کی طرح نہیں ہوتا۔)

جانو گے) اس میں ہے؟ انھوں نے کہا یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: (وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا: الفرقان/٤٢) ''اور جب وہ آخرت میں عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے تو اب انھیں یقین ہو جائے گا کہ کون گمراہ تھا۔''

میں نے پھر پوچھا کیا ان کا یہ قول " لَا يُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ مَرَّتَيْنِ " [۱] قرآن میں ہے؟ انھوں کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے (هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَا اَمِنْتُكُمْ عَلٰى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ :یوسف/٦٤)"(حضرت یعقوب) نے کہا کیا اس (بنیامین) کے بارے میں تم پر ویسا ہی اعتبار کرلوں جیسا اس کے بھائی (یوسف) کے بارے میں کیا تھا۔''

میں نے پھر سوال کیا: کیا "مَنْ اَعَانَ ظَالِمًا سُلِّطَ عَلَيْهِ "[۲] قرآن میں ہے؟ انھوں نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے (كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ :الحج/٤) "جس (سرکش شیطان) پر لکھ دیا گیا ہے کہ جو اس کی دوستی کرے گا تو یہ ضرور اسے گمراہ کر دے گا اور اسے عذاب دوزخ کی راہ بتائے گا۔''

میں نے پھر دریافت کیا: عربوں کے قول "لَا تَلِدُ الْحَيَّةُ اِلَّا الْحَيَّةَ' [سانپ کا بچہ سنپولیا] کے بارے میں بتایئے؟ انھوں نے کہا: یہ اس فرمان خداوندی میں ہے (وَلَا يَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا: نوح / ٢٧) "اور ان کی اولاد ہوگی تو وہ بھی نہ ہوگی مگر بدکار، بڑی ناشکر۔''

میرا پھر سوال تھا: کیا آپ کو یہ مثل "لِلْحِيْطَانِ اٰذَانٌ" (دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں) قرآن میں ملی؟ انھوں نے کہا: ہاں: اس آیت کریمہ میں (وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ: التوبة/٤٧)" اور تم میں ان کے جاسوس موجود ہیں۔''

میں نے پھر دریافت کیا: کیا قرآن میں "اَلْجَاهِلُ مَرْزُوْقٌ وَالْعَالِمُ مَحْرُوْمٌ" ہے۔ (جاہل کو روزی ملے اور عالم کو محرومی) انھوں نے کہا: ہاں: اس آیت کریمہ میں (مَنْ كَانَ فِي الضَّلَالَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا: مریم/ ٧٥) "جو گمراہی میں ہو تو اسے رحمٰن خوب ڈھیل دے۔''

میرا آخری سوال تھا: کیا قرآن میں "اَلْحَلَالُ لَا يَاتِيْكَ اِلَّا قُوْتًا ، وَالْحَرَامُ لَا يَاتِيْكَ اِلَّا جُزَافًا"[۳] ہے؟ انھوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے (اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ : الاعراف/١٦٣) "جب ہفتے کے دن ان کی مچھلیاں پانی پر تیرتی ان کے سامنے آتیں اور جو دن ہفتے کا نہ ہوتا نہ آتیں۔''

---

[۱] مومن ایک بل سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔ [۲] جو کسی ظالم کی مدد کرتا ہے وہ ظالم اس پر مسلط کردیا جاتا ہے۔ [۳] حلال روزی تمھیں اتنی ہی ملتی ہے جس سے تمھاری گذر بسر ہو جائے اور حرام روزی بے اندازہ ملتی ہے۔

## فائدہ

جعفر بن شمس الخلافہ نے کتاب الآداب میں ایک باب قرآن کے ان الفاظ سے متعلق رکھا ہے جو مثل کے قائم مقام ہیں۔ علم بدیع میں اس نوع کو "اِرْسَالُ الْمَثَل" کہا جاتا ہے۔

انھوں نے قرآن سے اس کی بہت سی مثالیں جمع کی ہیں۔ چند یہاں ذکر کی جاتی ہیں:

۱۔ (لَيْسَ لَهَامِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ :النجم/۵۸)"اللہ کے سوا اس کا کوئی کھولنے والا نہیں۔"یعنی اس کو وہی ظاہر فرمائے گا۔

۲۔( لَنْ تَنَالُواالْبِرَّحَتّٰى تُنفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ: ال عمران/۹۲)"تم ہرگز بھلائی کو نہ پہنچو گے جب تک راہ خدا میں اپنی پیاری چیز نہ خرچ کرو۔"

۳۔ (الْاٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ:یوسف/ ۵۱)"اب اصلی بات کھل گئی۔"

۴۔ (وَضَرَبَ لَنَامَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهٗ:یٰس/۷۸)"اور ہمارے لیے کہاوت کہتا ہے اور اپنی پیدائش بھول گیا۔"

۵۔ (ذٰلِكَ بِمَاقَدَّمَتْ يَدَاكَ:الحج/۱۰)" یہ اس کا بدلہ ہے جو تیرے ہاتھوں نے آگے بھیجا۔"

۶۔ (قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ:یوسف/۴۱) "حکم ہو چکا اس بات کا جس کا تم سوال کرتے تھے۔"

۷۔(اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ:ھود/۸۱)"کیا صبح قریب نہیں۔"

۸۔(وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ:سبا/۵۴)"اور روک کر دی گئی ان میں اور اس میں جسے وہ چاہتے ہیں۔"

۹۔ (وَلِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ:الانعام/۶۷)" ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔"

۱۰۔(وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ:فاطر/"اور برا داؤں اپنے چلنے والے ہی پر پڑتا ہے۔"

۱۱۔(قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ:الاسراء/۸۴)"تم فرماؤ سب اپنے طریقے پر کام کرتے ہیں۔"

۱۲۔(وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ :البقرۃ/۲۱۶)"اور قریب ہے کہ کوئی بات تمھیں بری لگے اور وہ تمھارے حق میں بہتر ہو۔"

۱۳۔(كُلُّ نَفْسٍ بِمَاكَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ: المدثر/۳۸) "ہر جان اپنی کرنی میں گروی ہے۔"

۱۴۔ (مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ:المائدۃ/۹۹)"رسول پر نہیں مگر پہنچانا۔"

۱۵۔(مَاعَلَی الْمُحْسِنِیْنَ مِنْ سَبِیْلٍ :التوبة/٩١)"نیکی والوں پر کوئی راہ نہیں۔"
۱۶۔(هَلْ جَزَاءُ الِاحْسَانِ اِلَّاالِاحْسَانُ :الرحمن/٦٠)"نیکی کا بدلہ نیکی ہی ہے۔"
۱۷۔(كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً:البقرة/٢٤٩)"بارہا کم جماعت غالب آئی ہے زیادہ گروہ پر۔"
۱۸۔( اٰلْاٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ :يونس/٩١)"(جبریل نے فرعون سے کہا)اے فرعون! اب ایمان لا رہا ہے حالاں کہ اس سے پہلے تو نے نافرمانی کی۔"
۱۹۔(تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى :الحشر/١٤)"تم انھیں ایک جتھا سمجھو گے اور ان کے دل الگ الگ ہیں۔"
۲۰۔(وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ :فاطر/١٤)"اور تجھے کوئی نہ بتائے گا اس بتانے والے کی طرح۔"
۲۱۔(كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ:المؤمنون/٥٣،الروم/٣٢)"ہر گروہ جو اس کے پاس ہے اس پر خوش ہے۔"
۲۲۔(وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ:الانفال/٢٣)"اور اگر اللہ ان میں کچھ بھلائی جانتا تو انھیں سنا دیتا۔"
۲۳۔(وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ:سبأ/١٣)"اور میرے بندوں میں کم ہیں شکر والے۔"
۲۴۔(لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا :البقرة/٢٨٦) "اللہ کسی جان پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت بھر۔"
۲۵۔(قُلْ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ:المائدة/١٠٠)"تم فرما دو کہ گندہ اور ستھرا برابر نہیں۔"
۲۶۔(ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ:الروم/٤١) "خشکی اور تری میں بگاڑ رونما ہو گیا۔"
۲۷۔(ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ:الحج/٧٣) "کتنا کمزور ہے چاہنے والا اور وہ جس کو چاہا۔"
۲۸۔(لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ:الصافات/٦١)"ایسی ہی بات کے لیے کامیوں کو کام کرنا چاہیے۔"
۲۹۔(وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ:ص/٢٤) "اور وہ بہت تھوڑے ہیں۔"
۳۰۔(فَاعْتَبِرُوْا يٰاُولِي الْاَبْصَارِ:الحشر/٢)"تو عبرت لو اے نگاہ والو۔"

## اقسام قرآن

ابن القیم (م:۷۵۱ھ) نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب ایک جلد میں تصنیف کی ہے جس کا نام انھوں نے "التبیان فی اقسام القرآن" رکھا ہے۔

قسم کا مقصد خبر کی تاکید وتوثیق ہوتا ہے یہاں تک کہ علما نے (وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ: المنافقون/ ۱[۱]) جیسی آیت کو بھی قسم قرار دیا ہے۔ کیوں کہ اگر چہ اس میں گواہی کی خبر دی گئی ہے مگر چوں کہ یہ خبر کی تاکید کے لیے آئی ہے اس لیے اسے قسم کا نام دیا گیا۔

رب کے قسم یاد کرنے پر یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ اس کا فائدہ کیا ہے؟ اگر یہ قسم مومن کے لیے ہے تو مومن بغیر قسم کے محض خبر دے دینے پر تصدیق کر دے گا اور اگر یہ کافر کے لیے ہے تو اس کے لیے قسم مفید نہیں۔

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ قرآن عرب کی زبان میں نازل ہوا اور ان کی عادت ہے کہ جب وہ کسی بات کی تاکید کرنا چاہتے ہیں تو اس پر قسم کھایا کرتے ہیں۔

امام ابو القاسم قشیری نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے حجت کے کامل ہونے اور اس کی تاکید کرنے کے لیے قسم کا ذکر فرمایا۔ اس لیے کہ کوئی حَکَم فیصلہ دو ہی چیزوں سے کرتا ہے، شہادت سے یا قسم سے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں دونوں نوعیں ذکر فرما دیں تا کہ منکرین کے لیے جائے حجت باقی نہ رہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ( شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ: ال عمران/۱۸) "اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور عالموں نے۔" (اس آیت میں شہادت کا ذکر ہے) دوسری جگہ ارشاد ہے: (قُلْ اِیْ وَرَبِّیْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ: یونس/۵۳) "تم فرما دو ہاں میرے رب کی قسم بے شک وہ ضرور حق ہے۔" (اس آیت میں قسم کا ذکر ہے)

ایک اعرابی کے متعلق منقول ہے کہ اس نے جب یہ آیت سنی (وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ، فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ: الذاریات/ ۲۲، ۲۳[۲]) تو زور سے چلا کر بولا "کس نے رب جلیل کو غضبناک کیا کہ اس نے قسم ذکر فرمائی۔"

قسم کسی باعظمت چیز ہی کی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کے اندر سات جگہوں پر اپنی قسم ذکر فرمائی ہے:

[۱] مندرجہ بالا آیت کریمہ یعنی (فورب السماء والارض انه لحق)، اور [۲] (قُلْ اِیْ وَرَبِّیْ) [۳] (قُلْ بَلٰى وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ: التغابن/۷) "تم فرماؤ کیوں نہیں میرے رب کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے۔" [۴] (فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ: مریم/۶۸) "تو تمھارے رب کی قسم ہم انھیں اور شیطانوں سب کو گھیر لائیں گے۔" [۵] (فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ: الحجر/۹۲) "تو تمھارے رب کی قسم ہم ضرور ان سب سے پوچھیں گے۔" [۶] (فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ:

---

[۱] اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔ [۲] اور آسمان میں تمھارا رزق ہے اور جو تمھیں وعدہ دیا جاتا ہے تو آسمان وزمین کے رب کی قسم بیشک یہ قرآن حق ہے۔

النساء/٦٥)"تو اے محبوب تمھارے رب کی قسم وہ مسلمان نہ ہوں گے۔" [۷] (فَلَا اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ: المعارج/٤٠] "تو مجھے قسم ہے اس کی جو سب پوربوں پچھموں کا مالک ہے۔"

اس کے علاوہ باقی تمام قسمیں اس کی مخلوقات کی ہیں:

جیسے [وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ، وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ، وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ،لَقَدْ خَلَقْنَاالْاِ نْسٰنَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ: التین/١، ٢، ٣، ٤] "انجیر کی قسم اور زیتون اور طور سینا اور اس امان والے شہر کی قسم بے شک ہم نے آدمی کو اچھی صورت پر بنایا۔" [وَالصّٰفّٰتِ صَفًّا،فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا،فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا، اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ. الصافات/١، ٢، ٣، ٤] "قسم ان کی کہ باقاعدہ صف باندھیں پھر ان کی کہ جھڑک کر چلائیں پھر ان جماعتوں کی کہ قرآن پڑھیں بے شک تمھارا معبود ضرور ایک ہے۔" [وَالشَّمْسِ وَ ضُحٰهَا، وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا، وَالنَّهَارِ، اِذَا جَلّٰهَا، وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا، وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنٰهَا، وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا، وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا، فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا، قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (الشمس/١، ٢، ٣، ٤، ٥، ٦، ٧، ٨] "سورج اور اس کی روشنی کی قسم اور چاند کی جب اس کے پیچھے آئے اور دن کی جب اسے چمکائے اور رات کی جب اسے چھپائے اور آسمان اور اس کے بنانے والے کی قسم اور زمین اور اس کے پھیلانے والے کی قسم اور جان کی اور اس کی جس نے اسے ٹھیک بنایا پھر اس کی بدکاری اور اس کی پرہیز گاری دل میں ڈالی بے شک مراد کو پہنچا جس نے اسے ستھرا کیا۔" [وَالَّيْلِ اِذَايَغْشٰى، وَالنَّهَارِ اِذَاتَجَلّٰى، وَمَاخَلَقَ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰى، اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى: الیل/١، ٢، ٣، ٤] "رات کی قسم جب چھا جائے اور دن کی جب چمکے اور اس کی جس نے نر و مادہ بنائے بیشک تمھاری کوشش مختلف ہے۔" [وَالضُّحٰى، وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ، مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى: الضحیٰ/ ١، ٢، ٣] "چاشت کی قسم اور رات کی جب پردہ ڈالے کہ تمھیں تمھارے رب نے نہ چھوڑا اور نہ مکروہ جانا۔" [ فَلَا اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ، الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ،وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ، اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ: التکویر/١٥، ١٦، ١٧، ١٨، ١٩] "تو قسم ہے ان (ستاروں) کی جو الٹے پھریں، سیدھے چلیں، تھم رہیں اور رات کی جب پیٹھ دے اور صبح کی جب دم لے، بیشک یہ عزت والے رسول کا پڑھنا ہے"۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے بندوں کی قسم کیوں ذکر فرمائی حالاں کہ غیر اللہ کی قسم کھانے سے نہی وارد ہے؟

اس کا جواب چند وجہوں پر ہے:

[۱] جہاں غیر اللہ کی قسم ہے وہاں مضاف محذوف ہے۔ مثلاً " وَرَبِّ التِّيْنِ " (انجیر کے رب کی قسم) "وَرَبِّ الشَّمْسِ " (آفتاب کے رب کی قسم)۔ اسی طرح باقی کو بھی سمجھیں۔

[۲] عرب ان چیزوں کو عظیم خیال کرتے اور ان کی قسم کھاتے تھے اس لیے قرآن بھی ان کے جانے پہچانے طریقے پر نازل ہوا۔

[۳] قسمیں انھیں چیزوں کی کھائی جاتی ہیں جن کی قسم کھانے والا تعظیم کرتا یا جنھیں عظیم خیال کرتا ہے اور وہ اس سے بلند مرتبہ ہوتی ہیں مگر اللہ سے برتر کوئی چیز نہیں اس لیے اس نے کبھی اپنی ذات کی قسم ذکر فرمائی، کبھی اپنی بنائی ہوئی چیزوں کی قسم یاد فرمائی کیوں کہ یہ چیزیں اپنے پیدا کرنے والے اور بنانے والے پر دلالت کرتی ہیں۔[۱]

ابن ابی حاتم نے حسن بصری سے تخریج کی، انھوں نے کہا کہ اللہ اپنی مخلوق میں جس کی قسم چاہے بیان کرے۔ کسی بندے کو اللہ کے علاوہ کسی کی قسم کھانی روا نہیں ہے۔

علما نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد (لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ: الحجر/ ۷۲) میں نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قسم یاد فرمائی ہے تاکہ لوگوں کو رسول کی عظمت اور مرتبہ ومقام سے آگاہی ہو جائے جو اللہ کے نزدیک انھیں حاصل ہے۔

ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس سے تخریج کی، آپ نے فرمایا: اللہ تعالی نے اپنی بارگاہ میں محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے زیادہ عزت وکرامت والی کوئی جان نہ پیدا فرمائی، نہ عدم سے وجود بخشا اور نہ نیست سے ہست کیا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ خدا نے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کی حیات کی قسم یاد نہ فرمائی۔ ارشاد ہے: (لعمرك انهم لفی سكرتهم يعمهون: الحجر/۷۲) "اے محبوب تمھاری جان کی قسم بے شک وہ اپنے نشہ میں بھٹک رہے ہیں۔"

کبھی رب تعالیٰ کی قسم ان اصول ایمان پر ہوتی ہے جن کی معرفت مخلوق پر واجب ہے۔

[۱] کبھی توحید پر قسم [۲] کبھی قرآن کے حق ہونے پر قسم [۳] کبھی رسول کے حق ہونے پر قسم [۴] کبھی جزا اور وعدہ ووعید پر قسم [۵] کبھی انسان کی حالت پر قسم۔

اول: جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: (وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ، فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا، فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا، اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ: الصافات/ ۱، ۲، ۳) "قسم ان کی کہ باقاعدہ صف باندھیں، پھر ان کی کہ جھڑک کر چلائیں، پھر جماعتوں کی کہ قرآن پڑھیں، بے شک تمھارا معبود ضرور ایک ہے۔"

دوم: جیسے: (فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ، وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ، اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ: الواقعة/ ۷۵) "تو مجھے قسم ہے ان جگہوں کی جہاں تارے ڈوبتے ہیں اور تم سمجھو تو یہ بڑی قسم ہے، بے شک یہ عزت والا قرآن ہے۔"

سوم: جیسے: (يٰسٓ ، وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ، اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ: يس/ ۱، ۲، ۳) "حکمت والے قرآن کی قسم بے شک تم سیدھی راہ پر بھیجے گئے ہو۔"

---

[۱] بعض علمائے محققین نے فرمایا کہ قرآن میں کسی مخلوق کی قسم اس کے شرف وعزت کے اظہار کے لیے ہے۔ مترجم

چہارم: جیسے:(وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ، فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا، فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا، فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا،اِنَّمَاتُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ، وَاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ:الذاریات/ ۱،۲، ۳، ۴،۵،۶) ”قسم ان (ہواؤں) کی جو بکھیر کر اڑانے والیاں، پھر بوجھ اٹھانے والیاں (ہیں)[یعنی وہ گھٹائیں اور بدلیاں جو بارش کا پانی اٹھاتی ہیں۔] پھر نرم چلنے والیاں (ہیں)[یعنی وہ کشتیاں جو پانی میں بسہولت چلتی ہیں۔] پھر حکم سے بانٹنے والیاں (ہیں)[یعنی فرشتوں کی وہ جماعتیں جو بحکم الٰہی بارش ورزق وغیرہ تقسیم کرتی ہیں اور جن کو اللہ نے مدبرات الامر کیا ہے اور عالم میں تدبیر وتصرف کا اختیار عطا فرمایا ہے۔] بے شک جس بات (جزا) کا تمھیں وعدہ دیا جاتا ہے ضرور سچ ہے اور بے شک انصاف (نیکی بدی کا بدلہ) ضرور ہونا (ہے)۔ اور جیسے: (وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا، فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا، وَالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا، فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا، فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا،عُذْرًا اَوْ نُذْرًا، اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ:المرسلات/ ۱،۲، ۳، ۴، ۵،۶،۷) ”قسم ان کی جو بھیجی جاتی ہیں لگاتار، پھر زور سے جھونکا دینے والیاں، پھر ابھار کر اٹھانے والیاں، پھر حق ناحق کو خوب جدا کرنے والیاں (ہیں)، پھر ان کی قسم جو ذکر کا القا کرتی ہیں حجت تمام کرنے یا ڈرانے کو، بے شک جس بات کا تم وعدہ دیے جاتے ہو، ضرور ہونی ہے۔“ یعنی بعث اور عذاب اور قیامت ضرور آئے گی۔

بعض مفسرین کے نزدیک اس مثال میں مذکور پانچوں صفتیں ہواؤں کی، بعض کے نزدیک ملائکہ کی، بعض کے نزدیک آیات قرآنی کی اور بعض کے نزدیک نفوس کاملہ کی ہیں۔[تفصیل خزائن العرفان میں دیکھیں]

پنجم: جیسے:(وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ، وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ،وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰۤى اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى :اللیل/۱،۲،۳،۴)” رات کی قسم جب چھائے، اور دن کی جب چمکے، اور اس کی جس نے نر و مادہ بنائے، بے شک تمھاری کوشش مختلف ہے۔“ (وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا، فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا،فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا،فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا، فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا، اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ: ۱،۲،۳،۴،۵،۶) ”قسم ان (غازیوں کے گھوڑوں) کی جو دوڑتے ہیں سینہ سے آواز نکلتی ہوئی، پھر پتھروں سے آگ نکالتے ہیں سم مار کر، پھر صبح ہوتے تاراج کرتے ہیں (دشمن کو) پھر اس وقت غبار اڑاتے ہیں، پھر دشمن کے بیچ لشکر میں جاتے ہیں۔ بے شک آدمی اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔“(وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ:العصر/۱)”اس زمانۂ محبوب کی قسم بے شک آدمی ضرور نقصان میں ہے۔“ (وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ، وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ، وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ، لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ:التین/۱،۲،۳،۴) ”انجیر کی قسم اور زیتون اور طور سینا اور اس امان والے شہر کی قسم بے شک ہم نے آدمی کو اچھی صورت پر بنایا۔“ (لَا

أُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ، وَأَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ، وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ، لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ: البلد/۱، ۲، ۳، ٤) "مجھے اس شہر (مکہ) کی قسم کہ اے محبوب تم اس شہر میں تشریف فرما ہو، اور تمھارے باپ ابراہیم کی قسم اور اس کی اولاد کی کہ تم ہو، بے شک ہم نے آدمی کو مشقت میں رہتا پیدا کیا۔"

## جدل قرآن

قرآن عظیم، براہین وادلہ کی تمام انواع پر مشتمل ہے۔ اور عقلی و سمعی معلومات کی کلیات پر قائم کوئی بھی برہان، دلیل اور تقسیم وتحذیر ایسی نہیں ہے جو کتاب الٰہی کے حیطۂ کلام سے خارج ہو۔ لیکن قرآن نے اسے عربوں کی عادت کے مطابق ذکر فرمایا ہے اور متکلمین کے دقیق طرق سے صرف نظر کیا ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں:

پہلی وجہ یہ ہے کہ قرآن عرب کے انداز بحث وخطاب پر نازل ہوا ہے، اس لیے اس میں وہی طرز استدلال ہے جو عام محاورات عرب میں جاری تھا۔ ارشاد ربانی ہے:(وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ :ابراھیم/٤) "اور ہم نے ہر رسول کو اس کی قوم ہی کی زبان میں بھیجا کہ وہ انھیں صاف بتائے۔"

دوسری وجہ یہ ہے کہ دقیق حجت ومباحثہ کی طرف وہ مائل ہوتا ہے جو واضح اور صاف اسلوب کلام میں حجت قائم کرنے سے عاجز ہوتا ہے اس لیے کہ جو شخص اپنی بات ایسے واضح انداز میں سمجھا سکتا ہے جسے اکثر لوگ سمجھ لیں وہ ایسا غامض اور دقیق انداز نہ اختیار کرے گا جسے کم سے کم تر لوگ سمجھ پائیں، وہ صاف باتیں چھوڑ کر چیستاں نہ بولے گا اس لیے رب تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے سامنے حجت ودلیل قائم کرتے ہوئے وہ طرز خطاب رکھا ہے جو زیادہ واضح اور روشن صورت میں ہے۔ تا کہ اس روشن خطاب کو سمجھ کر عوام اس کے قائل ہوں اور ان پر حجت لازم ہو اور خواص اس کلام کی تہوں سے بہت سے دیگر معانی بھی اخذ کرلیں جن تک اہل خطابت اور عام لوگوں کی رسائی نہیں ہوتی۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ خدائے بزرگ وبرتر نے "معاد جسمانی" پر چند طریقوں سے استدلال فرمایا ہے۔

[۱] پہلی بار بنانے پر دوسری بار بنانے کا قیاس۔ ارشاد ہے :(كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ: الاعراف/۲۹) "جیسے اس نے تمھارا آغاز کیا ویسے ہی پلٹو گے۔"

(كَمَا بَدَاْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ:الانبیاء/١٠٤) "جیسے پہلے اسے (انسان کو) بنایا تھا ویسے ہی پھر کردیں گے۔" (اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ:قٓ/١٥) "تو کیا ہم پہلی بار بنا کر تھک گئے (جو دوبارہ پیدا کرنا ہمیں دشوار ہو۔ خزائن العرفان)

[۲] اعادہ (دوسری بار بنانے) کا بطریق اولیٰ آسمانوں اور زمین کی پیدائش پر قیاس۔ ارشاد ہوتا ہے: (اَوَ لَیۡسَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ: یٰس/۸۱) "اور کیا وہ جس نے آسمان اور زمین بنائے ان جیسے اور نہیں بنا سکتا۔" یعنی جب اللہ بڑی لمبی چوڑی زمین کو اور لا محدود وسعتوں والے آسمان کو پیدا کرنے پر قادر ہے تو ان دونوں کی بہ نسبت انتہائی حقیر اور معمولی انسان کو دوبارہ پیدا کرنے پر بدرجۂ اولیٰ قادر ہے۔

[۳] زمین کی موت کے بعد بارش اور نباتات سے اسے زندہ کر دینے پر اعادہ کا قیاس۔ جیسے: (حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتۡ سَحَابًا ثِقَالًا سُقۡنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنۡزَلۡنَا بِهِ الۡمَآءَ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ کَذٰلِکَ نُخۡرِجُ الۡمَوۡتٰی: الاعراف/۵۶) "یہاں تک کہ جب اٹھالائیں (ہوائیں) بھاری بادل، ہم نے اسے کسی مردہ شہر (وسیع وفراخ زمین) کی طرف چلایا، پھر اس نے پانی اتارا، پھر اس سے طرح طرح کے پھل نکالے، اسی طرح ہم مردوں کو نکالیں گے۔" (وَیُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا، وَکَذٰلِکَ تُخۡرَجُوۡنَ: الروم/ ۱۹) "اور زمین کو جلاتا ہے اس کے مرنے کے بعد، اور یوں ہی تم نکالے جاؤ گے۔" (وَاِنۡ کُلٌّ لَّمَّا جَمِیۡعٌ لَّدَیۡنَا مُحۡضَرُوۡنَ، وَاٰیَةٌ لَّهُمُ الۡاَرۡضُ الۡمَیۡتَةُ اَحۡیَیۡنٰهَا وَاَخۡرَجۡنَا مِنۡهَا حَبًّا فَمِنۡهُ یَاۡکُلُوۡنَ، وَجَعَلۡنَا فِیۡهَا جَنّٰتٍ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ وَّفَجَّرۡنَا فِیۡهَا مِنَ الۡعُیُوۡنِ: یٰس/۳۲، ۳۳، ۳۴) "اور جتنے بھی ہیں سب کے سب ہمارے حضور حاضر لائے جائیں گے اور ان کے لیے (مردہ کو زندہ کرنے پر) ایک نشانی مردہ زمین ہے۔ ہم نے اسے زندہ کیا اور پھر اس سے اناج پیدا کیا تو اس میں سے کھاتے ہیں، اور ہم نے اس میں باغ بنائے کھجوروں اور انگوروں کے، اور ہم نے اس میں کچھ چشمے بہائے۔"

(وَنَزَّلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَکًا فَاَنۡۢبَتۡنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الۡحَصِیۡدِ، وَالنَّخۡلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلۡعٌ نَّضِیۡدٌ رِّزۡقًا لِّلۡعِبَادِ وَاَحۡیَیۡنَا بِهٖ بَلۡدَةً مَّیۡتًا کَذٰلِکَ الۡخُرُوۡجُ: قٓ/ ۹، ۱۰، ۱۱) "ہم نے آسمان سے برکت والا پانی اتارا تو اس سے باغ اگائے اور اناج کہ کاٹا جاتا ہے اور کھجور کے لمبے درخت جن کا پکا گابھا بندوں کی روزی کے لیے اور ہم نے اس سے مردہ شہر (وسیع زمین کو) جلایا یوں ہی قبروں سے تمھارا نکلنا ہے۔"

[۴] ہرے بھرے درخت سے آگ نکالنے پر دوبارہ زندگی دینے کا قیاس:

حاکم وغیرہ نے روایت کی کہ ابی بن خلف نے ایک ہڈی لاکر اسے ریزہ ریزہ کر دیا، پھر بولا: کیا اللہ تعالیٰ اسے بوسیدہ اور ریزہ ریزہ ہو جانے کے بعد زندہ فرمادے گا؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ (قُلۡ یُحۡیِیۡهَا الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ: یٰس/۷۹) "تم فرماؤ انھیں (ان ہڈیوں کو) وہ زندہ کرے گا جس نے پہلی بار انھیں بنایا۔"

اس میں یوں استدلال ہے کہ پہلی تخلیق پر قدرت تمہیں تسلیم ہے۔اس لیے کہ وہ واقع بھی ہے اور تمھارے مشاہدے میں بھی ہے تو جو پہلی بار تخلیق پر قادر ہے وہ دوسری بار تخلیق پر بھی یقیناً قادر ہے۔ نشاۃ ثانیہ پر نشاۃ اولیٰ سے دلیل قائم کی گئی اور دونوں میں علت جامع "حدوث" ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے بطور استدلال اپنے قول (الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا: یٰس/۸۰)[1] کا اضافہ فرما کر انتہائی روشن دلیل قائم فرمادی۔

اس آیت کریمہ کے تحت حضرت صدر الافاضل علامہ نعیم الدین صاحب مرادآبادی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

"عرب میں دو درخت ہوتے ہیں جو وہاں کے جنگلوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ایک کا نام مَرخ ہے دوسرے کا عفار۔ان کی خاصیت یہ ہے کہ جب ان کی سبز شاخیں کاٹ کر ایک دوسرے پر رگڑی جائیں تو ان سے آگ نکلتی ہے باوجود یکہ وہ اتنی تر ہوتی ہیں کہ ان سے پانی ٹپکتا ہوتا ہے۔ اس میں قدرت کی کیسی عجیب وغریب نشانی ہے کہ آگ اور پانی دونوں ایک دوسرے کی ضد، ہر ایک، ایک جگہ ایک لکڑی میں موجود، نہ پانی آگ بجھائے، نہ آگ لکڑی کو جلائے۔جس قادر مطلق کی یہ حکمت ہے وہ اگر ایک بدن پر موت کے بعد زندگی وارد کردے تو اس کی قدرت سے کیا عجیب اور اس کو ناممکن کہنا آثار قدرت دیکھ کر جاہلانہ ومعاندانہ انکار کرنا ہے۔[خزائن العرفان)

یہ انتہائی روشن بیان ہے کہ اس میں دوبارہ حیات دینے کو ایک جانی دیکھی روزمرہ پیش آنے والی نظیر دکھا کر مدعا ثابت کیا گیا ہے۔دونوں میں جامع یہ ہے کہ پانی سے تر، ہرے درخت سے آگ نکالنا جب ہوسکتا ہے۔تو فنا شدہ جسم جو پہلے ذی حیات تھا اسے دوبارہ ذی حیات بنانا یقیناً ہوسکتا ہے۔جیسے پانی والی شاخ سے آگ پیدا ہوسکتی ہے ایسے ہی بے جان ذروں میں جان آسکتی ہے۔

اسی قبیل سے صانع عالم کے ایک ہونے پر اس دلالت تمانع سے استدلال بھی ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ کے قول (لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا: الانبیاء/۲۲) میں اشارہ کیا گیا ہے۔کیوں کہ اگر عالم کے دو صانع ہوتے تو دونوں کی تدبیر ایک نظام پر نہ چلتی اور خوبی وعمدگی کے ساتھ اس کا نظم ونسق قائم نہ ہوتا اور دونوں یا دونوں میں سے ایک صانع عاجز ہوتا اس لیے کہ اگر ایک خدا کسی جسم کو زندہ رکھنا اور دوسرا اسے مارنا چاہتا تو یا تو دونوں کے ارادے نافذ ہوجاتے یا نافذ نہ ہوتے۔اگر — اتفاقِ باہمی فرض کرلینے کی تقدیر پر — دونوں کے ارادے نافذ ہوتے تو اس صورت میں تناقض کا تحقق ہوتا کیوں کہ فعلِ احیاوا ماتت (زندہ رکھنے اور مارنے) کا اجزا میں تقسیم ہونا محال ہے۔مثلاً یہ ممکن نہیں کہ ایک ہی جسم پر احیا کے ایک جز کا نفاذ ایک خدا اور اماتت کے ایک جز کا

---

[1] جس نے تمھارے لیے ہرے درخت سے آگ پیدا کی۔

نفاذ دوسرا خدا کرے اور اختلاف باہمی فرض کرنے پر دونوں کے ارادوں کا نفاذ اس لیے نہیں ہوتا کہ اجتماع ضدین ممنوع ہے۔ مثلاً یہ ممکن نہیں کہ کسی جسم پر حیات وممات دونوں ایک ساتھ بیک وقت طاری ہوں ـــــ یا دونوں کے ارادے ایک ساتھ نافذ نہ ہوتے تو یہ دونوں کے عجز کا باعث ہوتا یا کسی ایک کا ارادہ نافذ نہ ہوتا تو یہ اس کے عجز کا سبب ہوتا۔ جب کہ الٰہ عاجز نہیں ہوتا۔

علم الجدل میں متفق علیہ انواع میں سے ایک نوع ''قول بالموجب'' بھی ہے۔

ابن الاصبع نے کہا کہ: قول بالموجب کی حقیقت ہے: کلام خصم کو اس کے مضمون ومقصود سے پھیر دینا۔

اس کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم یہ ہے کہ کلام غیر میں ایک صفت واقع ہو جو ایسی شی سے کنایہ ہو جس کے لیے کوئی حکم ثابت کیا گیا ہو لیکن تم اس صفت کو اس شی کے علاوہ کسی اور شی کے لیے ثابت کردو۔ جیسے ارشاد خداوندی ہے :(وَيَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ: المنافقون/۸) ''(منافقین) کہتے ہیں ہم مدینہ پھر کر گئے تو ضرور جو بڑی عزت والا ہے وہ اس میں سے نکال دے گا اسے جو نہایت ذلت والا ہے اور عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں ہی کے لیے ہے۔''

کلام منافقین میں صفتِ ''اعز'' فریق منافقین سے اور صفت ''اذل'' فریق مومنین سے کنایہ ہے جب کہ مدینہ سے ''مومنین کا اخراج'' انھوں نے اپنے فریق کے لیے ثابت کیا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے دوسرے فریق یعنی اللہ ورسول اور ایمان والوں کے لیے صفت ''عزت'' کو ثابت فرمایا۔ گویا کہا گیا: یہ تو صحیح ہے کہ مدینہ سے اعز، اذل کو ضرور نکال دے گا لیکن ''سب سے زیادہ ذلیل اور نکالے جانے والے وہی ہیں جب کہ اللہ ورسول اور مومنین سب سے زیادہ عزت والے اور نکالنے والے ہیں''۔

دوسری قسم: کلام غیر میں واقع لفظ کا کوئی متعلق ذکر کر کے اسے قائل کی مراد کے برخلاف ایسے معنیٰ پر محمول کرنا جس کا لفظ میں احتمال ہو۔

امام سیوطی نے کہا: قرآن سے اس کی مثال کسی کتاب میں نہ پائی مگر مجھے اس کی مثال میں ایک آیت مل گئی وہ یہ ہے :(وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ: التوبۃ/۶۱) ''ان میں کوئی وہ ہیں جو ان غیب کی خبر دینے والے کو ستاتے ہیں اور کہتے ہیں وہ تو کان ہیں تم فرماؤ تمھارے بھلے کے لیے کان ہیں۔''

منافقین نے حضور کو ''اذن'' (کان) کہا جس سے ان کی مراد یہ تھی کہ ان سے جو بھی کہا جائے سن کر مان لیتے ہیں خواہ وہ خیر وصلاح کی بات ہو یا شر وفساد کی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس کا متعلّق خیر ذکر

کر کے لفظ اذن کو دوسری مراد پر محمول فرمادیا یعنی وہ کان تو ہیں مگر صرف خیر وصلاح کے سننے اور ماننے والے ہیں، شر وفساد کے نہیں۔

انواع جدل سے ''مناقضہ'' بھی ہے۔ یعنی کسی امر کا وقوع محال ہونے کی طرف اشارہ کرنے کے لیے اس امر کو محال پر معلّق کرنا۔ جیسے ارشاد خداوندی ہے:( وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِىْ سَمِّ الْخِيَاطِ:الاعراف/ ٤٠) "اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں جب تک سوئی کے ناکے (میں ) اونٹ نہ داخل ہو۔'' اور یہ محال تو کفار کا جنت میں داخل ہونا محال کیوں کہ محال پر جو موقوف ہو وہ محال ہوتا ہے۔(خزائن العرفان)

ایک اور قسم ''مجاراۃ الخصم'' بھی ہے یعنی خصم کے بعض مقدمات کو تسلیم کرلیا جائے جب مقصد حجت سے اس کو مغلوب کرنا اور حجت اس پر لازم کردینا ہو۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:(قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ، قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ: ابراهیم/ ۱۰، ۱۱) ''بولے تم تو ہمیں جیسے آدمی ہو تم چاہتے ہو کہ ہمیں اس سے باز رکھو جو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے۔ اب کوئی روشن سند ہمارے پاس لے آؤ۔ ان کے رسولوں نے ان سے کہا ہم ہیں تو تمھاری طرح انسان مگر اللہ بندوں میں جس پر چاہے احسان فرماتا ہے۔''

اس مثال میں رسولوں کے قول" ان نحن الا بشر مثلکم" میں اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ صرف بشر ہیں گویا انھوں نے اپنی ذاتوں سے رسالت کے انتفا کو تسلیم کرلیا۔ مگر یہ مراد نہیں ہے بلکہ یہ خصم کے ساتھ اسی کی راہ پر چلنا ہے تاکہ وہ حقیقت آگاہ ہوکر اسے قبول کرے۔ گویا ان رسولوں نے فرمایا: تم لوگوں کا ہمارے بشر ہونے کا دعویٰ کرنا حق ہے اس سے ہمیں انکار نہیں ہے۔ مگر یہ ہمارے رسول ہونے کے منافی نہیں اس لیے کہ رسالت ایک ایسا امتیاز ہے جو خدا کی عطا واحسان سے ملتا ہے وہ جسے چاہے اس سے نوازے۔

## قرآن میں واقع اسما، کنیتیں اور القاب

قرآن میں پچیس مشہور انبیا و مرسلین کے نام مذکور ہیں:

[۱] ابو البشر حضرت آدم [۲] حضرت نوح [۳] حضرت ادریس [۴] حضرت ابراہیم [۵] حضرت اسمٰعیل: آپ حضرت ابراہیم کے سب سے بڑے بیٹے ہیں۔ [۶] حضرت اسحٰق: آپ حضرت اسمٰعیل کے چودہ برس بعد پیدا ہوئے۔ [۷] حضرت یعقوب: آپ ایک سو سینتالیس برس تک دنیا میں رہے۔ [۸] حضرت یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم [۹] حضرت لوط: آپ ابن اسحٰق کے قول کے مطابق ہاران بن آزر کے بیٹے ہیں [۱۰] حضرت ہود [۱۱] حضرت

صالح [۱۲] حضرت شعیب [۱۳] حضرت موسیٰ [۱۴] حضرت ہارون [۱۵] حضرت داؤد [۱۶] حضرت سلیمان: آپ حضرت داؤد کے فرزند ہیں [۱۷] حضرت ایوب [۱۸] حضرت ذوالکفل [۱۹] حضرت یونس [۲۰] حضرت الیاس [۲۱] حضرت الیسع [۲۲] حضرت زکریا [۲۳] حضرت یحییٰ: آپ حضرت زکریا کے بیٹے ہیں۔ [۲۴] حضرت عیسیٰ [۲۵] حضرت محمد مصطفیٰ علیہ وعلیہم السلاۃ والتسلیم۔

## قرآن میں وارد اسماء ملائکہ

[۱] حضرت جبریل [۲] حضرت میکائیل [۳] داروغۂ جہنم حضرت مالک [۴] حضرت ہاروت [۵] حضرت ماروت۔

## اسماء صحابہ وغیرہم

قرآن میں صرف صحابیٔ رسول حضرت زید بن حارثہ کا نام ہے۔

انبیاء ورسل کے علاوہ زمانۂ قدیم کے ان لوگوں کے اسما جو قرآن میں مذکور ہیں:

[۱] عمران پدر حضرت مریم [۲] تبع [۳] حضرت لقمان [۴] یوسف جس کا ذکر سورۂ غافر میں ہے۔ [۵] ایک قول کے مطابق یعقوب جن کا ذکر سورۂ مریم کے شروع میں ہے۔ [۶] تقی جو سورۂ مریم میں ہی اللہ تعالیٰ کے قول (اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِالرَّحۡمٰنِ مِنۡكَ اِنۡ كُنۡتَ تَقِيًّا: مریم/۱۸) میں مذکور ہے۔

کہا گیا کہ تقی ایک شخص تھا جو بہت اچھے لوگوں میں تھا اس لیے آیت کریمہ کا معنی ہے: ''میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو نیکوکاری میں تقی جیسا ہے۔'' ثعلبی نے اسی قول کو نقل کیا۔

قرآن میں صرف ایک عورت حضرت مریم کا ذکر ہے۔ ہاں ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول (اَتَدۡعُوۡنَ بَعۡلًا وَّتَذَرُوۡنَ اَحۡسَنَ الۡخٰلِقِيۡنَ: الصافات/ ۱۲۵) میں "بعل" ایک عورت کا نام ہے جسے لوگ پوجتے تھے۔ ابن عساکر نے اس قول کو نقل کیا۔ ''کیا بعل کی پوجا کرتے ہو اور سب سے اچھے خالق کو چھوڑتے ہو۔''

## قرآن میں مندرجہ ذیل کفار کے نام ہیں:

[۱] قارون [۲] آزر [۳] جالوت [۴] ہامان۔

**جنوں** میں صرف ابوالجن ابلیس کا ذکر ہے اور کسی جن کا ذکر نہیں۔

اس میں مندرجہ ذیل **قبائل** کے نام آئے ہیں:

[۱] یاجوج [۲] ماجوج [۳] عاد [۴] ثمود [۵] مدین [۶] قریش [۷] روم۔

**اقوام** کے نام جو اضافت کے ساتھ مذکور ہیں:

[۱] قوم نوح [۲] قوم لوط [۳] قوم تبع [۴] قوم ابراہیم [۵] اصحاب ایکہ۔ کہا گیا کہ ان

سے مراد مدین ہیں۔ [۷] اصحاب رس: حضرت ابن عباسؓ کے قول کے مطابق ان سے قوم ثمود کے باقی ماندہ لوگ مراد ہیں۔ لیکن حضرت عکرمہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ سورۂ یٰس میں ذکر شدہ اصحاب ہیں۔ قتادہ نے کہا کہ یہ لوگ قوم شعیب ہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ ان سے صحاب اخدود مراد ہیں۔ ابن جریر نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

قرآن میں واردان **بتوں** کے نام جو اصل میں ''انسانوں'' کے نام تھے۔

[۱] وَد [۲] سُواع [۳] یَغوث [۴] یَعوق [۵] نَسر: یہ سب قوم نوح کے بت تھے۔

[۶] لات [۷] عُزّیٰ [۸] مناۃ: یہ سب قریش کے بت تھے۔

[۹] رُجز، را کے ضمے کے ساتھ قراءت کرنے والوں کے نزدیک، ایک بت کا نام ہے۔ یہ بات اخفش نے اپنی تصنیف "کتاب الواحد والجمع" میں تحریر کی ہے۔ [۱۰] جبت [۱۱] طاغوت [۱۲] بعل۔

اس میں مندرجہ ذیل **ملکوں، شہروں، قطعاتِ زمین، جگہوں اور پہاڑوں** کے نام آئے ہیں:

[۱] بکہ: یہ مکہ کا دوسرا نام ہے [۲] مدینہ [۳] بدر [۴] اُحُد [۵] حُنَین [۶] مَشعَر حَرام [۷] مصر [۸] بابل [۹] ایکہ [۱۰] حِجر [۱۱] احقاف [۱۲] طور سینا [۱۳] جودی [۱۴] وادئ طُوَیٰ [۱۵] کہف [۱۶] رَقیم [۱۷] عَرِم [۱۸] حَرد [۱۹] صَرِیم: ابن جبیر نے سعید بن جبیر سے تخریج کی کہ صریم، یمن میں ایک زمین کا نام ہے۔ [۲۰] قٓ: ایک پہاڑ جو پوری زمین کو محیط ہے۔ [۲۱] جُرز: ایک زمین کا نام [۲۲] طاغیہ: کہا گیا کہ یہ اس قطعۂ زمین کا نام ہے جس میں ثمود ہلاک کیے گئے تھے۔ کرمانی نے جرز اور طاغیہ سے متعلق ان دونوں اقوال کو نقل کیا ہے۔

**اخروی مقامات** کے نام جو قرآن میں مذکور ہیں:

[۱] فردوس: یہ جنت میں سب سے اعلیٰ مقام ہے۔ [۲] علّیّون: کہا گیا کہ جنت میں یہ سب سے اونچی جگہ ہے۔ [۳] کوثر: جنت کی ایک نہر کا نام [۴، ۵] سلسبیل اور تسنیم: جنت کے دو چشموں کے نام۔ [۶] سِجّین: ارواح کفار کے رہنے کی جگہ کا نام۔ [۷] صَعود: ترمذی کی تخریج کردہ حضرت ابوسعید کی حدیثِ مرفوع کے مطابق جہنم کے ایک پہاڑ کا نام۔ [۸] غی [۹] اَثام [۱۰] مَوبِق [۱۱] سَعیر [۱۲] وَیل [۱۳] سائل [۱۴] سَحق: جہنم کی وادیوں کے نام۔

[۱] یَحموم: کالا دھواں۔

## قرآن میں مذکور سیاروں کے نام:

[۱] شمس: (آفتاب) [۲] قمر (چاند) [۳] طارق: ایک روشن ستارہ [۴] شِعرَیٰ:

سخت گرمی میں طلوع ہونے والا ایک روشن ستارہ۔

بعض مفسرین نے کہا اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں **پرندوں** کی دس اجناس کا ذکر فرمایا ہے۔

[۱] سَلوىٰ (بٹیر) [۲] بَعُوض (مچھر) [۳] ذُباب (مکھی) [٤] نَحل (شہد کی مکھی)
[٥] عَنکبوت (مکڑی) [٦] جَراد (ٹڈی) [۷] هُدهُد (کٹھ بڑھئی) [۸] غُراب (کوا)
[۹] ابابیل (ابابیل) [۱۰] نمل (چیونٹی)

کنیتوں میں صرف ایک کنیت "ابو لهب" کا ذکر قرآن میں ہوا ہے۔ اس کا نام عبد العُزّیٰ تھا۔

## فوائد

مصحف شریف کو بوسہ دینا مستحب ہے کیوں کہ حضرت عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسا کیا کرتے تھے۔ بعض علما نے حجرِ اسود کے بوسے پر قیاس کرنے کے سبب بھی اسے مستحب قرار دیا ہے۔ یہ اس لیے بھی مستحب ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک سوغات ہے۔ یوں اس کا بوسہ دینا اسی طرح مشروع ہوا جس طرح ننھے منے بچے کو بوسہ دینا مستحب ہوا۔

امام احمد بن حنبل سے اس سلسلے میں تین روایات آئی ہیں [۱] جواز [۲] استحباب [۳] توقف: یہ اس لیے کہ اگر چہ بوسہ لینے میں قرآن کی رفعت قدر اور اس کا اعزاز و اکرام ہے مگر اس میں قیاس کا دخل نہیں والہٰذا حضرت عمر نے سنگ اسود سے فرمایا: اگر میں نے رسول اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو تجھے بوسہ نہ دیتا۔

مصحف پر خوشبو لگانا اور اسے کرسی پر رکھنا مستحب ہے۔ مصحف کو بطور تکیہ استعمال کرنا حرام ہے کیوں کہ اس میں اس کی تذلیل و توہین ہے۔ علامہ زرکشی نے کہا: مصحف کی طرف پیر پھیلانے کا بھی یہی حکم ہے۔

ابن ابی داؤد نے اپنی کتاب "مصاحف" میں سفیان سے روایت کی کہ انھوں نے مصحف کو لٹکایا جانا مکروہ قرار دیا۔ اور ضحاک سے تخریج کی کہ انھوں نے کہا: مصحف کے تخت کی طرح حدیث کے تخت نہ رکھو۔

صحیح قول کے مطابق مصحف کے اعزاز و اکرام کے لیے اسے چاندی سے مزین و آراستہ کرنا جائز ہے۔ بیہقی نے ولید بن مسلم سے تخریج کی: انھوں نے کہا: میں نے قرآن کو چاندی سے آراستہ کرنے کے متعلق امام مالک سے پوچھا تو انھوں نے ہمارے سامنے ایک مصحف نکال کر کہا: مجھے میرے والد نے میرے دادا کے حوالے سے بیان کیا کہ حضرت عثمان کے عہد خلافت میں لوگوں نے قرآن کو جمع کیا اور انھوں نے مصاحف کو ایسے یا اسی جیسے طریقے پر چاندی سے مزین کیا تھا۔

سونے سے تزیین و آرائش کے متعلق صحیح ترین قول یہی ہے کہ یہ صرف عورت کے لیے جائز ہے، مرد کے لیے جائز نہیں جب کہ بعض علما نے کہا: مصحف کو سونے سے مزین کرنا، جائز ہے مگر اس کا غلاف جو

اس سے جدا ہوتا ہے اسے سونے سے آراستہ کرنا جائز نہیں۔ اظہر یہ ہے کہ دونوں کا حکم یکساں ہو۔

جب مصحف شریف کے کسی ورق کو اس کے بوسیدہ ہو جانے یا اسی جیسے کسی اور سبب سے نکال دینے کی حاجت ہو تو اسے کسی شگاف یا سوراخ یا اس کے علاوہ کسی اور چیز میں رکھنا جائز نہیں کیوں کہ ممکن ہے کہ وہ ورق اس سے گر جائے اور لوگ اسے اپنے قدموں سے روندیں۔

مصحف شریف کے اوراق کو پھاڑنا جائز نہیں کیوں کہ اس میں اس کے حروف پارہ پارہ ہوں گے اور اس کے کلمات جدا جدا ہوں گے جس سے تحریر مصحف کی تحقیر و ناقدری ہوگی۔ حلیمی نے بھی اسی طرح فرمایا۔

حلیمی ہی نے کہا: مصحف کے اوراق کو پانی سے دھونا جائز ہے۔ اور اگر کوئی انھیں آگ میں جلائے تو بھی کوئی حرج نہیں کیوں کہ حضرت عثمان نے ان مصاحف کو جلا دیا تھا جن میں منسوخ آیتیں اور قراءتیں درج تھیں اور اس کارروائی پر کسی بھی صحابی رسول کی طرف سے انکار نہیں ہوا۔

ایک دوسرے صاحب علم نے کہا کہ دھونے کی بہ نسبت جلا دینا اولیٰ و بہتر ہے اس لیے کہ دھونے کی صورت میں غُسالہ زمین پر گر سکتا ہے۔

ابن ابی داؤد نے، ابن مسیّب سے روایت کی کہ انھوں نے کہا: تم میں کوئی شخص صیغۂ تصغیر کے ساتھ مُصَیحِف (مصحفوا) اور مُسَیجِد (مسجِدِ یا) نہ کہے کیوں کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کی ہو وہ عظیم ہوتی ہے۔

جمہور علما کا مذہب یہ ہے کہ بے وضو کے لیے مصحف شریف کا چھونا حرام ہے خواہ مصحف چھوٹا ہو یا بڑا کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے: (لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ) فرمایا ہے جس کا معنیٰ یہ ہے کہ ''اسے صرف پاک لوگ چھوئیں۔'' اسی طرح حدیث ترمذی وغیرہ ہے کہ: قرآن کو وہی ہاتھ لگائے جو پاک ہو۔

ابن ماجہ وغیرہ نے حضرت انس سے مرفوعاً روایت کی: سات ایسی خصلتیں ہیں جن کا اجر بندے کو اس کی موت کے بعد بھی اس کی قبر میں ملتا رہے گا [۱] جس نے علم دین کی تعلیم دی [۲] یا نہر جاری کی [۳] یا کنواں کھودا [۴] یا کھجور کا درخت لگایا [۵] یا مسجد بنائی [۶] یا ایسی اولاد چھوڑی جو اس کی موت کے بعد اس کے لیے دعائے مغفرت کرتی ہو [۷] یا وراثت میں مصحف چھوڑا۔

## مفردات القرآن

سِلَفی نے ''المختار من الطیوریات'' میں شعبی سے تخریج کی کہ انھوں نے فرمایا: ایک سفر میں حضرت عمر کو سواروں کا ایک قافلہ نظر آیا۔ اس میں حضرت عبداللہ بن مسعود بھی تھے (مگر حضرت عمر کو معلوم نہ تھا۔) آپ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ قافلہ والوں سے پوچھے: آپ لوگ کہاں سے آرہے ہیں؟ ان لوگوں نے کہا: ''اَقْبَلْنَا مِنَ الْفَجِّ الْعَمِيْقِ، نُرِيْدُ الْبَيْتَ الْعَتِيْقَ'' ہم دور دراز راستے سے آرہے ہیں اور پرانے گھر یعنی خانۂ کعبہ کو جانے کا ارادہ ہے۔ یہ سن کر حضرت عمر نے کہا: ان لوگوں کے

درمیان ضرور کوئی ذی علم ہے۔ پھر آپ نے ایک شخص کو انھیں آواز دینے کا حکم دیا: آپ لوگ بتائیں کہ قرآن کا کون سا حصہ سب سے عظیم ہے؟ حضرت عبداللہ نے جواب دیا: (اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ: البقرۃ/ ۲۵۵) "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ آپ زندہ اور دوسروں کو قائم رکھنے والا ہے۔" حضرت عمر نے پھر حکم دیا انھیں آواز دو کہ قرآن کا کون سا جز سب سے زیادہ محکم ہے؟ حضرت ابن مسعود نے جواب دیا: (اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسٰنِ وَاِيْتَاۗءِ ذِي الْقُرْبٰى: النحل/ ۹۰) "بے شک اللہ حکم فرماتا ہے انصاف اور نیکی اور رشتہ داروں کو دینے کا۔" پھر حکم دیا انھیں آواز دو قرآن کا کون سا حصہ زیادہ جامع ہے؟ حضرت ابن مسعود نے جواب دیا: (فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ، وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ: الزلزلۃ/ ۷، ۸) "تو جو ایک ذرہ بھر بھلائی کرے اسے دیکھے گا اور جو ایک ذرہ بھر برائی کرے اسے دیکھے گا۔" پھر حکم ہوا کہ آواز دو قرآن کا کون سا حصہ زیادہ غم والا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: (مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ: النساء/ ۱۲۳) "جو برائی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا۔" پھر حکم دیا آواز دو قرآن کا کون سا حصہ زیادہ امید ور جا والا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: (قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ: الزمر/ ۵۳) "تم فرماؤ! اے میرے وہ بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔" اب حضرت عمر نے دریافت فرمایا؟ آپ لوگوں میں ابن مسعود تو نہیں ہیں؟ سواروں نے جواب دیا ہاں! ہم میں ابن مسعود ہیں۔ اس واقعے کو عبدالرزاق نے بھی اپنی تفسیر میں اسی کے ہم معنی روایت کیا۔

ابن ابی حاتم نے حسن بصری سے تخریج کی کہ انھوں نے کہا: میں نے حضرت ابو برزہ اسلمی سے دریافت کیا؟ بتائیے قرآن کی کون سی آیت، اہل دوزخ پر سب سے زیادہ سخت ہے؟ انھوں نے فرمایا: (فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا: النبأ/ ۳۰) "اب چکھو کہ ہم تمھیں نہ بڑھائیں گے مگر عذاب۔"

بعض علما نے کہا: قرآن کی سب سے لمبی سورہ، سورۂ بقرہ ہے اور سب سے مختصر سورۂ کوثر ہے۔

اس کی طویل ترین آیت، آیت دَین ہے اور مختصر ترین آیت (وَالضُّحٰى) اور (وَالْفَجْرِ) ہے جب کہ رسم الخط کے اعتبار سے سب سے لمبا کلمہ (فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ: الحجر/ ۲۲) ہے۔ "پھر وہ (پانی) تمھیں پینے کو دیا۔"

قرآن کی دو آیتیں ایسی ہیں جن میں سے ہر ایک میں تمام حروف تہجی جمع ہیں۔ پہلی آیت یہ ہے: (ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَاۗىِٕفَةً مِّنْكُمْ ، وَطَاۗىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْھُمْ اَنْفُسُھُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِھِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا

ھٰھُنَا، قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ :ال عمران/ ۱۵٤) "پھر تم پرغم کے بعد چین کی نیند اتاری کہ تمھاری ایک جماعت کو گھیرے تھی اور ایک گروہ کو اپنی جان کی پڑی تھی۔ اللہ پر بیجا گمان کرتے تھے جاہلیت کے سے گمان۔ کہتے: کیا اس کام میں کچھ ہمارا بھی اختیار ہے؟ تم فرمادو کہ اختیار تو سارا اللہ کا ہے۔ اپنے دلوں میں چھپاتے ہیں جو تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ کہتے ہیں ہمارا کچھ بس ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔ تم فرمادو کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے جب بھی جن کا مارا جانا لکھا جا چکا تھا اپنی قتل گاہوں تک نکل کر آتے اور اس لیے کہ اللہ تمھارے سینوں کی بات آزمائے اور جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے اس کو کھول دے اور اللہ دلوں کی بات جانتا ہے۔"

دوسری آیت یہ ہے:(مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْأَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا: الفتح/۲۹) "محمد اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھ والے کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم دل۔ تو انھیں دیکھے گا رکوع کرتے، سجدے میں گرتے، اللہ کا فضل ورضا چاہتے۔ ان کی علامت ان کے چہروں میں ہے سجدوں کے نشان سے۔ یہ ان کی صفت توریت میں ہے اور ان کی صفت انجیل میں جیسے ایک کھیتی اس نے اپنا پٹھا نکالا پھر اسے طاقت دی پھر دبیز ہوئی پھر اپنی ساق پر سیدھی کھڑی ہوئی کسانوں کو بھلی لگتی ہے تا کہ ان سے کافروں کے دل جلیں۔ اللہ نے وعدہ کیا ان سے جو ان میں ایمان اور اچھے کاموں والے ہیں بخشش اور بڑے ثواب کا۔"

قرآن میں بغیر فصل کے حا کے بعد حا صرف دو جگہوں میں ہے :(عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى:البقرة/۲۳۵) اور (لَآ اَبْرَحُ حَتّٰى:الكهف/٦٠) ۔[ پوری عبارتیں یوں ہیں :(وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۔)"اور نکاح کی گرہ پکی نہ کرو جب تک لکھا ہوا اپنی میعاد کو نہ پہنچ لے۔"(لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ۔) [حضرت موسیٰ نے اپنے خادم حضرت یوشع سے کہا]"میں باز نہ رہوں گا جب تک وہاں نہ پہنچوں جہاں دو سمندر ملے ہیں یا قرنوں چلا جاؤں۔" ]

اسی طرح دو کاف صرف "مَنَاسِكَكُمْ" اور "مَا سَلَكَكُمْ" میں ایک ساتھ بغیر فاصلے کے آئے ہیں۔(مکمل عبارتیں اس طرح ہیں:(فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا :البقرة/۲۰۰)" پھر جب اپنے حج کے کام پورے کر چکو تو اللہ کا ذکر کرو جیسے اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے تھے بلکہ اس سے زیادہ۔" (مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ:المدثر/٤٢) "تمھیں

کیا چیز دوزخ میں لے گئی۔''

ایسے ہی دو غین صرف (وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ :آل عمران/۸۵) میں یکجا بغیر فاصلے کے آئے ہیں۔''اور جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین چاہے تو وہ اس کی جانب سے ہر گز قبول نہ کیا جائے گا۔''

ذیل میں مذکور آیتِ دَین میں تیئیس کاف ہیں جب کہ کسی دوسری آیت میں ایسا نہیں۔

(يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا تَدَا يَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْلَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاءُ اِذَا مَا دُعُوْا وَلَا تَسْـَٔمُوْا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌ بِكُمْ وَاتَّقُوااللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ :البقرة/۲۸۲) ''اے ایمان والو جب تم ایک مقرر مدت تک کسی دَین کا لین دین کرو تو اسے لکھ لو اور چاہیے کہ تمھارے درمیان کوئی لکھنے والا ٹھیک ٹھیک لکھے اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا کہ اسے اللہ نے سکھایا ہے تو اسے لکھ دینا چاہیے۔ اور جس پر حق آتا ہے وہ لکھاتا جائے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور حق میں سے کچھ رکھ نہ چھوڑے، پھر جس پر حق آتا ہے اگر بے عقل یا ناتواں ہو یا لکھا نہ سکے تو اس کا ولی انصاف سے لکھائے اور دو گواہ کر لو اپنے مردوں میں سے۔ پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں، ایسے گواہ جنھیں پسند کرو کہ کہیں ان میں سے ایک عورت بھولے تو اس ایک کو دوسری یاد دلا دے اور گواہ جب بلائے جائیں تو آنے سے انکار نہ کریں اور اسے بھاری نہ جانو کہ دَین چھوٹا ہو یا بڑا اس کی میعاد تک لکھت کر لو۔ یہ اللہ کے نزدیک انصاف کی بات ہے۔ اس میں گواہی خوب ٹھیک رہے گی اور یہ اس سے قریب ہے کہ تمھیں شبہہ نہ پڑے مگر یہ کہ کوئی سر دست کا سودا دست بدست ہو تو اس کے نہ لکھنے کا تم پر گناہ نہیں۔ اور جب خرید و فروخت کرو تو گواہ کر لو۔ اور نہ کسی لکھنے والے کو ضرر دیا جائے نہ گواہ کو۔ اور جو تم ایسا کرو تو یہ تمھارا فسق ہو گا اور اللہ سے ڈرو اور اللہ تمھیں سکھاتا ہے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔''

مواریث کی دو آیتوں میں تیرہ وقف ہیں اور یہ بات کہیں نہیں:(لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَلِاَبَوَيْهِ

لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُ وَلَدٌ وَّوَرِثَهُ أَبَوٰهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۰۰۰ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّورَثُ كَلٰلَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَّلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصٰى بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ :النساء/١١، ١٢) ''بیٹے کا حصہ دو بیٹیوں برابر ہے۔ پھر اگر نری لڑکیاں ہوں اگر چہ دو سے اوپر تو ان کو ترکہ کی دو تہائی اور اگر ایک لڑکی ہو تو اس کا آدھا اور میت کے ماں باپ ہر ایک کو اس کے ترکہ سے چھٹا اگر میت کی اولاد ہو۔ پھر اگر اس کی اولاد نہ ہو اور ماں باپ چھوڑے تو ماں کا تہائی۔ پھر اگر اس کے کئی بہن بھائی ہوں تو ماں کا چھٹا بعد اس وصیت کے جو کر گیا اور دین کے....اور تمھاری بیبیاں جو چھوڑ جائیں اس میں سے تمھیں آدھا ہے اگر ان کی اولاد نہ ہو۔ پھر اگر ان کی اولاد ہو تو ان کے ترکہ میں سے تمھیں چوتھائی ہے، جو وہ وصیت کر گئیں اور دین نکال کر۔ اور تمھارے ترکہ میں عورتوں کا چوتھائی ہے اگر تمھارے اولاد نہ ہو۔ پھر اگر تمھارے اولاد ہو تو ان کا تمھارے ترکہ میں سے آٹھواں۔ جو وصیت تم کر جاؤ اور دین نکال کر۔ اور اگر کسی ایسے مرد یا عورت کا ترکہ بٹتا ہو جس نے ماں باپ اولاد کچھ نہ چھوڑے اور ماں کی طرف سے اس کا بھائی یا بہن ہے تو ان میں سے ہر ایک کو چھٹا۔ پھر اگر وہ بہن بھائی ایک سے زیادہ ہوں تو سب تہائی میں شریک ہیں میت کی وصیت اور دین نکال کر جس میں اس نے نقصان نہ پہنچایا ہو۔ یہ اللہ کا ارشاد ہے۔''

سورۂ عصر ایسی تین آیتوں والی سورہ ہے جس میں دس واو آئے ہیں۔ (وَالْعَصْرِ ۰ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۰ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (العصر/١، ٢، ٣) ''اس زمانۂ محبوب کی قسم! بیشک انسان ضرور گھاٹے میں ہے سوا ان کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق کی تاکید کی اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی۔''

سورۂ رحمٰن ہی ایک ایسی سورہ ہے جس میں اکیاون آیتوں میں باون وقف ہیں۔

ابوعبداللہ خبّازی مقری نے کہا: میں پہلی بار جب سلطان محمود بن ملک شاہ کے پاس آیا تو اس نے مجھ سے سوال کیا: کون سی آیت ''غین'' سے شروع ہوتی ہے؟ میں نے جواب دیا: تین آیتیں (غَافِرِ الذَّنْبِ: غافر/٣ [١])، (غُلِبَتِ الرُّومُ: الروم/٢[٢]) اور (غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ:

---

[١] اس سے پہلے اس طرح ہے: حٰمٓ تَنْزِيلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ غَافِرِ الذنب: یہ کتاب (قرآن) بڑے غلبہ وعلم والے اور گناہوں کو بخشنے والے اللہ کا اتارا ہوا ہے۔ [٢] رومی مغلوب ہوئے۔

الفاتحة/۷) ــــ مگر ان دونوں کے شروع آیت ہونے میں اختلاف ہے۔

امام سیوطی نے شیخ الاسلام ابن حجر کی یہ تحریر نقل کی ہے کہ "قرآن میں چار مقامات پر پے درپے چار تشدیدیں آئی ہیں۔ (وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّارَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ:مریم/٦٤،٦٥)، "اور حضور کا رب بھولنے والا نہیں، آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے سب کا مالک تو اسے پوجو"۔(أَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ :النور/٤٠)، "یا جیسے اندھیریاں کسی گہرے دریا میں جسے موج ڈھانپے ہوئے ہو۔" (سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ:یٰس/٥٨)، "ان پر سلام ہوگا مہربان رب کا فرمایا ہوا۔" (وَلَقَدْ زَّيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ: الملك/ ٥)"اور بیشک ہم نے نیچے کے آسمان کو چراغوں سے آراستہ کیا۔"

## آیات مبہمات

قرآن میں جو مبہمات آئے ہیں ان سے کون مراد ہے اس کا علم صرف نقل پر موقوف ہے اس لیے ہم اس سلسلے میں وارد اہم ترین نقول یہاں ذکر کررہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان:(اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً :البقرة/٣٠) میں "خليفه" سے مراد حضرت آدم اور ان کی بیوی حضرت حوا ہیں۔"بے شک میں زمین میں ایک نائب مقرر کرنے والا ہوں۔"، (وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا :البقرة/٢٠٩) میں "مَن" سے مراد اخنس بن شریق ہیں۔"اور لوگوں میں ایک وہ ہے جس کی بات تجھے دنیا کی زندگی میں بھلی لگتی ہے"۔(وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ :البقرة/٢٠٧) میں "مَن" سے مراد حضرت صہیب رومی ہیں۔"اور لوگوں میں ایک وہ بھی ہے جو اللہ کی خوشنودی چاہنے کے لیے اپنے آپ کو خرید لیتا ہے۔" (وَمِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ :البقرة/٢٥٣) میں بقولِ مجاہد "مَن" سے مراد حضرت موسیٰ ہیں۔"کوئی نبی وہ ہے جس سے اللہ نے کلام فرمایا"۔ (وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ : البقرة/٢٥٣) میں "بعض" سے مراد محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔"اور ایک نبی وہ ہیں جن کو اللہ نے درجوں بلندی عطا کی"۔(اِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا:ال عمران/٣٥) میں "عمران کی بیوی" سے مراد "حنہ بنت فاقوذ" ہیں۔"جب عمران کی بیوی نے عرض کی اے رب میرے! میں تیرے لیے مَنت مانتی ہوں جو میرے پیٹ میں ہے کہ خالص تیری ہی خدمت میں رہے"۔(رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ :ال عمران/١٩٣) میں "منادی" سے مراد محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔"اے رب ہمارے ہم نے ایک منادی کو سنا کہ ایمان کے لیے ندا فرماتا ہے"۔ (وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ

یُدرِکهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ :النساء/۱۰۰) میں "مَن" سے مراد "حضرت ضمرہ بن جندب" ہیں۔ "اور جو اپنے گھر سے نکلا اللہ ورسول کی طرف ہجرت کرتا پھر اسے موت نے آلیا تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ پر ہوگیا"۔ (وَاِنِّیْ جَارٌ لَّکُمْ:الانفال/۴۸) میں لفظِ "جار" سے مراد "حضرت سراقہ بن جعشم" ہیں۔ "اور تم میری پناہ میں ہو"۔ (اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا: التوبۃ/۴۰) میں "صاحب" سے مراد "حضرت ابوبکر صدیق" ہیں۔ "جب اپنے یار سے فرماتے تھے غم نہ کھا۔ بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔ (وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّیْ :التوبۃ/۴۹) میں "مَن" سے مراد "جد بن قیس" ہیں۔ "اور ان میں کوئی تم سے یوں عرض کرتا ہے کہ مجھے رخصت دیجیے"۔ (وَمِنْهُمْ مَنْ يَّلْمِزُكَ فِی الصَّدَقٰتِ :البقرۃ/۵۸) میں "مَن" سے مراد "ذوالخویصرہ" ہے۔ "اور ان میں کوئی وہ ہے کہ صدقے بانٹنے میں تم پر طعن کرتا ہے۔ (اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَائِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَائِفَةً بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ:التوبۃ/۶۶) میں پہلے "طائفہ" سے مراد "مخشی بن حمیر اشجعی" ہیں جنھوں نے نفاق سے توبہ کی اور جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔ اور دوسرے طائفہ سے مراد وہ منافقین ہیں جو اپنے نفاق واستہزا پر قائم رہے۔ "اگر ہم تم میں سے کسی کو معاف کریں تو اوروں کو عذاب دیں گے اس لیے کہ وہ مجرم تھے"۔ (وَمِنْهُمْ مَنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتَانَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّ قَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ: التوبۃ/۷۵) میں "مَن" سے مراد "ثعلبہ بن حاطب" ہیں۔ "اور ان میں کوئی وہ ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر ہمیں اپنے فضل سے دے گا تو ضرور خیرات کریں گے اور ہم ضرور بھلے آدمی ہوجائیں گے"۔ (وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ: التوبۃ/۱۰۲) میں "اخرون" سے مراد "غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہونے والے سات افراد [۱،۲] حضرت ابولبابہ، اور ان کے اصحاب [۳] جد بن قیس [۴] حرام [۵] اوس [۶] کردم اور [۷] مرداس ہیں۔ "اور کچھ وہ ہیں جو اپنے گناہوں کے مقر ہوئے"۔ (وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ :التوبۃ/۱۰۶) میں "اخرون" سے مراد [۱] ہلال بن امیہ [۲] مرارہ بن ربیع اور [۳] کعب بن مالک ہیں۔ یہ تینوں حضرات بھی غزوۂ تبوک میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ "اور کچھ موقوف رکھے گئے اللہ کے حکم پر" (وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ:التوبۃ/۱۰۷) سے بقول ابن اسحٰق بارہ اشخاص مراد ہیں جو انصار میں سے تھے۔ "اور وہ جنھوں نے مسجد بنائی نقصان پہنچانے کو اور کفر کے سبب اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈالنے کو اور اس کے انتظار میں جو پہلے سے اللہ اور اس کے رسول کا مخالف ہے، اور وہ ضرور قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو بھلائی چاہی اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بے شک

جھوٹے ہیں" (اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ: هود/۱۷) میں "مَن" سے مراد "محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔ اور (ويتلوه شاهد منه) میں "شاهد" سے مراد "حضرت جبریل" ہیں۔ جب کہ ایک قولِ ضعیف کی رو سے قرآن، دوسرے قولِ ضعیف کے لحاظ سے حضرت ابوبکر اور تیسرے قولِ ضعیف کے اعتبار سے "حضرت علی" مراد ہیں۔ "تو کیا وہ جو اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر ہو اور اس پر اللہ کی طرف سے گواہ آئے اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب پیشوا اور رحمت وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔" (اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِئِيْنَ: الحجر / ۹۵) کے بارے میں سعید بن جبیر نے کہا کہ "مستهزئين" سے پانچ لوگ: ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، ابوزمعہ، حارث بن قیس اور اسود بن عبد یغوث مراد ہیں۔ "بے شک ان ہنسنے والوں سے ہم تمہیں کفایت کرتے ہیں"۔ (هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ: النحل/۷۶) میں "مَن" سے مراد "حضرت عثمان بن عفان" ہیں۔ "کیا برابر ہو جائے گا یہ اور وہ جو انصاف کا حکم کرتا ہے"۔ (هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ: الحج/۱۹) کے متعلق شیخین نے حضرت ابوذر سے تخریج کی کہ آپ نے فرمایا: یہ آیت حضرت حمزہ، حضرت عبیدہ بن حارث، حضرت علی بن ابی طالب اور عتبہ، شیبہ اور ولید بن عتبہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ "یہ دو فریق ہیں جو اپنے رب کے بارے میں جھگڑے"۔ (اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ: النمل/ ۲۳) میں "امرأة" سے مراد "بلقیس بنت شراحیل" ہے"۔ "[ہدہد بولا] میں نے ایک عورت دیکھی کہ ان پر بادشاہی کر رہی ہے۔" (قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ: النمل/ ۴۰) میں "الذی" سے مراد حضرت سلیمان کے محرر "آصف بن برخیا" ہیں۔ "اس نے عرض کی جس کے پاس کتاب کا علم تھا کہ میں اسے یعنی تخت کو حضور میں حاضر کر دوں گا ایک پل مارنے سے پہلے"۔ (قَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ: القصص/۹) میں "امرأة" سے مراد "آسیہ بنت مزاحم" ہیں۔ "اور فرعون کی بی بی نے کہا: یہ بچہ (حضرت موسیٰ) میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے"۔ (اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا: السجدة/۱۸) حضرت علی بن ابی طالب اور ولید بن عتبہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ "تو کیا جو ایمان والا ہے وہ اس جیسا ہو جائے گا جو بے حکم ہے"۔ (قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا: المجادلة/۱) میں "التی تجادلك" سے مراد "خولہ بنت ثعلبہ" ہیں۔ اور "فی زوجها" میں زوج (شوہر) سے مراد حضرت اوس بن صامت" ہیں۔ "بے شک اللہ نے سنی اس کی بات جو تم سے اپنے شوہر کے معاملے میں بحث کرتی ہے"۔ (وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا: التحريم /۳) میں "بعض ازواج" سے مراد

"حضرت حفصہ" ہیں۔ "اور جب نبی نے اپنی ایک بی بی سے ایک راز کی بات بتائی"۔(نَبَّأَتْ بِهٖ:التحریم/۳) میں "نبأت" کی ضمیر غائب مستتر کا مرجع حضرت عائشہ ہیں اس لیے معنیٰ ہے "حضرت عائشہ نے اس کی خبر دی"۔ (اِنْ تَتُوْبَا اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا:التحریم/٤) اور(وَاِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ:التحریم/٤) میں تتوبا اور تظاهرا کی ضمیر بارز تثنیہ سے مراد حضرت عائشہ وحفصہ ہیں۔ اور المعجم الاوسط میں طبرانی کی تخریج کے مطابق "صالح" سے مراد "حضرت ابوبکر اور حضرت عمر ہیں"۔ "نبی کی دونوں بی بیو! اگر اللہ کی طرف تم رجوع کرو کہ ضرور تمھارے دل راہ سے کچھ ہٹ گئے ہیں"، "اور اگر ان پر زور باندھو (اور باہم مل کر ایسا طریقہ اختیار کرو جو سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ناگوار ہو) تو بے شک اللہ ان کا مددگار ہے اور جبریل اور نیک ایمان والے"۔ (ذَرْنِىْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا:المدثر/۱۱) ولید بن مغیرہ مخزومی کے حق میں نازل ہوئی۔ "اسے مجھ پر چھوڑ جسے میں نے اکیلا پیدا کیا"۔ (فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ، وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى، ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى :القیامۃ/ ۳۱،۳۲،۳۳) یہ آیات ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئیں۔ "اس نے نہ تو سچ مانا اور نہ نماز پڑھی، ہاں جھٹلایا اور منہ پھیرا پھر اپنے گھر کو اکڑتا چلا"۔ (عَبَسَ وَتَوَلّٰى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى: عبس/۲) میں "اعمی" (نابینا) سے حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم مراد ہیں۔ "تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا اس پر کہ اس کے پاس وہ نابینا حاضر ہوا"۔ (اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى :عبس/۵) میں "مَن" سے مراد "امیہ بن خلف" ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ مراد "عتبہ بن ربیعہ" ہے۔ "وہ جو بے پرواہ بنتا ہے تم اس کے تو پیچھے پڑتے ہو"۔

## قرآن میں ابہام کے اسباب

قرآن میں ابہام کے چند اسباب ہیں:

[۱] ایک مقام پر صراحۃً ذکر ہے، اس لیے دوسرے مقام پر ذکر کی حاجت نہیں جیسے: (اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ: الفاتحۃ/۵،۶) میں انعام الٰہی کے سزاوار لوگوں کا بیان نہیں اس لیے کہ ان کا بیان اللہ تعالیٰ کے اس قول میں کر دیا گیا ہے: (وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ :النساء/۶۹) "اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے تو اسے ان کا ساتھ ملے گا جن پر اللہ نے فضل کیا یعنی انبیا اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ"۔

[۲] مشہور ہونے کے سبب مراد کا متعین ہونا جیسے:(وَقُلْنَا يٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ:البقرۃ/۳۵) میں "زوجك" (تیری بیوی) ذکر فرمایا اس کی جگہ "حوا" نہ ذکر فرمایا کیوں کہ صرف

وہی حضرت آدم کی بیوی تھیں۔ ''اور ہم نے فرمایا اے آدم! تو اور تیری بی بی اس جنت میں رہو''۔

(اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡ حَآجَّ اِبۡرٰهٖمَ فِیۡ رَبِّهٖ: البقرۃ/۲۵۸) میں "الذی" سے نمرود کا مراد ہونا اس لیے مشہور ہے کہ حضرت ابراہیم کو اسی کے پاس بھیجا گیا تھا۔ ''اے محبوب! کیا تم نے نہ دیکھا اسے جو ابراہیم سے جھگڑا اس کے رب کے بارے میں''۔

[۳] راز داری مقصود ہو اس لیے خطاوار کا نام پوشیدہ رکھا جائے تا کہ یہ حق کی طرف اسے مائل کرنے کا زیادہ مؤثر ذریعہ بن سکے جیسے آیت کریمہ: (وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یُّعۡجِبُكَ قَوۡلُهٗ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا وَیُشۡهِدُ اللّٰهَ عَلٰی مَا فِیۡ قَلۡبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الۡخِصَامِ :البقرۃ/۲۰۴) اخنس بن شریق کے بارے میں نازل ہوئی جو بعد میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور ان کا اسلام اچھا ثابت ہوا۔ ''اور بعض آدمی وہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں اس کی بات تجھے بھلی لگے اور اپنے دل کی بات پر اللہ کو گواہ لائے اور وہ سب سے بڑا جھگڑالو ہے''۔

[۴] مراد کی تعیین میں کوئی بڑا فائدہ نہ ہو جیسے: (اَوۡ كَالَّذِیۡ مَرَّ عَلٰی قَرۡیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوۡشِهَا: البقرۃ/۲۵۹) ''یا اس کی طرح جو گزرا ایک بستی پر اور وہ ڈھئی پڑی تھی اپنی چھتوں پر۔'' (یہاں "قریۃ" سے مراد بیت المقدس ہے۔) (وَسۡـَٔلۡهُمۡ عَنِ الۡقَرۡیَةِ الَّتِیۡ كَانَتۡ حَاضِرَةَ الۡبَحۡرِ :الاعراف/۱۶۳) ''اور ان سے حال پوچھو اس بستی کا کہ دریا کے کنارے تھی''۔ یہ بستی کون تھی؟ اس میں اختلاف ہے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ یہ مصر و مدینہ کے درمیان ایک بستی تھی۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ بستی مدین اور طور کے درمیان تھی۔ زہری کہتے ہیں کہ یہاں قریہ سے مراد طبریہ شام ہے۔ ابن عباس کی ایک روایت کے مطابق یہ مدین ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ ایلہ ہے۔ (خزائن العرفان)

[۵] اس پر تنبیہ کہ حکم عام ہے اگر چہ نزول کسی خاص کے معاملے میں ہوا، تعیین کے ساتھ ذکر ہوتا تو یہ سمجھا جاتا کہ یہ حکم دوسرے کے لیے نہیں۔ جیسے: (وَمَنۡ یَّخۡرُجۡ مِنۡۢ بَیۡتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ثُمَّ یُدۡرِكۡهُ الۡمَوۡتُ فَقَدۡ وَقَعَ اَجۡرُهٗ عَلَی اللّٰهِ: النساء/۱۰۰) ''اور جو اپنے گھر سے نکلا اللہ و رسول کی طرف ہجرت کرتا، پھر اسے موت نے آلیا تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ پر ہو گیا''۔ یہ آیت مبارکہ حضرت جندع بن ضمرہ لیثی کے حق میں نازل ہوئی۔ مگر یہاں خاص ان کا نام نہیں ذکر کیا گیا بلکہ لفظ مَن لایا گیا جو عموم مراد پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے اللہ و رسول کی راہ میں ہجرت کرنے والے ہر شخص کے لیے اجر اخروی ثابت ہو گا۔

[۶] نام نہ ذکر کر کے کوئی صفت کمال ذکر کی جائے تا کہ موصوف کی عظمت شان ظاہر ہو۔ جیسے: (وَلَا یَاۡتَلِ اُولُوا الۡفَضۡلِ مِنۡكُمۡ وَالسَّعَةِ اَنۡ یُّؤۡتُوۡۤا اُولِی الۡقُرۡبٰی وَالۡمَسٰكِیۡنَ وَالۡمُهٰجِرِیۡنَ فِیۡ

سَبِيْلِ اللّٰهِ،: النور/ ۲۲) ''اور قسم نہ کھائیں وہ جو تم میں فضیلت والے اور گنجائش والے ہیں، قرابت والوں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (نہ) دینے کی''۔ (وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ: الزمر/ ۳۳) ''اور وہ جو یہ سچ (توحید خداوندی) لے کر تشریف لائے اور وہ جنھوں نے اس کی تصدیق کی یہی ڈر والے ہیں''۔ (اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا: التوبة/ ٤٠) "جب اپنے یار سے فرماتے تھے غم نہ کھا بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔"

ان تمام مثالوں میں صفات کمال" اولو الفضل"، "صدق به"، اور "صاحب" سے مراد حضرت ابوبکر صدیق ہیں۔

[۷] صفت نقص ذکر کر کے موصوف کی تحقیر مقصود ہو۔ جیسے: (اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ: الکوثر/ ۳) ''بے شک جو تمھارا دشمن ہے وہی ہر خیر سے محروم ہے۔''

## قرآن کی تفسیر و تاویل اور اس کی حاجت

تفسیر و تاویل ہم معنی ہیں یا ان میں فرق ہے؟ اس بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے۔

ابو عبید اور ایک گروہ نے کہا: دونوں ہم معنی ہیں۔ امام راغب اصفہانی نے کہا کہ تفسیر، تاویل سے اعم ہے۔ تفسیر کا زیادہ تر استعمال الفاظ اور مفردات میں ہوتا ہے جب کہ تاویل کا زیادہ استعمال معانی اور جملوں میں ہوتا ہے۔ تاویل کا استعمال کتب الٰہیہ سے متعلق ہوتا ہے جب کہ تفسیر کا استعمال کتب الٰہیہ اور غیر کتب الٰہیہ دونوں کے لیے ہوتا ہے۔

علامہ زرکشی نے کہا: تفسیر: ایسا علم ہے جس سے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی اللہ کی کتاب کا فہم، اس کے معانی کا بیان اور اس کے احکام اور حکمتوں کا استخراج حاصل ہو۔

استمداد: تفسیر میں علم لغت، علم نحو، علم صرف، علم بیان، اصول فقہ اور قراءات سے مدد لی جاتی ہے۔

احتیاج: اس میں اسباب نزول اور ناسخ و منسوخ جاننے کی حاجت ہوتی ہے۔

شرف: اس کا شرف اور بلندی مرتبہ پوشیدہ نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: (يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا: البقرة/ ٢٦٩) ''اللہ حکمت دیتا ہے جسے چاہے اور جسے حکمت ملی اسے بہت بھلائی ملی۔''

حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ "يؤتي الحكمة" میں حکمت سے مراد: قرآن کی معرفت، ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، مقدم و مؤخر، حلال و حرام اور امثال کی معرفت ہے۔

ابوذر ہروی نے "فضائل القرآن" میں بہ طریق سعید بن جبیر، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی۔ آپ نے فرمایا: جو قرآن کی قراءت تو کرے مگر اس کی تفسیر بخوبی نہ کر سکے وہ

اس دیہاتی کی طرح ہے جو بہت تیزی اور روانی سے شعر تو پڑھے مگر اس کا مطلب نہ سمجھے۔

بیہقی وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہ کی یہ حدیث مرفوع روایت کی: قرآن کو اس کے معانی سمجھ کر پڑھو اور اس کے غریب الفاظ کے معانی کی تلاش میں رہو۔

ابن الانباری نے حضرت ابو بکر صدیق سے تخریج کی: آپ نے فرمایا: میں قرآن کی ایک آیت کو سمجھ کر پڑھوں یہ میرے نزدیک اس سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ ایک آیت زبانی یاد کروں۔

ابن الانباری نے ہی عبد اللہ بن بریدہ سے اور انھوں نے اصحاب نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں سے ایک صحابی سے یہ بھی تخریج کی کہ انھوں نے فرمایا: اگر مجھے معلوم ہو کہ چالیس رات کا سفر طے کر کے میں کتاب اللہ کی کسی آیت کا مطلب جان لوں گا تو میں ایسا ضرور کروں گا۔ (یعنی کسی صاحب علم کے یہاں چالیس دن کے سفر کے بعد پہنچ کر کسی آیت کا علم حاصل کرنے کی صورت پیش آئے تو اس سے دریغ نہ ہوگا)

انھوں نے ہی بطریق شعبی یہ بھی تخریج کی کہ امام شعبی نے کہا کہ حضرت عمر نے فرمایا: جس نے قرآن کو سمجھ کر پڑھا، اس کے لیے اللہ کی بارگاہ میں ایک سو شہیدوں کا اجر ہے۔

ان آثار میں اَعْرِبُوا الْقُرْاٰنَ، لَاَنْ اُعْرِبَ اٰیَةً، اَعْرَبْتُ اٰیَةً، مَنْ قَرَأَ ۔ ۔ ۔ فَأَعْرَبَ جیسے الفاظ آئے ہیں۔ نحوی اصطلاح میں اعراب کا معنی "نحوی ترکیب کا بیان" ہوتا ہے۔ مگر آثار مذکورہ میں اعراب کا معنی کیا ہے؟ اس سے متعلق امام سیوطی نے کہا: میرے نزدیک ان آثار سے ان کے قائلین نے "بیان وتفسیر" مراد لیا ہے کیوں کہ "حکم نحوی" پر "اعراب" کا اطلاق ایک جدید اصطلاح ہے جو سلف میں رائج نہ تھی، اور اس لیے بھی کہ یہ اعراب (ترکیب نحوی کا علم) ان کی طبیعت اور فطری ذوق میں داخل تھا جس کے سیکھنے کی ان کو کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔

اصبہانی نے کہا: تفسیر قرآن سب سے اشرف واعلیٰ فن ہے جسے انسان کو اختیار کرنا چاہیے اس لیے کہ کسی فن کو شرف اس لیے حاصل ہوتا ہے کہ اس کا موضوع شرف والا ہے یا اس لیے کہ اس کی غرض شرف والی ہے یا اس لیے کہ اس کی حاجت زیادہ ہے۔ اور تفسیر قرآن میں تینوں وجہیں جمع ہیں۔

[۱] موضوع: اس کا موضوع اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو ہر حکمت کا سرچشمہ اور ہر فضیلت کی کان ہے۔ اس میں ماضی، مستقبل، حال کے اخبار واحوال ہیں۔ بار بار پڑھنے اور دہرانے کے باوجود وہ نہ بوسیدہ ہونے والا ہے، نہ اس کے عجائب ختم ہونے والے ہیں۔

[۲] غرض: اس کی غرض سب سے مستحکم گرہ "قرآن کریم" سے مضبوط وابستگی اور لافانی سعادت حقیقی تک رسائی ہے۔

[۳] سخت حاجت: دنیا وآخرت میں حاصل ہونے والا ہر دینی ودنیوی کمال شرعی علوم اور

دینی معارف کا محتاج ہے اور یہ علوم ومعارف کتاب اللہ کے علم پر موقوف ہیں۔

## مآخذ تفسیر

تفسیر کے اصل مآخذ چار ہیں:

[۱] نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نقل۔ یہ سب سے فائق اور ممتاز ہے لیکن تفسیری روایات میں ضعیف اور موضوع کی کثرت ہے اس لیے ان سے ہوشیار رہنا اور بچنا لازم ہے۔ اسی لیے امام احمد نے فرمایا: تین قسم کی کتابیں بے اصل ہیں: کتب مَغَازِی، کتب مَلَاحِم (داستانہائے رزم) اور کتب تفسیر۔

اِن کے اصحاب محققین نے بتایا کہ اس قول سے امام کی مراد یہ ہے کہ ان تینوں اقسام کی کتابوں کے مندرجات کی سندیں غالباً صحیح اور متصل نہیں ہیں۔ ورنہ ان کے بہت سے مندرجات و مشتملات صحیح بھی ہیں۔ جیسے: آیت انعام میں "ظلم" کی "شرك" سے، آسان حساب کی "عرض" سے اور اللہ تعالی کے قول: (وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ :الانفال/٦٠) میں "قوۃ" کی تفسیر "رمی" (تیراندازی) سے بہ اَسنادِ صحیحہ مروی ہیں۔ "اور ان کے لیے تیار رکھو جو قوت تمھیں بن پڑے"۔

علامہ زرکشی نے تو اس کلام کو برقرار رکھا مگر علامہ سیوطی نے اس پر استدراک کرتے ہوئے فرمایا: درجۂ صحت کو پہنچنے والی تفسیری روایات بہت کم ہیں، ان میں بھی وہ روایات جو سرکار سے ثابت اور مرفوع ہیں، کم سے کم تر ہیں۔

[۲] اقوال صحابہ: مستدرک میں امام حاکم کے قول کے مطابق مفسرین کے نزدیک صحابی کی تفسیر، حدیثِ مرفوع کی منزل میں ہے۔ (مگر یہ حکم علی الاطلاق درست نہیں۔ قول صحابی وہی درجۂ مرفوع میں ہوتا ہے جو سبب نزول، یا ناسخ ومنسوخ سے متعلق ہو، یا کسی امر پر معین ثواب یا عذاب سے متعلق ہو یا ایسے امر میں ہو جو قیاس واجتہاد سے بیان نہیں ہوسکتا، اور ایسے مقام میں جہاں علمائے اہل کتاب سے اخذ کا احتمال نہ ہو۔ علامہ ابن حجر وغیرہ نے اس کو تفصیل وتحقیق سے بیان کیا ہے۔ مترجم)

[۳] عربی زبان کا علم کیوں کہ قرآن عربی زبان میں اترا۔ اسے ایک جماعت علما نے ذکر کیا اور امام احمد نے متعدد مقامات پر اس کی تصریح کی۔ مگر فضل بن زیاد نے امام احمد سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ان سے سوال ہوا کہ اگر کوئی شخص قرآن کے لیے بطور مثال کوئی شعر ذکر کرے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ انھوں نے جواب دیا: مجھے یہ پسند نہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ اس جواب سے "ممانعت" ظاہر ہوتی ہے۔ اور اسی لیے بعض علما نے کہا: مقتضائے لغت کے مطابق قرآن کی تفسیر کے جواز میں امام احمد سے دو روایتیں ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ کراہت وناپسندیدگی اس پر محمول ہے کہ آیت کو اس کے ظاہرِ معنی ومراد سے ایسے غیر ظاہر ومحتمل معانی کی طرف پھیر دیا جائے جو قلیل کلام عرب میں، عموماً اشعار وغیرہ میں

پائے جاتے ہوں، اور معنیٔ متبادر ان کے برخلاف ہو۔

[۴] معنیٔ کلام کے تقاضے اور شریعت سے حاصل شدہ فہم واستعداد کی بنیاد پر تفسیر۔ اسی کی دعا نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس کو دیتے ہوئے فرمایا: "اَللّٰھُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّأْوِيْلَ" "اے اللہ! اسے دین کا فقیہ بنا اور تاویل کا علم عطا فرما"۔ حضرت علی نے بھی اپنے قول "اِلَّا فَهْمًا يُّؤْتَاهُ الرَّجُلَ فِي الْقُرْاٰنِ" (مگر قرآن کا ایسا فہم جو کسی کو عطا کیا جائے) میں یہی مراد لیا ہے۔

اسی لیے صحابہ سے بعض آیات کی الگ الگ تفسیریں منقول ہوئیں۔ ہر صحابی نے اپنے منتہائے نظر کے مطابق اپنی رائے ظاہر کی۔

قرآن کی تفسیر محض بے اصل رائے اور اجتہاد سے جائز نہیں۔ ارشاد باری ہے: (وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ: الاسراء/۳٦) "اور اس کے پیچھے نہ پڑ جس کا تجھے علم نہیں"۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: (وَأَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: البقرۃ/۱٦۹) [شیطان تمھیں یہی حکم دے گا] "کہ اللہ پر وہ بات جوڑو جس کی تمھیں خبر نہیں"۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہے: (وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ: النحل/٤٤) "اور اے محبوب ہم نے تمھاری طرف یہ یادگار (قرآن) اتاری کہ تم لوگوں سے بیان کرو جو ان کی طرف اترا" اس آیت میں بیان قرآن کی نسبت حضور کی طرف کی گئی۔

ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے تخریج کی کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کوئی بات کہی اور ٹھیک کہی جب بھی وہ گنہ گار رہا۔ ابوداؤد نے تخریج کی کہ حضور نے فرمایا: جس نے قرآن میں کوئی بات بغیر علم کے کہی وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔ بیہقی نے پہلی حدیث کے بارے میں کہا: یہ حدیث اگر صحیح ہو تو اس سے حضور کی مراد وہ رائے ہوگی جس پر کوئی دلیل قائم نہ ہو۔ لیکن وہ رائے جس کی تائید وتقویت کسی دلیل سے ہو رہی ہو تو اس کا قول کرنا جائز وروا ہے۔ واللہ اعلم۔

امام ماوردی نے کہا: ورع میں بعض شدت پسندوں نے اس حدیث کو اس کے ظاہر معنی پر محمول کیا اور قوت اجتہاد سے معانی قرآن کے استنباط کو ناجائز کہا۔ اگرچہ شواہد اس استنباط کے مؤید ہوں اور کوئی نص صریح ان شواہد کے معارض نہ ہو۔ حالاں کہ یہ اس تدبر قرآن اور استنباط احکام سے روگردانی ہے جس کا ہمیں مکلّف بنایا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے: (وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ: النساء/۸۳) "اور اگر وہ اس میں یعنی اطمینان یا ڈر کی بات میں رسول اور اپنے ذی اختیار لوگوں کی طرف رجوع لاتے تو ضرور ان میں سے رسول اور با اختیار لوگ اپنی زیرکی، تجربات اور امور حرب وضرب اور جنگی چالوں سے واقفیت کے سبب اس کی کوئی تدبیر مستنبط کر لیتے یعنی کوئی تدبیر نکال لیتے"۔

اگر وہ مذہب صحیح ہوتو نہ تو کوئی بات استنباط سے معلوم کی جاسکتی اور نہ اکثر علما نے کتاب اللہ سے کچھ سمجھا ہوتا۔اس لیے اگر حدیث صحیح ہوتو اس کی تاویل یہ ہے کہ جو شخص اپنی رائے سے قرآن میں کوئی بات کہےاور صرف اس کے الفاظ پر ہی اعتماد کرےاور درست بات کہہ جائے تو بھی وہ صحیح راستے سے بھٹک گیا اس لیے کہ اس نے محض رائے سے کسی شاہد اور سند کے بغیر کتاب اللہ میں کلام کیا۔اور اس کا ٹھیک بات کہہ جانا، محض اتفاقی امر ہے۔

ابو نعیم وغیرہ نے یہ حدیثِ ابن عباس تخریج کی کہ حضور نے فرمایا: "اَلْقُرْاٰنُ ذَلُوْلٌ ذُوْ وُجُوْہٍ، فَاحْمِلُوْہُ عَلٰی اَحْسَنِ وُجُوْھِہٖ"۔ ''قرآن بآسانی تابع ہوجانے والا اور کئی وجہوں والا کلام ہے اس لیے اسے سب سے بہتر وجہ پر محمول کرو۔'' اس حدیث میں حضور کا قول "ذلول" دو معنوں کا احتمال رکھتا ہے: ایک تو یہ کہ قرآن، حاملین قرآن کے لیے مطیع ہوتا ہے کہ ان کی زبانیں بآسانی اسے ادا کر لیتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ قرآن اپنے معانی کو اس طرح واضح کردینے والا ہے کہ افہام مجتہدین ان کے ادراک سے قاصر نہیں رہتیں۔ اسی طرح حضور کا قول "ذو وجوہ" بھی دو معنوں کا احتمال رکھتا ہے۔ ایک معنی تو یہ کہ اس کے کچھ الفاظ متعدد وجوہِ تاویل کا احتمال رکھتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ وہ اوامر ونواہی ،ترغیب وترہیب اور تحلیل تحریم جیسے متعدد وجوہ کا احتمال رکھتا ہے۔ یوں ہی حضور کے فرمان: "فاحملوہ علی احسن وجوھہ" میں بھی دو معنوں کا احتمال ہے۔ ایک یہ کہ قرآن کو اس کے بہتر معانی پر محمول کرو۔ دوسرا یہ کہ قرآن کی دو وجہوں میں سے جو احسن ہے اس پر عمل کرو مثلاً عزیمتوں کو اختیار کرو، صرف رخصتوں کو نہ لو، عفو ودرگزر اختیار کرو، انتقام کے درپے نہ رہو۔

اس حدیث میں کتاب اللہ میں اجتہاد اور اس سے استنباط کے جواز پر کھلی دلیل ہے۔

بعض علما نے کہا: اس شخص کو قرآن کی تفسیر کرنا جائز ہے جو ان پندرہ علوم کا جامع ہو جن کی حاجت ایک مفسر کو پڑتی ہے۔

عللِ احتیاج کے ساتھ ان علوم کا ذیل میں ذکر کیا جارہا ہے۔

[۱] علم لغت: کیوں کہ اس سے باعتبار وضع مفرد الفاظ اور ان کے مدلولات کی شرح معلوم ہوتی ہے۔

[۲] علم نحو: کیوں کہ اختلاف اعراب سے معنی متغیر ومختلف ہوجاتا ہے اس لیے اس علم کا اعتبار ضروری ولابدی ہے۔

ابو عبید نے حسن بصری سے تخریج کی کہ ان سے ایک ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو عربی زبان اس لیے سیکھتا ہے کہ اسے ''خوش گفتاری'' حاصل ہوجائے اور وہ اپنی قراءت درست کرلے؟ تو جواب میں حضرت حسن نے فرمایا: اچھا ہے۔ تم عربی زبان سیکھو کیوں کہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی

کوئی آیت پڑھتا تو ہے مگر اس کے وجہِ اعراب سے ناواقف ہوتا ہے اس لیے ہلاکت میں پڑ جاتا ہے۔

[۳] علم صرف: کیوں کہ اوزان اور صیغے اسی سے معلوم ہوتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا: جو علم صرف سے محروم ہو وہ علم کے بڑے حصے سے محروم ہے۔

[۴] علم اشتقاق: کیوں کہ اسم کا اشتقاق اگر دو مختلف مادوں سے ہو تو ان کے اختلاف سے معنی مختلف ہو جائے گا جیسے "مسیح" کہ یہ یا تو "سِیاحۃ" سے مشتق ہے یا "مَسح" سے۔

[۵، ۶، ۷] علمِ معانی و بیان و بدیع۔ اس لیے کہ علم معانی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ افادۂ معنی کے لحاظ سے تراکیب کلام کی خصوصیات کیا ہیں؟ اور علم بیان سے تراکیب کلام کی وہ خصوصیات معلوم ہوتی ہیں جن کے باعث کوئی کلام اپنا معنی بتانے میں واضح، کوئی اوضح، کوئی خفی ہوتا ہے اور علم بدیع سے کلام کو عمدہ بنانے کے طریقے معلوم ہوتے ہیں۔

یہی تینوں علوم "علوم البلاغۃ" اور تفسیر کا اہم ذریعہ ہیں اس لیے کہ مفسر کے لیے ان امور کا پاس و لحاظ رکھنا ضروری ہے جن کا اعجاز تقاضا کرے اور اس کا ادراک انھیں علوم سے ہو سکتا ہے لہٰذا ان کا علم لابدی ہوگا۔

[۸] علم القراءات: کیوں کہ اس سے قرآن کو زبان سے ادا کرنے کی کیفیت معلوم ہوتی ہے اور قراءتوں سے بعض محتمل وجوہ کی بعض دیگر وجوہ پر ترجیح ہوتی ہے۔

[۹] علم اصول دین: اس لیے کہ قرآن میں ایسی آیات بھی ہیں جن کا ظاہر ایسے معنی پر دلالت کرتا ہے جو خدا کے لیے ممکن نہیں تو جو شخص اصول دین اور فن عقائد سے آگاہ ہوگا وہ ان آیات کا ایسا معنی بیان کر سکے گا جو عقیدۂ صحیحہ کے مطابق ہو۔

[۱۰] علم اصول فقہ: کیوں کہ اس سے اَحکام پر استدلال اور قرآن سے استنباط کی وجہ معلوم ہوتی ہے۔

[۱۱] اسباب نزول اور قصص کا علم: کیوں کہ سبب نزول سے اس سبب میں نازل ہونے والی آیت کا معنی معلوم ہوتا ہے۔

[۱۲] علم ناسخ و منسوخ تاکہ معلوم ہو جائے کہ کون محکم ہے اور کون محکم نہیں ہے۔

[۱۳] علم فقہ۔

[۱۴] مجمل اور مبہم کی تفسیر بیان کرنے والی احادیث کا علم۔

[۱۵] علم وہبی وعطائی: یہ علم اللہ تعالیٰ اسے عطا فرماتا ہے جو اپنے علم پر عمل پیرا رہے۔ اسی کی طرف اس اثر سے اشارہ بھی کیا گیا ہے "مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللّٰهُ عِلْمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ"۔ "جو اپنے علم پر عمل کرے اللہ تعالیٰ اسے ان باتوں کا علم عطا فرماتا ہے جو اسے معلوم نہ تھیں۔"

ابن ابی الدنیا نے کہا: قرآن کے علوم اور اس سے مستنبط معانی ایک ایسا سمندر ہیں جس کا کوئی ساحل نہیں۔ انھوں نے مزید کہا: ایک مفسر کے لیے آلہ کی حیثیت رکھنے والے ان علوم کی تحصیل کے بغیر کوئی مفسر، مفسر نہیں ہوسکتا لہٰذا جو ان علوم کے بغیر تفسیر کرے وہ شرعاً ممنوع رائے سے تفسیر کرے گا اور اگر کوئی ان علوم کی تحصیل کے بعد تفسیر کرے تو وہ رائے ممنوع سے تفسیر کرنے والا نہیں ہوگا۔

انھوں نے مزید کہا: صحابہ و تابعین کو عربی زبان کے علوم فطری طور پر حاصل تھے اس لیے انھیں ان کے حصول واکتساب کی ضرورت نہ تھی ہاں انھوں نے دوسرے علوم نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ضرور حاصل کیے۔

برہان میں ہے: اگر قرآن میں نظر کرنے والے کے دل میں بدعقیدگی یا تکبر یا خواہش نفس یا محبت دنیا ہو یا وہ کسی گناہ پر مصر ہو یا اس کا ایمان تحقیقی و یقینی نہ ہو، یا ضعیف التحقیق ہو یا بے علم مفسر کے قول پر اعتماد کرتا ہو یا اپنی عقل و خرد کو مرجع بناتا ہو تو وہ نہ تو معانی وحی کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اس کے اسرار اس کے قلب و ذہن میں آسکتے ہیں بلکہ یہ ساری باتیں اس راہ میں حجاب اور رکاوٹ ہیں بعض، بعض سے سخت۔

## طبقات مفسرین

تفسیر صحابہ: تفسیر میں دس صحابہ کو شہرت حاصل ہوئی، چاروں خلفا، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابو موسی اشعری اور حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ تعالی عنہم۔

خلفاے اربعہ میں حضرت علی سے سب سے زیادہ تفسیری روایتیں آئی ہیں جب کہ باقی تینوں خلفا کی روایتیں نہایت قلیل ہیں۔ شاید اس کا سبب حضرت علی سے پہلے ان حضرات کی وفات ہے۔ یہی بات حضرت ابو بکر صدیق کی قلتِ روایتِ حدیث کا بھی سبب ہے۔

تفسیر میں حضرت ابو بکر صدیق سے مروی آثار اتنے کم ہیں کہ وہ دس سے بھی تجاوز نہیں کرتے جب کہ حضرت علی سے کثیر آثار مروی ہیں۔

معمر نے وہب بن عبد اللہ سے اور انھوں نے ابو الطفیل سے روایت کی کہ ابو الطفیل نے کہا: میں نے حضرت علی کو دیکھا کہ وہ دورانِ خطبہ فرمارہے ہیں: مجھ سے سوال کرو۔ بخدا میں تمھاری ہر اس بات کا جواب دوں گا جو تم مجھ سے پوچھو گے۔ تم مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں پوچھو۔ بخدا مجھے اس کی ہر آیت کے متعلق معلوم ہے کہ وہ رات میں نازل ہوئی یا دن میں، عام زمین پر نازل ہوئی یا پہاڑ پر۔

ابو نعیم نے حلیہ میں بطریق ابو بکر بن عیاش، نصیر بن سلیمان احمسی سے، انھوں نے اپنے والد سلیمان سے اور انھوں نے حضرت علی سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا: خدا کی قسم جو بھی آیت نازل

ہوئی مجھے اس کا سبب نزول اور جائے نزول معلوم ہے کیوں کہ میرے رب نے مجھے سمجھنے والا دل اور بہت سوال کرنے والی زبان عطا فرمائی۔

حضرت ابن مسعود سے منقول روایات کی تعداد حضرت علی سے منقول مرویات سے کہیں زیادہ ہے۔ ابن جریر وغیرہ نے حضرت ابن مسعود سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی لائق پرستش نہیں "کتاب اللہ کی جو بھی آیت نازل ہوئی مجھے اس کے متعلق معلوم ہے کہ وہ کس کے بارے میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی۔ اگر مجھے کسی مقام پر کسی ایسے شخص کی موجودگی کا علم ہو جاتا جو کتاب اللہ کا مجھ سے زیادہ علم رکھتا ہو اور اس تک سواریوں کی رسائی بھی ممکن ہو تو میں ضرور اس کے پاس جاتا۔

ابو نعیم نے ابو البختری سے تخریج کی انھوں نے کہا: لوگوں نے حضرت علی سے پوچھا: حضرت ابن مسعود کے بارے میں بتائیے؟ فرمایا: انھوں نے کتاب وسنت کا علم حاصل کیا پھر رک گئے اور اتنا علم کافی ہے۔

ترجمان قرآن حضرت ابن عباس تو وہ خوش قسمت انسان ہیں جن کے حق میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دعا کرتے ہوئے فرمایا: اے اللہ! اسے دین کی سمجھ عطا فرما اور تاویل کے علم سے نواز۔ یہ بھی فرمایا: اے اللہ! اسے حکمت بخش دے، دوسری روایت میں ہے اے اللہ! اسے حکمت کا علم عطا فرما۔

ابو نعیم نے حلیہ میں حضرت ابن عمر سے تخریج کی: آپ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت عبد اللہ بن عباس کے لیے دعائے خیر کرتے ہوئے فرمایا: اے اللہ اس میں برکت عطا فرما اور اس کے ذریعہ علم کی نشر واشاعت فرما۔

ابو نعیم نے ہی بطریق عبد المؤمن بن خالد، عبد اللہ بن بریدہ سے اور انھوں نے حضرت عبد اللہ بن عباس سے تخریج کی: آپ نے فرمایا: ایک بار میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں اس وقت پہنچا جب حضرت جبریل آپ کے پاس حاضر تھے۔ مجھے دیکھ کر حضرت جبریل نے حضور سے کہا: یہ اس امت کا (حبر) عالم ہونے والا ہے تو اسے خیر کی تاکید فرمائیے۔

انھوں نے ہی بطریق عبد اللہ بن حراش، عوام بن حوشب سے اور انھوں نے مجاہد سے تخریج کی کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: تم کیا ہی خوب ترجمان قرآن ہو۔

بیہقی نے اپنی کتاب دلائل میں ابن مسعود سے تخریج کی، انھوں نے فرمایا: عبد اللہ بن عباس کتنے اچھے ترجمان قرآن ہیں۔

ابو نعیم نے مجاہد سے تخریج کی، انھوں نے کہا: ابن عباس کو ان کے وفور علم کی وجہ سے بحر (سمندر) کہا جاتا تھا۔

ابو نعیم نے ہی ابن الحنفیہ سے تخریج کی: انھوں نے کہا: ابن عباس اس امت کے حَبر (بڑے عالم) تھے۔

انھوں نے ہی حسن بصری سے تخریج کی، انھوں نے کہا کہ حضرت ابن عباس کا قرآن میں اتنا بلند مقام تھا کہ حضرت عمر فرمایا کرتے تھے "وہ ادھیڑ عمر والوں کا نوجوان ہے۔ اس کو بہت سوال کرنے والی زبان اور بہت عقل والا دل ملا ہے"۔

بخاری نے بطریق سعید بن جبیر، حضرت ابن عباس سے تخریج کی، آپ نے فرمایا: مجھے حضرت عمر شیوخ بدر کے ساتھ ان کے درمیان جگہ دیتے۔ بعض کو ان کا یہ طرز عمل اچھا نہ لگا اس لیے وہ بول پڑے: ان کو ہمارے برابر کیوں بٹھایا جاتا ہے جب کہ ان کے برابر تو ہمارے بیٹے ہیں؟ یہ سن کر حضرت عمر نے فرمایا: یہ وہ ہیں جن کا مقام تمھیں معلوم ہے۔ اس کے بعد ایک دن حضرت عمر نے شیوخ بدر کو بلایا اور ابن عباس کو ان کے درمیان بٹھایا۔ ابن عباس کہتے ہیں: میرے خیال میں حضرت عمر نے مجھے اس دن ان لوگوں کے درمیان اس لیے طلب فرمایا تھا کہ انھیں میرا علمی مقام دکھادیں۔ آپ نے فرمایا: آپ لوگ اللہ تعالیٰ کے قول (اذا جاء نصر الله والفتح) کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ ایک صاحب نے کہا: ہمیں اس آیت کریمہ میں حکم دیا گیا ہے کہ جب ہمیں فتح وکامرانی ملے تو ہم اللہ کی حمد وثنا کریں اور اس سے مغفرت طلب کریں، جب کہ دوسرے حضرات خاموش رہے اور کچھ جواب نہ دیا۔ اب حضرت عمر نے مجھ سے پوچھا ابن عباس! کیا تم بھی یہی کہتے ہو؟ میں نے کہا: میں یہ نہیں کہتا۔ اس پر آپ نے دریافت فرمایا پھر تم کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا: اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا وقت وفات ہے، جس سے آپ کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی آگاہ وباخبر کرتے ہوئے فرمایا: "اذا جاء نصر الله والفتح" جب فتح ونصرت خداوندی آجائے تو یہ تمھاری وفات کی علامت ہوگی اس لیے اپنے رب کی حمد وثنا کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرو اور اس سے مغفرت چاہو بے شک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمر نے فرمایا: مجھے بھی اس آیت کریمہ سے وہی معلوم ہے جو تم کہہ رہے ہو۔

## طبقۂ تابعین

ابن تیمیہ نے کہا: تفسیر کا سب سے زیادہ علم اہل مکہ کے پاس ہے کیوں کہ یہ لوگ حضرت عبد اللہ بن عباس کے اصحاب وتلامذہ ہیں۔ جیسے مجاہد، عطاء بن ابی رباح، ابن عباس کے غلام عکرمہ، سعید بن جبیر اور طاؤس وغیرہم۔

اسی طرح تفسیر میں کوفہ کے اندر ابن مسعود کے اصحاب وتلامذہ اور علمائے اہل مدینہ مثلاً زید بن اسلم ہیں جن سے ان کے صاحبزادے عبد الرحمٰن بن زید اور مالک بن انس نے علم تفسیر حاصل کیا۔

مفسرین تابعین میں نمایاں اور ممتاز مجاہد ہیں۔ فضل بن میمون نے کہا: میں نے مجاہد کو کہتے

ہوئے سنا: میں نے ابن عباس کو قرآن تیس بار پڑھ کر سنایا۔ مجاہد ہی نے یہ بھی کہا: میں نے ابن عباس کو مصحف شریف تین بار پڑھ کر سنایا۔ میں اس کی ہر آیت پر ٹھہرتا اور اس کے متعلق دریافت کرتا کہ یہ کس کے بارے میں نازل ہوئی اور اس کی کیفیت کیا تھی؟ نصیف نے کہا: مجاہد تفسیر کے سب سے بڑے عالم تھے۔

حضرت سفیان ثوری نے کہا: اگر تمھیں مجاہد سے مروی تفسیر مل جائے تو وہی تمھارے لیے کافی اور بس ہے۔

ابن تیمیہ نے کہا: اسی لیے امام شافعی اور امام بخاری وغیرہما اہل علم ان کی تفسیر پر اعتماد کرتے ہیں۔

امام سیوطی نے کہا: فریابی نے اپنی تفسیر میں مجاہد سے مروی اقوال کا زیادہ سے زیادہ ذکر کیا ہے اور ابن عباس وغیرہ سے منقول مرویات کا ذکر بہت کم کیا ہے۔

انھیں میں ایک نمایاں نام حضرت سعید بن جبیر کا بھی ہے۔ سفیان ثوری نے کہا: تفسیر چار حضرات ـــ سعید بن جبیر، مجاہد، عکرمہ، اور ضحاک ـــ سے حاصل کرو۔

قتادہ نے کہا: تابعین میں سب سے زیادہ علم والے چار حضرات ہیں جن میں عطاء ابن ابی رباح مناسکِ حج کے، سعید بن جبیر تفسیر کے، عکرمہ سِیَر کے اور حسن بصری حلال وحرام کے سب سے بڑے عالم تھے۔

ایک اور ممتاز شخصیت حضرت ابن عباس کے غلام عکرمہ تابعی کی ہے جن کے متعلق امام شعبی نے کہا: عکرمہ سے زیادہ کتاب اللہ کا علم رکھنے والا کوئی باقی نہ رہا۔

سماک بن حرب نے کہا: میں نے عکرمہ کو کہتے ہوئے سنا: میں نے دو دفتیوں کے درمیان کے پورے قرآن کی تفسیر کی ہے۔

انھیں نمایاں تابعین میں حسن بصری، عطاء ابن ابی رباح، عطاء بن ابی سلمہ خراسانی، محمد بن کعب قرظی، ابو العالیہ، ضحاک بن مزاحم، عطیہ عوفی، قتادہ، زید بن اسلم، مرہ ہمدانی اور ابو مالک بھی ہیں۔

ان کے بعد ربیع بن انس، عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم اور دوسرے مفسرین کا زمانہ آتا ہے۔

یہ قدیم مفسرین ہیں جن کے زیادہ تر اقوال صحابہ سے ماخوذ ہیں۔

**پھر اس طبقہ کے بعد** جو تفسیریں تالیف کی گئیں ان میں صحابہ اور تابعین کے اقوال یکجا کیے گئے۔ جیسے: سفیان بن عیینہ، وکیع بن جرّاح، شعبہ بن حجاج، یزید بن ہارون، عبد الرزاق، آدم بن ابی ایاس، اسحٰق بن راہویہ، رَوح بن عُبادہ، عبد بن حمید، سعید اور ابو بکر بن ابی شیبہ وغیرہم کی تفسیریں۔

ان کے بعد ابن جریر طبری ہیں جن کی کتاب تفسیر کی تمام کتابوں میں سب سے زیادہ عظیم وجلیل تسلیم کی گئی ہے۔

پھر ابن ابی حاتم، ابن ماجہ، حاکم، ابن مردویہ، ابوالشیخ بن حبان اور ابن المنذر وغیرہ کی تفاسیر ہیں جن میں ہر ایک قول کی سند صحابہ، تابعین اور تبع تابعین تک بالاتصال پہنچتی ہے اور ان میں ان کے علاوہ اور کچھ بھی مذکور نہیں۔ ہاں ابن جریر اپنی تفسیر میں اقوال کی توجیہ، بعض اقوال کی بعض پر ترجیح اور اعراب واستنباط کا بھی ذکر کرتے ہیں اس طرح ان کی تفسیر ان خوبیوں کے باعث مذکورہ مفسرین کی کتابوں پر فوقیت اور برتری رکھتی ہے۔

پھر تفسیر میں اور لوگوں نے تالیفات کیں مگر انھوں نے سندوں کو حذف کر دیا اور اقوال کو بیانِ قائل کے بغیر نقل کیا جس کے باعث تفسیر میں ایسی باتیں بھی شامل ہو گئیں جن کی کوئی اصل نہیں اور صحیح کی ضعیف سے ایسی آمیزش ہوئی کہ کوئی امتیاز نہ رہا۔ پھر یہ حال ہو گیا کہ جسے کوئی بات سمجھ میں آتی اسے درج کر دیتا، اور دل میں جو بھی خیال آتا اس پر اعتماد کر لیتا پھر بعد میں آنے والا اس سے اسے نقل کرتا اور یہ گمان کرتا کہ ضرور اس کی کوئی اصل ہو گی۔ اس طرف توجہ نہ رہی کہ تنقیح کر کے وہ تفسیر لی جائے جو سلف صالحین سے مروی ہے یا ایسے حضرات سے منقول ہے جو علم تفسیر میں مرجع اور معتمد ہیں۔

پھر اس کے بعد ان لوگوں کی تصنیفات ہیں جو کسی ایک علم میں اپنے ہم عصروں پر فوقیت رکھتے تھے اس لیے ہر ایک اپنی تفسیر کو اسی فن تک محدود رکھتا تھا جس کا اس پر غلبہ ہوتا۔ نحوی کی تفسیر دیکھو تو اس کی ساری دل چسپی اور توجہ صرف اعراب بیان کرنے، اس میں زیادہ سے زیادہ احتمالی صورتیں بتانے اور نحو کے قواعد و مسائل اور اس کے فروع و خلافیات کو نقل کرنے میں مبذول ہوتی ہے۔ جیسے کہ زجاج اور واحدی نے بسیط میں اور ابوحیان نے "البحر والنهر" میں یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔

تاریخ واخبار سے شغف رکھنے والے کو دیکھو اسے قصوں اور ان کے احاطے اور سلف سے مروی غلط یا صحیح اخبار کے علاوہ کسی اور چیز سے کوئی غرض ہی نہیں ہوتی تھی۔ جیسے ثعلبی۔

فقیہ اپنی تفسیر میں تقریباً باب الطهارة سے لے کر امهات الاولاد [اولاد کی کنیز ماؤں] تک کے مسائل ذکر کرتا ہے اور ضمناً کبھی اس حد تک آ جاتا ہے کہ فقہی فروع کے دلائل اور مخالفین کے دلائل کے جوابات جن کا آیت سے کوئی تعلق نہیں، سبھی ذکر کرتا ہے۔ جیسے: قرطبی۔

علوم عقلی کے حامل مفسرین خاص طور سے امام رازی نے حکما وفلاسفہ اور ان جیسے دوسرے لوگوں کے اقوال سے اپنی تفسیر کو بھر دیا ہے اور ایک بات سے دوسری کسی بات کی طرف اس طرح منتقل ہو گئے ہیں کہ مطالعہ کرنے والے کو حیرت ہوتی ہے کہ آیت سے غیر متعلق کیسی کیسی باتیں درج کر دی ہیں۔

ابوحیان نے بحر میں کہا: امام فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں ایسی بہت سی طول طویل باتیں جمع کر دی ہیں جن کی علم تفسیر میں کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اسی لیے بعض علما نے کہا: اس میں تفسیر

کے سوا سب کچھ ہے۔

بد مذہب تفسیر لکھنے پر آتا ہے تو اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ آیات میں تحریف کر کے انھیں اپنے مذہبِ فاسد پر تطبیق دے، کوئی دور کی کوڑی مل جاتی ہے تو اسے ہی غنیمت سمجھ کر جھپٹ لیتا ہے یا کوئی ایسی جگہ مل جاتی ہے جس میں اس کے لیے ادنیٰ سی گنجائش ہو تو بے تحاشا اسی کی طرف دوڑ جاتا ہے۔

بلقینی نے کہا: میں نے زمخشری کی کتاب ''کشاف'' سے اعتزال چھانٹ چھانٹ کر نکالا ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے: (فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّۃَ فَقَدْ فَازَ:ال عمران/۱۸۵) ''جسے جہنم سے دور کیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہ ضرور کامیاب ہے۔''

اس کی تفسیر میں لکھا ہے: ''وَاَیُّ فوزٍ اَعظَمُ مِن دُخولِ الجَنَّۃِ'' جنت میں جانے سے بڑھ کر اور کون سی کامیابی ہوگی۔ اس سے عدم رویت باری تعالیٰ کی طرف اشارہ کیا۔

امام سیوطی نے کہا: اگر تم کہو کہ آپ کس تفسیر کی طرف رہ نمائی کرتے ہیں اور ناظر کو کس تفسیر پر اعتماد کرنے کا حکم دیتے ہیں؟ اس کے جواب میں فرماتے ہیں: تم امام ابو جعفر بن جریر طبری کی تفسیر پر اعتماد کرو جس کے متعلق معتبر علما کا اجماع ہے کہ تفسیر میں ایسی کوئی کتاب نہ لکھی گئی۔

امام نووی نے اپنی کتاب ''تہذیب'' میں کہا: تفسیر میں ابن جریر کی کتاب جیسی کوئی کتاب کسی مفسر نے نہیں لکھی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

## خاتمۂ کتاب از مترجم

زبدۃ الاتقان مضمونِ بالا پر ختم ہو جاتی ہے۔ اتقان میں امام سیوطی نے اس کے بعد اُن احادیث کو ثبت کیا ہے جو کسی آیت کی تفسیر میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی ہیں، سورتوں کے اسما کا عنوان قائم کر کے اس سورہ کے تحت جو احادیث مرفوعہ آئی ہیں ان کو لکھا ہے۔ پھر اجمالاً اتقان کی کچھ خوبیاں بیان کی ہیں اور دعاے نفع وقبول پر کتاب ختم کی ہے۔

الاتقان فی علوم القرآن کو مصنف نے اَسّی (۸۰) انواع پر تقسیم کیا ہے، جن میں سے کچھ اہم اور خاص خاص نوعوں کو ''زبدۃ الاتقان'' میں تلخیص کے ساتھ لیا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب اسی کا ترجمہ ہے۔ رب تعالیٰ ہمیں اور جملہ قارئین کو اس سے نفع بخشے اور اپنے کرم سے اُسے قبول فرما کر مقبول خاص وعام بنائے۔ آمین، والحمد للہ رب العٰلمین، والصلوٰۃ والسلام علیٰ حبیبہ سید الخلق اجمعین وعلیٰ آلہ وصحبہ والتابعین لھم باحسان الیٰ یوم الدین۔

محمد عارف اللہ فیضی مصباحی
استاذ فیض العلوم محمد آباد گوہنہ ضلع مئو، یوپی

۲۸ محرم الحرام ۱۴۳۳ھ
۲۴ دسمبر ۲۰۱۱ء - شنبہ

Www.islamiyat.online

تفسیر الجلالین

بہار شریعت

موطا الامام محمد
مع

هداية الحكمة
تذكار الحكمة